بسم اللہ الرحمن الرحیم

ڈاکٹر علی شریعتی

تشیع...

"محمدی اسلام" کے آئینہ میں

- تاریخ میں ذکر و ذاکرین کا انقلابی کردار
- تشیع کی ذمہ داری

ترجمہ: سید محمد موسیٰ رضوی

ڈاکٹر علی شریعتی

تشیع

....

"محمدی اسلام" کے آئینہ میں

- تاریخ میں ذکر و ذاکرین کا انقلابی کردار
- تشیع کی ذمہ داری

محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ کراچی
Tel: 4124286-4917823 Fax: 4312882
E-mail: anisco@cyber.net.pk

ترجمہ: سید محمد موسیٰ رضوی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہے

ادارہ "ن" والقلم

نام کتب: تشیع دین محمدی کے آئینہ میں
(پہلا اور دوسرا حصہ)
شیعہ تاریخ میں ذکر اور ذاکری
کا انقلابی کردار
تشیع کی ذمہ داری

مصنف: ڈاکٹر علی شریعتی

ترجمہ: سیّد محمد موسیٰ رضوی

سرورق: سید معظم علی

پروف ریڈنگ: سیدہ زہرا اور آل حسن رضوی

کمپوزنگ: احسان علی

سنہ اشاعت: ۲۰۰۲ء

ناشر: ادارہ "ن و القلم"

قیمت: ۱۵۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

دیباچہ

حمد وشکر اس کردگارِ ذوالمنن کے لئے جس نے ہمیں دین کی پوشاک سے مزّین کیا اور ''ملت ابیکم ابراهیم هو سماکم المسلمین من قبل.......'' کہہ کر اقوام عالم کو صبحِ آگہی کی نوید دی اور پھر حزب کی جہت سے کہا ''الا ان حزب الله هم المفلحون''۔

اور درود و سلام ہو ان محاسن وامتیازات کے نقطۂ اتم پر فائز ہستیوں پر جنہوں نے جہل کی تاریکیوں کے پردوں کو ادھیڑ کر حق اور حقیقت کو نکھار دی اور عرب کے بھیڑیوں کا جم کر مقابلہ کیا، راہ خدا میں سختیاں جھیلیں اور دین کی حفاظت میں کوئی لمحہ فروگزاشت نہیں کیا، اپنی حکمت اور اپنے حسن بیان سے خلقِ خدا کو اللہ کی طرف بلایا اور جب بات خدا کی ہوئی تو کسی کو خاطر میں نہیں لائے مگر بالآخر فتنوں نے انہیں روند ڈالا اور پیغمبرؐ کی یہ بات بھلا دی گئی کہ: ''جن شخصیتوں کی تعظیم کی جائے ان کی اولاد کا احترام بھی ضروری ہے''۔

تاہم موجودہ کتاب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اس بات کو واضح کرنا ضروری ہے کہ بنیادی طور پر اس کتاب کا نام ''شیعہ ایک کامل گروہ'' ہے جس میں

تبدیلی پیدا کر کے ہم نے اس کا نام ''تشیع ...... محمدی اسلام کے آئینے میں'' رکھا ہے، مگر جہاں کہیں علی شریعتی نے اپنے دیئے ہوئے عنوان کے حوالے سے گفتگو کی ہے ہم نے اس کے عنوان کو محفوظ رکھا ہے۔ اور اس کا تذکرہ اس لئے کر دیا ہے تاکہ موقر پڑھنے والے کسی تذبذب کا شکار نہ ہوں۔

علی شریعتی نے اس موضوع کو ۱۹۷۲ عیسوی میں ''حسینیہ ارشاد'' نامی اسلامی ثقافتی مرکز کے لئے منتخب کیا تھا۔ اس تقریر کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کو انہوں نے شمسی سال کے آٹھویں مہینے ''آبان ماہ'' کی دوسری تاریخ کو اور دوسرے حصے کو اس کے دوسرے دن پیش کیا تقریر کا پہلا حصہ ایران، یورپ اور امریکہ میں کئی بار طباعت کے عمل سے گزرا ہے، مگر دوسرے حصے کی اشاعت ایک عرصے کے بعد عمل میں آئی ہے اور علی شریعتی نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں واضح کیا ہے کہ ''شیعہ ایک کامل گروہ'' سے ان کی مراد کیا ہے؟ انہوں نے اس مفہوم کو کہاں سے اور کس طرح پایا ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے کم وبیش اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ''حزب'' یا یہ گروہ وہ ہے کہ جو ایک طرف سے ''ملت ابراہیم'' سے یا یوں کہیے کہ اسلام سے یا شیعی پالیسی یا شیعی متعین راہ سے صورت پذیر ہوتا ہے اور دوسری طرف سے ذمہ داریوں کی برقراری اور بنی نوع انسان کی رہبری میں، روشن خیال لوگوں کے آئیڈیلز کا جوابدہ بھی ہے، اور پھر مختصر طور پر یہ بھی بتایا کہ ''شیعہ'' ایک گروہ یا ایک جہاں بینی کی شکل میں اسلام کی تجلّی سے عبارت ہے کہ جس کی بنیاد آئیڈیالوجیکل ہے اور اس میں فلسفۂ تاریخ، ہیومنزم، انسان شناسی، طبقاتی یکجائی، سیاسی وابستگی،

معاشی فاؤنڈیشن، رہبرانہ اسلوب، محاذ آرائی کا طریق کار، تنظیم، حزبی تدبیر اور حکمت عملی سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کی جنگی حکمت عملی اور اس کا طریقہ کار شیعہ ائمہ کی ۲۵۰ سالہ دائمی جنگ میں منصۂ شہود پر آیا اور پھر سات سو، آٹھ سو سال بعد تک (صفوی دور سے پہلے تک) حکومت جور سے محاذ آرائی اور اہلبیت کے اسلام پر تکیہ کے ساتھ، علماء، مجاہدین، واعظین، شعراء، بلکہ ذاکرین اور شیعہ مداحین کے ہاتھوں اس کی پاسداری عمل میں آئی ہے۔

ایک جگہ علی شریعتی مسلمانوں کی ذمہ داری کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''......اور بالآخر ہر صورت میں، ہر دور میں، ہر نظام میں، خواہ اسلام، ایک ''مثالی اور مسئول'' عظیم اعتقادی معاشرے کے مفہوم میں ایک ''امت'' کا حامل ہو یا نہ ہو، دنیا بھر کے مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے درمیان سے ''ایک خاص امت'' کو اختیار کریں اور ضروری ہے کہ یہ امت مسلمانوں کے درمیان تشکیل پائے اور مسلمان اقوام اور عوام الناس کے بیچ سے اس کی نمود ہو اور وہ ذیل کے ان اہداف کی بحالی کا ذمہ لے:

۱۔ خیر کی طرف بلائے۔

۲۔ ''معروف'' کی راہ میں کوشش کرے۔

۳۔ ''منکر'' کے خلاف صف آرا ہو۔

اور یہ ایک ''حزب'' (امت) ہے۔ پورے ترقی پسندانہ، آگاہانہ اور مکمل مفہوم کے ساتھ ایک حزب، لوگوں کی راہ میں ایک مسئول اعتقادی صورت والا گروہ۔

اس جلد میں ''تاریخ تشیع میں ذکر و ذاکرین کا انقلابی کردار'' کے عنوان سے

ایک دوسری کتاب ضم ہے، اور یہ وہی کتاب ہے جو اس سے پہلے ''ذکر و ذاکرین'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ مگر اس کتاب میں اس کی شمولیت کا سبب یہ ہے کہ یہ بھی شیعہ ''حزب'' یا شیعہ گروہ کے اقدامات کے ایک طریقے کو آشکار اور تاریخ تشیع کے بعض مراحل میں ان اقدامات کے عملی نتائج کو واضح کرتا ہے۔

کتابی صورت میں آنے والی علی شریعتی کی یہ تقریر ۱۹۷۲ عیسوی ہی کی ہے جسے انہوں نے شمسی سال کے چھٹے مہینے ''شہریور ماہ'' کی ۲۱ ویں تاریخ کو ''حسینیہ ارشاد'' میں پیش کی تھی۔

اور اسی تعلق سے یہ تیسری کتاب ''تشیع کی ذمہ داری'' بھی ہے کہ جس کی وضاحت اس کے نام ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کتاب اس مسئولیت کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جس کا احساس ایک حزبی آدمی کو ہونا چاہئے۔ کتابی صورت میں آنے والی اس تقریر کو بھی علی شریعتی نے ''حسینیۂ ارشاد'' میں لوگوں کی سماعت تک پہنچایا۔ البتہ یہ تقریر ۱۹۷۱ عیسوی کی ہے اور یہ بھی سال کے تفاوت کے ساتھ شمسی سال ہی کے آٹھویں مہینے ''آبان ماہ'' کی ۱۵ ویں تاریخ سے منسلک ہے۔

یہ دونوں کتابیں ''شیعہ ایک کامل گروہ'' کے اصلی موضوع سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

کتابوں کے اس مختصر تعارف کے بعد ہم حسب عادت قوم کے اس خیر خواہ، اس آگاہ انسان، اس اعلیٰ پائے کے مفکر، اس سچے اسلامی محقق، اور اس آزاد منش انسان کے لئے بارگاہ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں کہ خدا اس خیر اندیش، مسئول، مجاہد، فعال، دلاور اور باعمل امت کو، دوستداران علیؑ و فاطمہؑ کے صف اوّل میں جگہ دے اور

انہیں، ان دکھوں کو سہنے اور ان مصیبتوں کو جھیلنے کا صلہ دے جنہیں قابیلانِ امت نے ان پر جھڑی باندھ دی تھی۔

آخر میں پاک پروردگار سے ملتمس ہوں کہ وہ اس دنیا اور اُس دنیا میں اپنے پیاروں کے، اور میرے درمیان الفت قائم کرے، "الف بینی و بین احبائک فی دارالدنیا و دار القرار"۔

بندۂ بارگاہ مرتضوی
سیّد محمد موسیٰ رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

کچھ دنوں پہلے ہمارے ایک بیدار مغز اور ہم خیال دوست نے مجھ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:...... آخر تم کیوں سارے بڑے دانشوروں اور محققوں کے ڈھنگ پر علمی تنقید کو نرم اور منطقی انداز میں پیش نہیں کرتے؟...... تمہارا لہجہ بہت سخت اور بعض اوقات چبھتا ہوا ہوتا ہے اور...... اس روسے یہ بعض حساسیتوں کو ابھارنے کا باعث بنتا ہے...... جبکہ تم خود علمی تحقیق کے شعبے سے وابستہ ہو اور ناگزیر طور پر تمہیں چاہیے کہ تم علمی، فکری، اور سماجی مسائل میں ان کے ڈھنگ کو اپناؤ......"!

یہ بات درست ہے لیکن!

لیکن...... مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں دوسرے فلسفیوں کی طرح ایک فلسفی ہوتا تو یقیناً اپنے فلسفہ کو بہت نرم، علمی اور "پسندیدہ" انداز میں لکھتا اور اس کی تشریح کرتا اور اپنے فلسفی مکتب کے مخالف دیگر قدیم و جدید فلسفی مکاتیب کی نسبت بڑے "سکون" ...... کے ساتھ علمی اور منطقی انداز میں تنقید کرتا اور ان کے لئے استدلال پیش کرتا۔ اگر میں کوئی مورخ ہوتا تو اپنے نظریہ کو مثلاً کسی تاریخی مسئلہ کے بارے میں تاریخ نویسی کے انداز میں "سکون کے ساتھ" پیش کرتا، اور ان لوگوں کی منطقی تنقید پر کہ جنہوں نے فلاں تاریخی واقعے کو غلط انداز میں سمجھا ہے گفتگو کرتا کہ...... مثلاً میرا نظریہ اس شخص کے بارے میں جس نے سب سے پہلے فارسی میں شاعری کی ہے زیادہ درست ہے۔ اگر میں ایک فقیہ ہوتا تو اپنے فقہی نظریہ کو "مودبانہ" انداز میں اثبات کرتا، اور مثلاً چہرے اور ہاتھوں کی ہتھیلی کے چھپانے یا نہ چھپانے یا قطبین میں

احکام نماز...... کے بارے میں، دوسرے فقہا کے فتوں کو بہت ''نرمی'' اور بہت علمی انداز میں دائرہ تنقید و تجزیہ میں لاتا؛ اسی طرح اگر میں ادیب، اہل قلم، شاعر یا کوئی اور اہل فن ہوتا تو اسی مناسبت سے میرا خاص انداز ہوتا...... مثلاً خلیل بن احمدی کے عروضی وزن کے مقابل جدید شاعری میں ''نیمائی'' کی وزن پر میرا عقیدہ ہوتا...... اگر فلسفی ہوتا اور وجود پر ماہیت کے تقدم کی سوچ رکھتا، یا عالمِ اصول فقہ ہوتا اور اصل ''وجوبِ مقدمہ واجب'' کو ثابت کرنا چاہتا...... تو پھر میرا لہجہ ایک مکمل علمی لہجہ ہوسکتا تھا اور میں کسی ''مسئلہ'' کو سو فیصد علمی صورت میں ''بڑے سکون'' اور بڑی نرمی کے ساتھ بیان کی منزل پر لاسکتا تھا اور آٹھ دس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک اپنے علمی نظریہ کے درپے ہوسکتا تھا، اس پر تحقیق کرسکتا تھا، اسے استحکام دے سکتا تھا۔ اور پھر اس کو ''مُدوّن'' کر کے اس کے مخالف نظریات کو باری باری محل تنقید پر لاسکتا تھا، اس کی نفی کرسکتا تھا، اس پر استدلال دے سکتا تھا اور سرانجام، اثبات!......

لیکن...... میں، ان میں سے کسی میں نہیں آتا اور ''قدیم وجدید'' اساتذہ کی روش پر ''تحقیقاتی''، علمی گفتگو نہیں کرسکتا...... اور اپنے خاص علمی یا تاریخی یا فلسفی سوچ اور نظریہ پر تکیہ کرتے ہوئے اپنے ''علمی تحقیقی نظریہ'' کو ''غیر جانبدارانہ'' اور معقول و محققانہ انداز میں ''سکون'' کے ساتھ اثبات، اور دوسروں کے ان ''غیر تحقیقی اور غیر علمی نظریات'' کو جو میرے نظریہ سے ''ٹکراتی'' ہیں نفی نہیں کرسکتا!......

اس لئے کہ اس وقت جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے وہ اس قوم کی بدنصیبی، اس امت کی فکری بیچارگی، بیداری لانے والے اور نجات سے ہمکنار کرنے والے ایمان کے بگاڑ اور جور و جہل و فقر کے ذریعہ لوگوں کو سلانے اور انہیں خاموش کرنے کا تیرہ

سو سالہ عقدہ ہے، وہ بھی ان مقدس ترین، اعلیٰ ترین اور متمدن ترین جاودانہ الٰہی اقدار و ایمان کے ذریعے جن سے ہماری وابستگی ہے اور ان عزیز ترین شخصیتوں اور سرمایہ افتخار چہروں کے ذریعہ، جن میں سے ہر ایک، ایک قوم اور ایک ملت کی بیداری، آگاہی، حرکت اور نجات کے لئے کافی ہے......

جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پامال شدہ اقدار ناشناختہ رہ گئے ہیں، ان کی طرف سے آنکھیں میچ لی گئی ہیں، انہیں ناقص پیش کیا گیا ہے بلکہ اس کی پہلی روش کے برخلاف اسے ایک قوم، ایک نسل اور ایک معاشرے کو نقصان پہنچانے کے لئے اختیار کیا گیا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چیز جو "لوگوں" کی آزادی، برابری، اور ترقی و تعالیٰ کے لئے آئی ہے۔ اسے لوگوں کو بدبختی، ذلت، انحراف، جمود اور انہدام کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، اور بالآخر جب ہم دیکھتے ہیں کہ☆ حسینؑ جیسے انقلاب آفریں امام معصوم کے قول سے...... کہ جو ان مقامات پر بھی جہاں اسلام کا نام کسی نے نہیں سنا ہے لیکن وہاں "انسانیت" اور آزادی کی مہک ہے، وہ، آزادی اور انسانیت کے عزیز ترین، خوبصورت ترین اور پاکیزہ ترین مظہر سمجھے جاتے ہیں...... ان بدنصیب لوگوں کے کان میں، جنہوں نے خود ذلت و رسوائی کی خو پکڑی ہے، شب و روز یہ بات ڈالتے

☆...... مسئلہ یہ نہیں کہ مثلاً میں فلاں معصوم امام کی شرح زندگی پر جن کا میں معتقد ہوں اور انہیں آزادی اور انسانیت کا ایک ایسا عظیم رہبر مانتا ہوں کہ جو انسانوں کو انسانیت، بے شعور قوم کو شعور اور اسیر افراد کو آزادی سے ہمکنار کر سکتے ہیں، اس عنوان سے تحقیق کروں کہ مثلاً امام رضاؑ کے حکم سے قالین کے شیر کی سعید بن مہران کو کھا کر قالین پر واپس جانے کی حقیقت کیا ہے؟ یا مجھے آپ کے فرزندوں یا آپ کی تاریخ ولادت و وفات سے اتفاق نہ ہو اور اس بات میں "اختلاف" ہو کہ آپ کی وفات میرے نقطہ نظر سے بالفرض رجب کی اٹھارویں تاریخ ہے، مگر "فلاں صاحب" نے اپنی کتاب میں اسے امرداد کی گیارہویں تاریخ رقم کی ہے......!؟ ہمارے دکھ یہ نہیں ہیں...... یہ ان لوگوں کے دکھ اور ان لوگوں کی مشغولیت ہے جو "نام" و "نان" کے طلب گار ہیں!

ہیں: ''یاقوم! ان لم ترحموا لی، ترحموا لھذا لطفل''!☆......وہ بھی ایک ایسی آسماں پرواز ہستی کی، جہادی عقیدہ رکھنے والوں کے کثیف ترین جلاد اور لوگوں کے غارتگر دشمن سے التجا، اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ان کے عزیز ترین اعزاء نے اوج شرف و آزادی میں اپنی نقد جاں کو بڑی سخاوت مندی سے ان کی راہ ورکاب میں اپنے ہاتھوں سے وار دیا ہے...... ''جب حسینؑ کو...... کہ جن کے لہو کی ایک بوند، ذلت کے شکار قوم کے مردہ جسم میں نئی روح پھونک سکتی ہے اور ایک بار پھر اسارت و بدبختی کے پاتال سے اسے آزادی اور کمال کی بلندی تک پہنچا سکتی ہے، اس حسینؑ کو، جس طرح کہ ہمارے ذہنوں میں ان کی تصویر ہے، جس طرح ہمیں ان کی ضرورت ہے اور جس طرح روز بروز ان کی ''چاہت'' اور ان کے لہو کی ضرورت ہمارے لئے بڑھ رہی ہے...... ایک ایسے کمزور موجود کا روپ دیا جاتا ہے کہ جو دنیا کے پچ ترین پچ کے سامنے ایک ایسی ذلت کو اپنے اوپر ہموار کرتا ہے اور بشریت کے بے رحم جلّاد سے اس طرح درخواست کرتا ہے...... ایسی صورتحال میں کس طرح انسان، ایک محقق کی طرح بہت مؤدّب، بہت معقول اور بہت سکون سے بیٹھ کر ''علمی تنقید'' کرسکتا ہے؟...... کونسی علمی تنقید؟...... کیا کوئی ''علمی''، فلسفی، اور منطقی اختلاف زیر بحث ہے کہ ہم علمی اور علامئی تنقید سے کام لیں؟...... دکھ ساری ''قدروں'' کے ڈھانے کا ہے، ان عزیز ترین اور اعلیٰ ترین آزادی سے ہمکنار کرنے والے اقدار کے مسخ کا ہے کہ جو لوگوں کی اسارت اور بدنصیبی کا سبب بنی ہیں......

ایک ایسے ہنگامے میں انسان کس طرح ''علمی محقق'' ہوسکتا ہے اور پھر کیوں ہو؟!

☆...... ''اے قوم! اگر تم مجھ پر رحم نہیں کھاتے تو کم از کم اس بچے پر رحم کرو''!؟ (یزیدی فوج کے سامنے امام کی زبان سے نکلنے والے الفاظ!)

کیوں علیؑ کے ابوذر نے اس محاذ آرائی کے بجائے جو ان کے اور ان کے گھرانے کے جان کی قیمت پر تمام ہوا، مسجد کے ایک کونے میں گھس کر نہ بیٹھ گئے تاکہ مسلمانوں کے لئے ڈھیر ساری ''علمی'' تحقیقات کریں اور مثلاً کہیں کہ: فلاں آیت کے بارے میں یہ نقطۂ نظر میری نظر میں ''محلِ تردید'' ہے یا میری نظر میں ''اس طرح'' درست ہے، رسول خدا کی فلاں حدیث ''اُس طرح'' نہیں......اِس طرح ہے......فلاں آیت، فلاں گھڑی اور فلاں سیکنڈ میں نازل ہوئی ہے، فلاں حرف کا ''مخرج''، ماتحت حلق ہے وغیرہ؟

ابوذر نے کیوں ایسا نہیں کیا؟

وہ کہ جو ہر کسی سے بہتر روح، آخرت، ثواب، عذاب، قبر کی پہلی رات، منازل آخرت، پیغمبرؐ و علیؑ کے کرامات و معجزات...... آسمانی موجودات پر ان کی ولایت، اہل دوزخ کی غذا اور اہل بہشت کے شراب کی نوعیت......کے بارے میں گفتگو کر سکتے تھے یا علمی نکات، فلسفی اسرار اور دین کے فقہی اور کلامی مسائل کی نسبت تحقیق کر سکتے تھے، کیوں اس طرح کی ''علمائی'' تحقیقات میں اپنے آپ کو نہیں کھپایا؟ کیوں مؤدبانہ اور غیر جانبدارانہ ''علمی تحقیقات'' کے بجائے وہ سڑک سے اونٹ کی ہڈی ڈھونڈ کر سیدھے خلیفہ کے محل کی طرف تیز تیز قدموں سے جاتے ہیں اور خلیفہ کے مشاور کعب الاحبار کے سر پر، گویا غیض آور تلخ و تند اور جانبدارانہ ''علمی تصدیقات'' پر، اہل علم و تحقیق کی روش کے برخلاف دے مارتے ہیں؟ کیوں مؤدبانہ انداز میں کہنے کے بجائے کہ:

''جناب کعب صاحب! ''کنز'' کی جس آیت کو آپ اس طرح مفہوم دے

رہے ہیں فی الحال اس حقیر کی نظر میں اس کا مفہوم اس طرح ہے، گوکہ ممکن ہے آپ کی نظر زیادہ صایب ہو! آخر یہ ایک ''علمی تحقیق'' ہے نا۔ ممکن ہے کل میری سوچ بھی آپ کی طرح بدل جائے...... '' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کسی رُو رعایت کے بغیر، آؤ دیکھا اور نہ تاؤ، ایک سرکاری مجلس شوریٰ اور قوم کے اعلیٰ ترین سیاسی اور اسلامی محفل میں، اونٹ کے پیر کی ہڈی کو اس زور سے کعب کے سر پر دے مارا کہ سر سے خون جاری ہوا اور اس کے بعد جو کچھ ان کے منہ میں آیا، زخم کے گھاؤ بھرنے کے لئے اس کے نثار کیا؟

اس لئے کہ ''کنز'' (سرمایہ داری) کی آیت کے بارے میں کعب کا نظریہ، اسلام کے ایک مفسر عالم کا علمی تحقیقی نظریہ نہیں ہے بلکہ قرآن کو مسخ کرنے کے لئے اور لوگوں کی بھوک اور سرمایہ داروں کی غارتگری کی توجیہ کے لئے حقیقت کی آگاہانہ تحریف ہے!

اس لئے کہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ ''کم رتبہ'' یہودی! کہ جس کا شمار کل تک یہودی عالموں میں ہوتا تھا، آج جب دیکھتا ہے کہ اب یہودیوں کی مُلّائی سے کچھ حاصل نہیں، سارے کفار یا مسلمان ہو گئے ہیں یا اسلام کو جزیہ دینے والے ذمی یا پھر دنیا سے ان کا رشتہ کٹ گیا ہے، اور بہر حال اب یہ دور، اسلام کا دور ہے، تو آکر مسلمان ہو جاتا ہے اور تن پر اسلامی فقہ اور روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر اب مسندِ فتویٔ اسلام پر براجمان ہوتا ہے اور مسلمانوں کو قرآن کے معنی بتاتا ہے، وہ بھی سرمایہ اندوز عبدالرحمٰن بن عوف کے مفاد اور ان تمام استعمار کے شکار لوگوں کے ضرر میں کہ جنہوں نے عدل وانصاف کی آرزو میں اسلام کا رخ کیا ہے......! اور یہی وجہ ہے کہ رسول خدا کے سچے صحابی اور علی

کے راستباز محب ابوذر چیخ اٹھتے ہیں کہ ''......اے یہودی زادے تو ہم کو ہمارا دین سکھانا چاہتا ہے''؟ اور اسی لئے اس لحن اور اس لہجہ کو سراہتے ہیں کہ: ''خاکی زمین نے کسی کے لئے چھاتی نہیں پھیلائی اور نیلگوں آسمان نے کسی پر سایہ نہیں کیا جو ابوذر سے زیادہ درست لہجہ اور سچی بات کہنے والا ہو''!

اور ہماری سوچ اور ہمارے مذہبی اخلاق کے برخلاف، ''ارفع و اعلیٰ علیؑ ---- اس بے پرواہ، بے لحاظ، اور تند مزاج شخص کو کہ جو تن وتنہا محترم شخصیتوں کے سر پر اونٹ کی ہڈی مار کر چلاتا اور ایک رسوائی کھڑی کرتا ہے اور اعلیٰ عہدیداروں کی حرمت کا خیال نہیں کرتا --- ایک ایسی عجیب تعبیر سے سراہتے ہیں کہ: ''ابوذر کی شرم اور اس کی پاکی، مسیح بن مریم کی طرح ہے''!

ہمارا دکھ یہ ہے کہ ہمارے ان سارے الٰہی اقدار اور سرمایوں کو جو ہماری نجات کی امید کے واحد دریچے ہیں اور ہم شیعوں کے ان تمام رہبروں، پیشواؤں اور معصوم ائمہ علیہم السلام کو کہ جن میں سے ہر ایک کی ''یاد'' اور ہر ایک کا ''خیال'' سارے زمین وزماں کے لئے عظیم ترین درسِ آزادی وانسانیت ہے، اس طرح مسخ کیا گیا ہے اور انہیں ایسی صورت دی گئی ہے کہ اب وہ ہماری اسارت کے عامل ہو گئے ہیں......

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ائمہ کو محبت، ولایت، ارادت، حمایت اور تجلیل کے لباس میں، خلفاء کا وظیفہ خوار بتایا جا رہا ہے......

مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح کی کتابوں، اس طرح کی تحریروں اور اس طرح کی شناسائیوں کو ہر جگہ پیش کیا جا رہا ہے، ان کی تبلیغ کی جا رہی ہے......

مسئلہ یہ ہے کہ عالم کے شہیدوں کے سرور وسردار کے لئے......کہ جو شہادت

کے لمحہ تک ''زندۂ اجل رسیدہ'' تھے اور بعد شہادت ''زندۂ جاوید'' ہیں اور ہر زمانے اور ہر زمین میں حی و حاضر بھی ہیں...... ''کچھ متحرک مردے'' عزاداری کر رہے ہیں اور سمجھ نہیں رہے ہیں کہ ایسی عزاداری خود ان کی طرح کے ''بے مقدار مردہ'' کیلئے ہے نہ کہ حسینؑ جیسے زندہ جاوید کے لئے!

اختلاف اس امر میں ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کا عمل کیا اس لئے ہے کہ ہم صرف آپ کی شہادت پر رو کر اپنے مردہ تن ہونے کی تلافی کریں اور اپنے ارواح کو اس کا ثواب بخشیں؟ یا ان کی پیروی کر کے اپنی مردہ تنی کو اپنے اندر ماریں اور روح حیات کو اپنے متحرک مُردوں کے جسم میں پھونکیں؟ آخر شہادت کی شناسائی کے ان دونوں انواع میں، ''علمی اختلاف نظر'' کہاں ہے تا کہ ہم ''تسلی'' اور ''سکون'' کے ساتھ نہایت ادب و احترام سے علمی تحقیق کے لئے بیٹھیں؟

ہمارے پاس اس ''شہادت'' اور اس ''وراثت'' کے علاوہ، امید کا کونسا دریچہ ہے؟...... اگر میں ایک روشن خیال مارکسسٹ یا اگزسٹینیلسٹ، یا نھلسٹ یا پھر مذہب بیزار اور مذہب دشمن میٹریالسٹ اور اسی طرح کی باتوں سے متعلقہ ہوتا تو پھر خاندان رسالت، فاطمہؑ کے گھرانے، علیؑ کے مکتب اور شیعہ شہداء کے مکتب کی نسبت اتنی ڈھیر ساری بددیانتیوں کے آگے بے توجہ رہ سکتا تھا، ان سے بے اعتنائی کر سکتا تھا، ''غیر جانبدار'' رہ سکتا تھا، اور کہہ سکتا تھا کہ......مثلاً...... ''میرے اندر ان کی حقیقت کی نسبت کونسی حساسیت ہے کہ میں ان کی تحریف اور ان کے مسخ ہونے کی بات کو شدت سے محسوس کروں؟ میں بنیادی طور پر کسی اور فضا میں سانس لے رہا ہوں...... کسی اور راہ پر چل رہا ہوں......اور در حقیقت میں سچے اسلام پر ایمان کو بھی لوگوں کی راہ نجات

نہیں جانتا......''!!

لیکن جب کوئی اپنے پورے وجود، پوری زندگی، اور پورے ایمان سے ایک ایسے خاندان کا ایمانی اور انسانی دونوں نقطہ نظر سے شیفتہ ہو اور یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ان لوگوں کی نجات کا واحد راستہ علیؑ کے مکتب اور فاطمہؑ کے گھر کی طرف سچی بازگشت ہے تو پھر وہ کیوں کر ان ساری تحریفوں اور ان ساری خیانتوں کے آگے خاموش، بے توجہ، بے اعتناء اور ''غیر جانبدار'' رہ سکتا ہے؟ کس طرح ان سب چیزوں کو دیکھ کر، بہت مؤدبانہ اور ''غیر جانبدارانہ'' تحقیقات کے لئے بیٹھ سکتا ہے؟......

یہی وجہ ہے کہ جتنے اتفاقات رونما ہو رہے ہیں، جتنی حساسیتیں بڑھ رہی ہیں، ایک جس قدر مخالفین اپنی مخالفت کی راہ میں مستحکم ہو رہے ہیں اور بالآخر جس قدر بعض گروہ اور بعض باز و زیادہ حساسیت دکھا رہے ہیں ''جانے والا راستہ'' ہم پر زیادہ روشن ہو رہا ہے، حقیقت ہمارے لئے زیادہ مشخص ہو رہی ہے اور انجام کار ہمارے کاندھے پر واقع ذمہ داری کا بوجھ بڑھ رہا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے......

آغاز کار میں، میرے پیش نظر ہر اس شخص کی طرح کہ جسے کم و بیش آگاہی حاصل ہے ایک کلی جہت و ایمان کی بات تھی اور یہ جہت و ایمان اسلام اور تشیع سے مربوط تھا......لیکن جوں جوں زمانہ گزر رہا ہے، جس قدر مسائل واضح تر ہو رہے ہیں، جس قدر ردعمل، بدگوئیوں، بہتان تراشیوں، سازشوں، گالی گفتاروں اور افواہوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور دشمنیاں شدید تر، چھپے ہاتھ ظاہر تر، تحریکی نقاط معلوم تر اور ان کا خوف بیشتر ہو رہا ہے، یہ کلی ''جہت و ایمان'' کہ جو اسلام اور......اس کا صحیح فہم، یعنی......علوی تشیع ہے میرے لئے پہلے سے زیادہ دقیق تر، عمیق تر، حساس تر، نازک

تر، عینی تر اور علمی تر ہو رہا ہے اور علیؑ کی نسبت، علیؑ کے راستے کی نسبت، اور فاطمہؑ کے اس چھوٹے سے گھر کی نسبت کہ جو پوری تاریخ کے احاطے سے باہر ہے، میری آگاہی، میری ارادت، میرا اخلاص، میرا ایمان اور میری حمایت روز بروز بڑھ رہی ہے اور حالت یہ ہوگئی ہے کہ میرے سامنے مسلسل اس چھوٹے بلکہ اس گھر کا ایک نیا دروازہ کھل رہا ہے...... مخالفین کے بارے میں میرے آخری تاثرات اور آخری دریافت یہ ہے کہ ''یہ لوگ ہر چیز سے زیادہ علوی تشیع سے ڈر رہے ہیں''، ان قرائن سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہماری ساری پریشانیوں کی جڑ، اور شیعی سرشت اور علوی ولایت کی دشمن، صفوی تشیع اور ابوسفیانی ولایت ہے'' اور بالآخر سارے مکاتیب، ساری آئیڈیالوجیز، سارے معاشروں، سارے انقلابوں، ساری تحریکوں اور سارے سماجی اور اسلامی علوم کے جائزے، تاریخی پڑتال اور ثقافتی انحطاط، اور فکری اور سماجی انحراف کے عوامل کی تحقیق، خاندان کی عمیق تر شناخت، اور پھر امامت، ولایت، انتظار، عدل، اور طول تاریخ بشر میں آدم کی وراثت پر گہرے مطالعے اور نیز بہت سے تجربوں، بہت سے جھگڑے جھمیلوں اور تاثیر و تاثر سے گزرنے اور تاریکیوں اور چھپی ہوئی باتوں کے روشن ہونے کے بعد، میں اس فائنل یا قطعی اصل تک پہنچا ہوں کہ:

بنیادی طور پر ''شیعہ ایک کامل گروہ'' ہے!

ایک ایسا گروہ ہے کہ جو ان سارے ابعاد و خصوصیات کا حامل ہے جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے، اور ان تمام برتریوں اور مشخصات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے جو آج کے روشن خیال لوگوں کے ادراک میں نوع بشر کی نجات کا مورچہ ہے، ایک ایسا گروہ ہے کہ جس میں وہ سارے ابعاد اور وہ ساری خصلتیں پائی جاتی ہیں

جو ایک کامل آئیڈیل گروہ کا لازمہ ہے، ایک ایسا گروہ ہے کہ جس کا عینی وجود بھی "حزب اللٰہی" ہے کہ جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے اور جو آگاہی دینے والا، جامد معاشروں کو حرکت میں لانے والا، طبقاتی جھگڑوں میں ان کی رہبری کرنے والا، ان جھگڑوں میں ان کی مشکلات کو دور کرنے والا، راستے میں آنے والے موانع کو ہٹانے والا، محروم طبقوں کی آرزوؤں کو حقیقت کا جامہ پہنانے والا اور اس ذمہ دار روشن خیال نسل کا جواب دینے والا بھی ہے۔

......شیعہ اس طرح کی اصل ضروریات کا جوابدہ ہوسکتا ہے۔ یہ، اسلام سے اس طرز استنباط اور اتخاذِ فکر کے ساتھ کہ جو بعنوان آئیڈیالوجی ......اس کے پاس ہے، اور ان تجرباتی اور نیز تاریخی ذخائر کے ساتھ کہ جو اپنی جنگی احساسات سے بھرپور تاریخ میں موجزن ہیں، اس ذمہ دار روشن خیال ☆ نسل کے لئے ایک کامل اور آئیڈیل گروہ ہوسکتا ہے۔

البتہ ممکن ہے بعض غیر مذہبی روشن خیالوں کے لئے یہ بات کسی قدر بھاری ہو کہ "......کس طرح روشن خیال اپنی آئیڈیالوجی کو دین سے لے سکتا ہے؟"......اس

☆......البتہ "ذمہ دار روشن خیال" میں اس بات پر توجہ ضروری ہے کہ "ذمہ دار" کا لفظ ایک توصیفی صفت ہے تعیینی صفت نہیں، اس لئے کہ بنیادی طور پر ایسا نہیں ہوسکتا کہ روشن خیال، ذمہ دار نہ ہو، چونکہ روشن خیال آدمی عبارت ہے اس تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ، دانشور، یا عام انسان...... سے کہ جو "سماجی آگاہی" سے ہمکنار ہو اور "زمانے" اور اس کے تقاضوں کو جانتا ہو اور سماج کے ساتھ اپنے رابطے اور اس کی تقدیر و سرنوشت کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ براہ راست احساس مسئولیت رکھتا ہو۔ یہ وہ روشن خیال ہے کہ جسے رہبرانہ بصیرت......یا آگاہی...... حاصل ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے "آغاز کار کہاں سے ہو؟" اور "روشن خیال اور اس کی ذمہ داری": اسی مجموعے میں "روشن خیال" نامی کتاب)

لئے کہ میسحیت کے تجربے کی بنیاد پر اور دنیا کے جدید روشن خیالانہ نظریہ کی تقلید سے اور نیز ان چیزوں کے دیکھنے سے کہ جو آج ہمارے درمیان دین اور اسلام کے نام سے موجود ہیں اور ان کا جو ایک انسانی اثر اور سماجی کردار ہے وہ یہ نہیں سوچ سکتے کہ ایک گروہی آئیڈیالوجی یا ایک مکمل مرامی آئیڈیالوجی، کوئی مذہبی منشا رکھ سکتی ہے!...... جبکہ، اگر دین، ...... خاص طور پر مذہب اسلام میں اور بالاخص مکتب و معرفت تشیع میں درست اور صحیح متعارف ہوتا تو اساساً یہ مذہبی روشن خیال تھا کہ جسے تعجب ہوتا: ''...... آخر کیوں روشن خیال لوگ، انسان کو نجات سے ہمکنار کرنے والی آئیڈیالوجی کو غیر دینی سرچشموں میں تلاش کرتے ہیں؟ وہ کس طرح مادی آئیڈیالوجی کو ایثار وفداکاری سے بھرپور مکتب بنا سکتے ہیں اور بلند مقاصد، اور انسان کی وجودی تقدیر کی توجیہ کے بغیر کس طرح ''انسانی اخلاق''، ''انقلابی تقویٰ'' اور ماورا فردی ایمان کو ہستی میں قائم کر سکتے ہیں؟'' اس لئے کہ ''روشن خیالی'' ، ...... سائنس، ٹیکنالوجی اور فلسفہ کے برخلاف کہ جن میں سے ہر ایک کا ایک مادی سہارا عالمِ امکان میں ہے (اور بعینہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب پر توجہ کے بغیر بھی کوئی بڑا فلسفی، بڑا عالم اور بڑا ٹیکنالوجسٹ ہوا ہے) بنیادی طور پر ایک خاص ''آگاہی'' ہے کہ جس کے حاملین ہمیشہ زمین پر انسانوں کے لئے، الٰہی پیغمبر رہے ہیں۔

یہی ''امی'' لوگ تھے کہ جو ہمیشہ خلق خدا کے لئے آگاہی بخش، بیدار ساز، اور حرکت آفریں تھے بغیر ازیں کہ ان میں سے کوئی فلسفی، کوئی ہنرمند، کوئی عالم، کوئی ٹیکنیشین اور کوئی ادیب، شاعر، مورخ، یا جہاں دیدہ ہو۔

یہی وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ایک قوم اور ایک طبقہ کو زمانے کی منجمد تقدیر کے خلاف مشتعل کیا اور ان لوگوں کو کہ جو ''تاریخ اور سماجی نظام کے بنائے ہوئے زرخرید

تھے"، "تاریخ ساز" بنایا۔ یہ وہی "آگاہی" ہے جس کی تلاش اور جس کی آرزو میں آج کے روشن خیال افراد سرگرداں ہیں۔ لہٰذا یہ بہت فطری بات ہے کہ ہمارے روشن خیال لوگوں کی "آگاہی"، اسلام اور بالاخص تشیع سے لی گئی ہوگی...... اور ہماری سماجی۔ انسانی آئیڈیالوجی "توحیدی جہاں بینی" کی ایک نیو رکھتی ہوگی۔

چونکہ میری تقریروں میں ۔۔۔ خواہ وہ درسی ہوں یا عمومی ۔۔۔ شرکت کرنے والے بیشتر لوگ عام طور پر چیدہ افراد ہیں کہ جوان دروس، ان مباحث، اس زبان، ان اصطلاحات، اس نگاہ اور اس نقطہ نظر سے آشنا ہیں اور صرف غیر مذہبی روشن خیال حضرات یا وہ مذہبی افراد جو بغیر شناخت، اور بغیر پچھلی باتوں کے صرف میری ایک تقریر کو سنتے یا ایک تحریر کو پڑھتے ہیں اور میری زبان اور اصطلاحات سے عدم آشنائی کی بنیاد پر بڑے عاجلانہ اور قیاسی فیصلے کرتے ہیں، اس لئے آج میں معمول پر مبنی کانفرنسوں کے برخلاف کہ جس میں "واحد مسئلہ" کے لئے بڑی توجیہ و تاویل و تفسیر کی ضرورت پیش آتی تھی، صرف ان مسائل و مباحث کی "تدوین" پر گفتگو کرونگا کہ جنہیں میں نے اب تک مختلف انداز میں ان لوگوں کے لئے پیش کیا ہے جو میری اصطلاحات اور میرے نظریات سے واقف ہیں: ان مختلف مباحث و مواد کی تدوین جنہیں میں نے مستقل یا پراگندہ طور پر تشیع کی نسبت ایک "کامل پارٹی" کی مکمل صورت کے عنوان سے پیش کیا ہے ـــــ البتہ علوی تشیع کی نسبت ـــــ!

یہ جو میں نے عرض کیا کہ جس قدر زمانہ بیت رہا ہے، جس قدر مشکلات اور سختیاں شدید تر، بیشتر اور تیز تر ہو رہی ہیں، اور اس "راہ" میں انسان جس قدر قدم آگے بڑھا رہا ہے...... اسی قدر راستے کے "شدائد"، "موانع" اور پیچ و خم،

راستے کو روشن تر اور آشکار تر بنا رہے ہیں اور اگر کوئی گروہ حقیقت کی راہ میں سچائی اور محنت سے قدم بڑھائے گا، حقیقت کے لئے رنج و مشقت جھیلے گا تو حقیقت اس پر آشکار تر ہوگی اور وہ راستے کو بہتر سمجھے گا۔ یہ عجیب آیت ہماری اس بات کی مصداق یا عینی حقیقت ہے:

"والذین جاهدوا فینا، لنهدینهم سبلنا" ☆

"جن لوگوں نے ہماری "راہ" میں۔۔۔اور ہمارے لئے۔۔۔مجاہدت کی انہیں ہم ضرور اپنے "راستوں" کی "ہدایت" کریں گے!"

یہ قرآن کی منطق ہے کہ جو صحیح طور پر ارسطو کی صوری منطق کے برخلاف ہے، اس لئے کہ یہ (ارسطوئی منطق) وہ منطق ہے جو ماوراء منطق ہے، عقلِ نظری کی منطق میں پہلے خدا کو چاہئے کہ وہ اپنی راہیں انسان پر آشکار کرے اور پھر ان راہوں سے واقفیت کے بعد انسان کو چاہئے کہ وہ انہیں اختیار کرے اور ان پر چل کر جہاد کرے ☆☆ جبکہ خداوند عالم اپنی منطق میں، پہلے "چل پڑنے"۔۔۔عمل و

☆......اس لئے کہ زندگی میں عقلی نبوغ، قلبی اشراق، علمی سوچ اور نظری استدلال کے ساتھ حقیقت کے درک و فہم کی راہ میں نہیں رہا جاسکتا۔ یہ "ہونا" (دائمی حرکت) ہے کہ جس میں (باقی) "رہا" جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انسان مثلاً گولی کی سوزش کو اسی وقت درک کرتا ہے جب وہ اس کے جسم میں پیوست ہو جاتی ہے اسی طرح وہ کسی مفہوم کو صحیح طور پر اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب وہ اس معنی کے مصداق میں آئے۔ یہ عمل ہے کہ جس میں حقیقت اپنے آپ کو آشکار کرتی ہے۔

☆☆ قرآن کی منطق ہماری اس معمول کی منطق کے بالکل برعکس ہے اور بنیادی طور پر قرآن، زیادہ تر ایک ایسی منطق کا حامل ہے جو ماوراء منطق ہے، میرا مطلب ماوراء فہم انسان نہیں اور میرا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسے صرف حکماء الٰہی اور ماوراء طبیعی فلاسفرز ہی سمجھ سکتے ہیں بلکہ اس کے برخلاف، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لوگ، حق پرست لوگ اور عمل و اخلاص و ایثار کے حامل لوگ بہت آسانی سے اس کا تجربہ کر سکتے ہیں! اور یہ اس رو سے بھی ہے کہ ہم قرآن کے خصوصی ۔۔۔

جہاد۔۔۔کی بات کرتا ہے اور پھر ان ''راہروں''۔۔۔عاملین و مجاہدین۔۔۔کو ہدایت کا وعدہ کرتا ہے......!

دوسرے لفظوں میں وہ ان لوگوں کی کہ جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں رہبری اور رہنمائی کرتا ہے اور اپنے رہروانِ راہ کو اپنے راستوں کا پتہ دیتا ہے! اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو آج کے اعلیٰ اور مسئول روشن خیال لوگوں نے پالیا ہے۔

ہر وہ فرد، ہر وہ گروہ، ہر وہ پارٹی یا قوم کہ جو بغیر ذاتی محاسبوں اور بغیر سماجی مصلحت بازیوں کے، انتہائی خلوص اور ایمان کے ساتھ ''ایثار'' سے کام لیتی اور آگے بڑھتی ہے، ہر چند کہ وہ شروع میں ناپختہ ہو، ہر چند کہ وہ مسلسل گرتی پڑتی رہے ہر چند کہ اس کا ایک قدم آگے اور ایک پیچھے ہو، ہر چند کہ وہ عاجز و ناتواں ہو اور بالآخر

؎ روابط و ضوابط کو نہیں سمجھتے اور پھر گمان کرتے ہیں کہ گویا اس کے بیشتر مطالب کا ربط ایک دوسرے سے نہیں ہے۔

بیشتر مستشرقین جنہوں نے قرآن پر کام کیا ہے قرآن کو فکری، ادبی اور بیانی اعتبار سے ایک عجیب شاہکار سمجھتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ ''......اس کی آیتوں میں ''منطق''، نظم نہیں ہے اور معنی کے اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے مرتبت نہیں ہیں......مثلاً جس مقام پر ماہ رمضان کی گفتگو آ رہی ہے اچانک پلٹ کر یہ ذکر آتا ہے کہ: ''اپنے اموال کو حکام کے حوالے نہ کرو کہ وہ اسے کھا جائیں......''!

اس غلط سوچ کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ارسطو کے صوری اور نظری منطق سے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اب تک قرآن کی تفسیر کرنے والے بیشتر اسلامی مفسرین نے بھی اس رو سے کہ انہوں نے اس کام کو (اشراقیوں کو چھوڑ کر کہ جن کی بنیادی طور پر کوئی منطق نہیں ہے) ذہنی اور عقلی نظری منطق کی بنیاد پر انجام دیا ہے، یہ لوگ زیادہ تر بیان میں قرآن کے چھپے ہوئے بدیع مفاہیم، در پردہ روابط اور علمی اور عملی حقائق کو مکمل طور پر واضح نہیں کر سکے ہیں۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے بہ نظر غائر، خوب اچھی طرح، بڑے دھیان سے قرآن کی زبان، اس کی منطق، اور اس کی خاص کلی وابستگی کو محسوس کرے، اس کو ذہن نشین کرے، اس سے ''انس'' پیدا کرے اور پھر ترجمہ اور تفسیر کی طرف آئے۔ اس صورت سے اسے دکھائی دیگا کہ بنیادی طور پر قرآن کی گفتگو کا رنگ کچھ اور ہے اور اس کی زبان ایک خاص زبان ہے۔ ؎

ہر چند کہ شروع میں اس ''راہ'' پر چلنے کی اس میں ہمت وحوصلہ نہ ہو، ہر چند کہ ''شبِ تاریک وبیم موج وگرداب'' اس طرح'' حائل'' نے اس کی نجات اور رستگاری کی امید کو کم کردیا ہو مگر اس کا جہاد جاری رہے، یعنی ''توفیق'' کی امید سے نہیں بلکہ ''تکلیف'' کی توانائی سے آخری دم تک مومنانہ اور مخلصانہ انداز میں لگاتار ہمہ گیرانہ کوشش اور مجاہدت کرے! خواہ یہ جہاد تلوار سے ہو یا قلم سے یا جان ومال سے، خواہ اسے اپنی عزت وآبرو اور رتبے کو انفاق کرنا پڑے! اور اللہ کی راہ میں ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے...... ہر حال میں خداوند عالم بطنِ ''عمل'' میں، متنِ حوادث میں، پیچ دشواریوں میں جنگ وجدل کی قیامت خیزیوں میں، ہر حال میں ہمیشہ اپنی روشن تر، پاکیزہ تر، نزدیک تر اور بہتر راہوں کو لحظہ بہ لحظہ اس کی آنکھوں کے سامنے نمایاں کریگا اور گویا ایک ایسی سیدھی راہ پر اسے قرار دیگا کہ ہر قدم پر ''نور'' کی نامرئی تابش کے ساتھ مجہول راہیں اس کے سامنے روشن ہوں گی، دور کے مناظر اس پر کھل جائیں گے، اس کی راہ پر حائل کیے گئے پشتے ٹوٹ جائیں گے، اس کے آگے نئے افق نمودار

؎ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زیادہ تر لوگوں نے اس ''خصوصیت'' کو سمجھ لیا ہے لیکن اس سے انہوں نے ایک خطرناک، انحرافی، اور خلافِ قرآن نتیجہ اخذ کیا ہے، ایک ایسا نتیجہ کہ جو بنیادی طور پر اسلام کی مسئولیت، پیغمبرؐ کی دعوت، وحی کے ہدف اور قرآن کے پیغام کو — بنام جلالت وعظمت — نفی اور نقض کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن، بہت مشکل، اسرار آمیز، اور پیچیدہ کتاب ہے اور اسی لئے انسان اس کو سمجھنے سے عاجز ہے! (پھر پتہ نہیں کن موجودات کے لئے یہ کتاب زمین پر نازل ہوئی ہے؟) حالانکہ یہ بہت آسان کتاب ہے، تمام فلسفی، کلامی اور ان تمام کتابوں سے زیادہ آسان، جو قرآن کی وضاحت اور اسے آسان کرنے کے لئے لکھی جاتی ہیں! یہ میرا دعویٰ نہیں، یہ وہ خبر ہے جسے خداوند عالم نے خود قرآن میں دی ہے:

"ولقد یسرنا القرآن للذکر" (القمر: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

نہ کہ مشکل نویس علماء وحکماء کی طرح، مشکل وثقیل زبان میں انتہائی سادہ اور سبک مفہوم بلکہ اس کے برخلاف نہایت سادہ اور آسان زبان میں انتہائی عمیق اور حیرت انگیز مفہوم، قرآن کے لئے ''مبین'' کی صفت یعنی یہ!

ہوں گے اور آفتاب کے شعاعی خطوط زیادہ عمودی صورت سے اس پر نور افشاں ہو کر اس کے آگے کی راہ کو روشن تر کر دیں گے، اس کے سر پر گرائی گئی چھتوں اور اس کے پیروں کے آگے گرائے جانے والے پتھروں سے وہ (قوم) بقوت ''صبر'' اور بہ ''توفیق'' اعجاز پلوں کی تعمیر کریگی اور خدا کی ''بخشی'' ہوئی قوت سے اسے سکون، یقین اور توانائی حاصل ہوگی اور اس کے قدم آگے بڑھیں گے اور وہ پہلے سے زیادہ تیزی سے یورش کریگی......

اور یوں ''ایمان وعمل سے متصف لوگ جنہوں نے اپنی زندگی کو حق پرستی پر نچھاور کر دیا ہے اور اپنا گھر بار اس لئے چھوڑا ہے کہ خدا کی راہ میں خلق خدا کے لئے قدم بڑھائیں، یہ جس قدر اس کی سمت راستہ ہموار کرنے کے لئے اپنی کوششیں بروئے کار لاتے ہیں وہ زیادہ ہموار اور زیادہ مطمئن راہ ان کے قدموں کے آگے کھولتا ہے'' اور اس طرح متن ظلمت و ضلالت، اور سختیوں، دشمنیوں، مایوسیوں، عاجزیوں، کمزوریوں، نا آشنا لوگوں کی دشمنیوں، آشنا لوگوں کی خیانتوں، فرومایگیوں، ضربوں، دشواریوں، دردوں اور جراحتوں کے عروج پر...... جو ''بندہ'' ہر بند سے آزاد ہوتا ہے، وہ ''صابر'' جو مصیبتوں کی جھڑی میں تک کر کھڑا ہوتا ہے، وہ ''شاکر'' کہ جسے مایوسی، سیاہ اندیشی، اور بدگمانی کا زہر نہیں اجاڑتا اور وہ جلتے صحراؤں اور دشوار گزار سنگلاخوں پر ''اس کی'' سمت قدم اٹھاتا، دکھ جھیلتا اور چوٹیں کھاتا ہے، جس کو سامنے سے تازیانہ اور پشت سے خنجر مارا جاتا ہے اور وہ رات میں، پیاس میں، خطرے اور پریشانی میں اور دشواریوں کے ملبے اور عناد وعداوتوں کے تیروں کی بوچھاڑ میں...... آگے بڑھتا ہے، مشکلوں سے بھڑتا ہے، وسوسوں کو اپنے اندر مارتا ہے، موت کی وادی سے گزرتا ہے اور ''حق پرستی میں، اپنی کوششوں کو بروئے کار لاتا ہے'' تو ہر کوشش پر اس کی راہ

روشن تر، اس کی ذمہ داری مشخص تر، اس کا فریضہ دقیق تر، اور ہر قدم پر اس کی تردید دور تر، اس کا ہراس ضعیف تر، آزار بیشتر، مگر آزردگی کمتر، عشق زوردار تر، اخلاص خالص تر، بندشیں شکستہ تر، میلانات سست تر، خدا کے حضور صریح تر، یقین محکم تر، حیرت شبک تر، ایمان فزوں تر اور کامرانی پر امید قطعی تر ہوتی ہے۔

خدا اس طرح درس دیتا ہے!

مگر دوسرے لوگ دلیلوں کے ساتھ عالمانہ، عاقلانہ، اور حکیمانہ انداز میں اس طرح پند و نصیحت کرتے ہیں کہ:

''پہلے تمہیں چاہئے کہ تم سوچو، مطالعہ کرو، علم حاصل کرو، علمی تحقیق کرو، کتابیں پڑھو، حوزوں کا رخ کرو، اساتذہ کے آگے زانوئے ادب تہ کرو، فقہ، اصول، فلسفے، کلام، منطق، زبان، ادب، تاریخ، حکمت اور اخلاق کو ''اہل فن'' کے محضر میں سیکھو تاکہ تم جامع معقول و منقول بنو، اور ساری دنیا کے حقائق کو پاسکو، اسرار وجود کو سمجھ سکو، اور واجب الوجود اور ممکن الوجود کے رابطے کو، ذات باری تعالیٰ کی صفات کے رابطہ کو، قدیم و حادث کے رابطے کو، لاہوت، و ناسوت کے رابطے کو اور فلسفہ حیات، راز اجل، منازل آخرت، عالم غیب و شہادت، جن و انس، طبیعت اور ماوراء طبیعت، دنیا و آخرت، وجود و ماہیت، اور جوہر و عرض کو، فہم عالی میں لاسکو، اور پھر عقائد و احکام کے ایک مکمل دور کی تعلیم بھی حاصل کرو اور علم الیقین کے مرتبہ پر پہنچو اور وہاں سے ''حق الیقین'' اور ''عین الیقین'' کی چوٹی تک پہنچو...... تاکہ ''حقیقتِ مطلق'' تم پر آشکار ہو اور تم معرفت کے آخری درجات کو طے کرو، اور ابھی یہ پہلا مرحلہ ہے،

اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد (کہ جو ہرگز طے ہونے والی نہیں!) تم دوسرے مرحلہ میں داخل ہو گے، یعنی مرحلہ عمل اور مرحلہ اصلاح میں، لیکن انفرادی عمل اور اپنی

اصلاح میں۔

اور اس مرحلہ میں تمہیں سارے وظائف پر عمل کرنا ہوگا، سارے واجبات انجام دینے ہوں گے، مستحبات کو انجام دینا ہوگا عبادت و ریاضت و تزکیہ روح اور ''قتل نفس'' کے ساتھ''!! نہیں میں کیا کہہ گیا ''نفس کو مارنے'' کے ساتھ! (یہ بھی تو وہی ہے!) اور جب تم اپنے اندر ساری لذتوں، ساری خواہشوں، ساری کمزوریوں، اور ساری آلودگیوں کو مکمل طور پر جڑ سے نکال پھینکو گے اور تقویٰ و پاکیزگی کا مقام حاصل کرو گے، کمال کے درجے پر فائز ہو گے، اخلاص کے مرحلہ پر پہنچو گے اور صحیح معنوں میں ''عابد، زاہد، متقی، مومن صالح، اور مخلص کامل'' ہوگے۔۔۔ (کہ جو کبھی نہیں ہوگے)۔۔۔ اور اس سے پہلے بھی جیسا کہ آچکا ہے، ''تم عارف، حکیم، فقیہ، جامع معقول و منقول، حق و باطل پر بصیر، اسرار الٰہی پر خبیر، دینی حقائق پر علیم، اور شرعی احکام و عقائد پر عالم کامل ہو چکے تھے۔۔۔ (کہ محال ہے کہ ہوئے ہوگے)۔۔۔ پھر کہیں جا کر تم تیسرے مرحلہ کو شروع کر سکو گے اور دوسروں کی اصلاح پر کمر بستہ ہو سکو گے اور لوگوں کے دین و دنیا کی مسئولیت کو بھی اپنے ذمہ لے سکو گے۔ یعنی پہلے درس و بحث و کتاب و مدرسہ و استاد اور منطقی اور نظری تعلیم و تعقل اور الہام و اشراق و تفکر و تامل اور علم و عرفان اور ''عقل'' و ''دل'' کی راہ سے حقیقت کی شناخت، پھر دوسرے مرحلہ میں: عبادت و ریاضت و دعا و توبہ و استغفار و احترام، اور استحبابی روزوں پر کاربندی، مستحبات پر عمل، مطلق طور پر ترک مکروہات اور بالآخر توسل، شفاعت، ندبہ، استغاثہ، نذر و نیاز، اشک ریزی، تصنعی گریہ، (تباکی)...... اور نوحہ و مجلس و ماتم و زیارت و تعزیہ و مدح و منقبت و سب و لعن اور حب و بغض اور شب بیداری و اعتکاف اور تجوید و تلاوت قرآن کے دور سے...... اپنی اصلاح۔ (اس تلاوت و تجوید میں، تفسیر نہیں آتی، اس

لئے کہ تفسیر عبادت نہیں، اس میں اجر ہے نہ ثواب، یہ ارواح کو کوئی فیض نہیں پہنچاتی اور اس کا تعلق تزکیہ اور تصفیہ سے نہیں، اور یہ پوری طرح دینی اعمال کے کھاتے میں نہیں آتی!!)......

اور اس کے بعد تیسرے مرحلہ میں: معاشرے کی اصلاح، مسلمانوں کے امور کے سلسلے میں اہتمام، دوسروں کی ذمہ داری، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، کہ جب تم حق کو مطلق، کامل اور یقینی طور پر پہچان لوگے اور اپنی اصلاح سے فارغ ہو لوگے تو اس وقت تمہیں اس کام کو شروع کرنا ہوگا، اور ابھی بات ختم نہیں ہوئی، اس مرحلہ میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مزید کچھ شرائط ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ہمیشہ اور ہر جگہ رہنے والے اصول پر مبنی اصل الاصول یعنی "تقیہ" ---کے خطرے کا باعث نہ بنے، اس لئے کہ تقیہ ان لوگوں کے مکتب میں، ایک "عملی تدبیر" نہیں بلکہ اساساً خود "دین" ہے، چونکہ روایت کہتی ہے کہ: "التقية ديني و دين آبائي"، یعنی: تقیہ میرا اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ نہ کہ ایک طرح کا رویہ، ایک طرح کی عملی مصلحت اندیشی، دشمن کے آگے رازداری، یا حکومت جور میں مخفی مبارزہ کے شرائط کی رعایت یا تفرقہ اور برادر کشی کی روک تھام اور وحدت کو قائم کرنے کے لئے عظیم اسلامی معاشرے میں بعض فرقوں سے متعلق اختلافات کو پیش کرنے سے گریز، مگر ایسا نہیں یہ دین کا ایک جز ہے بلکہ تقیہ خود ایک دین ہے اور اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین---تقیہ---کو ضرر پہنچاتے ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ حرام ہے، بے دینی ہے!

اس کے شرائط میں ایک اور شرط یہ ہے کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں "کسی ضرر کا احتمال" ہو تو تکلیف ساقط ہے!

''مذہب'' میں بعض قدما کی رہنمائی کا میثقذ اوران کا طرز تفکر یہ ہے!

لیکن ہمارے بعض جدید روشن خیال لوگوں کی رہنمائی کا میثقذ اوران کا طرز تفکر بھی ''آیڈیالوجی'' میں اسی طرح ہے!

''پہلے ضروری ہے کہ تم اپنے آپ کو آیڈیالوجی کے نقطہ نظر سے سنوارو، اپنی جہاں بینی کو منتخب کرو، مذہب کی نسبت اپنے فریضہ کو پورا کرو، فطری اور سماجی نوظہور چیزوں کے منطقی تجزیوں کے عمل سے گزرو، سیاسی، سماجی، طبقاتی، عالمی اور قومی مسائل پر ایک مکمل اور ہمہ جہت آگاہی حاصل کرو؛ اپنے فکری مرکز، سماجی موقف، ڈیالکٹیکی منطق، آیڈیالوجیکی ہتھیار اور آخر کار اپنی میٹریلیسٹیکی جہاں بینی، غیر مذہبی سوچ، اور اپنی پارٹی کے مورچے اور عالمی پناہ گاہ کو۔۔۔ کہ جو سب کے سب پہلے سے متعین، ثابت، ناگزیر، حتمی، ڈھلی ہوئی اور ڈگمیٹیک (DOGMATIQE) ہیں۔۔۔ معین کرو اور پھر جب دنیا بھر میں معمول ضوابط کی بنیاد پر تم ایک عدد اسٹینڈرڈ شدہ روشن خیال آدمی کی صورت اختیار کرو تو پھر تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم ایک نئے انداز کے روشن خیال آدمی کے عنوان سے اقتصادی ذرائع پر سماجی مالکیت کی باز جوئی، طبقاتی تضاد، اور انسان کے استثمار کی نفی اور معاشرے کے پیداواری ذرائع اور وسائل پر فردی مالکیت کے لئے کوشش کرو اور ایک ذمہ دار آدمی بنو''۔

باوجود اس کے کہ ان عملی مسائل کا تعلق دنیا بھر کے لوگوں کی عمومی اور کُلّی امنگوں اور نوع انسان کے فطری رجحان سے ہے! یہاں تک کہ ایک اسٹینڈرشدہ کلاسیک روشن خیال شخص نے میری مکمل نفی کے عنوان سے میرے ایک ہم خیال طالب علم سے کہا تھا: ''ابھی تو فلاں نے اپنی آیڈیالوجی کو دقیق اور کامل صورت میں، اس کی ساری جزئیات کی تشریح، اس کے سارے معین و مقرر مسائل، سارے سوالوں کے جوابات

کی تدوین، سارے علمی قواعد کی تعیین، سارے علمی فارمولوں، ساری سیاسی، سماجی، معاشی اور سارے علمی اور انسانی مظاہر کے منطقی تجزیوں اور عملی منصوبہ بندیوں کے ساتھ مکمل نہیں کیا ہے، پھر کس طرح اس سے پہلے کہ اس کی آئیڈیالوجی کامل اور دقیق صورت میں سامنے آئے، اس راہ پر چلا جا سکتا ہے؟ وہ کس طرح آئیڈیالوجی کے نقطہ نظر سے اپنے فکری کام کو پورا کرنے سے پہلے اس سوال کو پیش کر کے جواب دیتا ہے کہ: ''آغازِ کار کہاں سے ہو''؟

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ دونوں کی بات پہلے ''فکر'' اور پھر ''عمل'' ہے

وہ دین کے نام سے کہتا ہے: پہلے ضروری ہے کہ ''تم دین کے عارف اور اخلاق وتقویٰ میں صالح بنو، اور پھر دوسروں کی اصلاح پر کمر باندھو''۔

اور یہ آئیڈیالوجی کے نام سے کہتا ہے: پہلے ضروری ہے کہ تم آئیڈیالوجی کے نقطہ نظر سے اپنی تعمیر کرو، اپنے اختتام یافتہ تدوین شدہ مکتب کو انتخاب کرو؟ اس کے بعد ایک ''ذمہ دار روشن خیال'' فرد کے عنوان سے تمہیں یہ حق حاصل ہوگا کہ تم سماجی کردار کا دم بھرو اور لوگوں کو راستے اور عمل کی طرف بلاؤ''!

وہ بنام اسلام کہتا ہے: پہلا مرحلہ: دینی حقائق سے پوری طرح آگاہی، اس کے بعد دوسرا مرحلہ: اپنی اصلاح اور تزکیہ وتقویٰ میں کامل ہونا، اور پھر تیسرا مرحلہ: دوسروں کی اصلاح اور معاشرے کی اچھائی اور برائی کی ذمہ داری!

جبکہ اسلام خود پوچھتا ہے: تمہارا سن کیا ہے؟ تم جواب دیتے ہو: نو سال، پندرہ سال۔ پھر کہتا ہے: اب تم سن ''بلوغ'' کو پہنچ گئے ہو--- عقلی اور جسمی بلوغ--- پس تمہارا ''سنِ تکلیف'' شروع ہو گیا ہے، یعنی تم ایک ''مکلف انسان'' ہو! تم پوچھتے ہو: کیسی تکلیفیں؟ کونسی ذمہ داریاں میرے کاندھوں پر آ پڑی ہیں؟

وہ آپ کو گنواتا ہے: دین کا انتخاب اور سمجھ بوجھ کر اس کو اپنانا، نہ یہ کہ اپنے ماں باپ اور بڑوں کی تقلید میں اسے اختیار کرنا بلکہ اپنی عقل اور اپنے فہم کو اس کا ذریعہ بنانا اور خود آگاہی، استدلال اور انتخاب کی راہ سے مذہب کے اعتقادی پایوں کو دریافت کرنا اور نماز، روزہ، جہاد، زکوٰۃ، حج، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے احکام و واجبات اور مذہب کے عملی شاخوں پر عمل کرنا!

--- کیا یہ واجب فرائض اور یہ حتمی عملی مسئولیت مرحلہ وار ہیں؟ ایک کے بعد ایک ہیں؟

--- ہرگز نہیں! یہ سب ایک ساتھ ہیں، سب ایک کیفیت میں ہیں، سب تکلیف کے پہلے دن سے، بلوغ کے ابتدائی مرحلہ سے، ہر لڑکی، ہر لڑکے اور ہر انسان پر ایک ناگزیر مسئولیت ہیں!

جائے حیرت ہے! دو اسلاموں کے اختلاف کو ملاحظہ کیجئے! وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر --- یعنی سماجی ذمہ داری --- کو، فرد پر علم اور تقویٰ کے دو مرحلوں سے گزرنے کے بعد لاگو کرتا ہے، ان دو مرحلوں سے گزرنے کے بعد کہ جن کو طے کرنے کے لئے عمر نوح بھی کافی نہیں ہے۔

اور یہ، امر و نہی کی سماجی ذمہ داری کو اسی لمحہ سے نوعمر لڑکی اور نوعمر لڑکے کے کاندھوں پر ڈالتا ہے جب سے اسے نماز اور روزے کی دعوت دیتا ہے! سماج کے معروف و منکر اور جہاد کے پہلو میں امر و نہی کی مسئولیت، نماز اور روزے کے ساتھ!

یعنی کیا؟ یعنی یہ کہ اسلام میں ایک مسلمان شخص کی ذمہ داریاں (واجبات) ایک دوسرے کے طول میں نہیں عرض میں باہم قرار پائی ہیں، بالکل ان ''مذہبی انڈویجولسٹوں'' کے دینی اور اخلاقی مواعظ کے برخلاف کہ جو یا تو مشرقی صوفیانہ

اخلاق کے زیر اثر آ گئے ہیں یا پھر رندانہ طور پر احکام کو **Classify** کر رہے ہیں تا کہ امر ونہی کے حکم کو آخری باری دیں اور اس کو ایسے عجیب وغریب شرط وشروط کے ساتھ مشروط کریں کہ اس پر عمل، عملاً محال ہو اور ہماری چار دن کی زندگی میں اس کی باری نہ آئے اور انسان اس دنیا میں حقائق کے کامل علم سے کہ جو لامتناہی ہے اور تقویٰ وصلاح واخلاق کے درجہ کمال تک پہنچنے سے کہ جو قریب بہ محال ہے ہرگز فارغ نہ ہو اور آخری ذمہ داری کی باری تک نہ پہنچے اور ''یہ بھاری پتھر، نہ مارنے کی علامت ہے''! اور یہ سب باتیں امر ونہی کے مشکل، اور دردسر بھرے حکم سے فرار کے لئے ہیں اور اس میں ذہنی حقیقت جوئی کی توجیہ اور انفرادی خود پسندی کا دخل ہے۔ یہ صورت مسئولیت سے گریز اور ''انسان کی مردہ تنی'' پر دینی علم وتقویٰ کا سبز یا سفید چادر ڈالنا ہے!

اور وہ بھی کس مہارت اور کس خوبی سے!

اور آپ دیکھتے ہیں کہ کس محترم، معزز اور مقدس انداز میں! اب آپ ذرا جناب رسالت مآبؐ کو ملاحظہ فرمایئے کہ۔۔۔ صحرائے ربذہ کا ایک بدوی عرب۔۔۔ جندب بن جنادہ کو خبر ملتی ہے کہ کسی پیغمبر نے ظہور کیا ہے، وہ مکہ آ کر اسلام قبول کرتا ہے، صرف ایک نشست اور چند جملوں میں! نہ فلسفہ، نہ کلام، نہ فقہ، نہ حکمت، نہ اصول، نہ عرفان، نہ عملی، فنی اور تحقیقی اسرار وحقائق، نہ ثقافت، نہ علوم، نہ کتابوں کے انبار، اور نہ برسوں کی تعلیم...... بلکہ صرف چند اصول کہ جو صرف ان کی ''جہت'' اور ان کی راہ کو واضح کرتے ہیں! توحید، رسالت اور بس!

وہ اس اسلام کے ساتھ اس گھر سے باہر آتا ہے۔ جبکہ ابھی اسلام نہ صرف ابوذر کی فکر میں بلکہ جناب رسول خداؐ کی رسالت میں بھی مکمل نہیں ہوا ہے، اسلام صرف ایک جہاں بینی ہے، ایک اصل ہے، ایک نعرہ ہے! توحید کا نعرہ، لیکن اس کے

باوجود یہ آدمی ابن ارقم کے گھر سے اس اسلام کے ساتھ باہر نکلتا ہے جسے اس نے صرف ایک ''ملاقات'' میں سیکھا ہے۔ اب وہ سماج کی مسئولیت کے بھاری بوجھ کو، قوم پر حاکم نظام اور سماج پر حاکم مذہب کی تبدیلی کی ذمہ داری کو اور شرک کے خلاف ایک قاطع اور خطرناک جنگ کو اپنے کاندھوں پر شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ابھی گھر سے اس کے چند قدم بڑھنے اور اپنے اسلام سے چند دقیقے گزرنے نہیں پاتے کہ وہ وقت کی عظیم طاقت یعنی اشرافِ قریش اور قوم کے موہوم مقدسات کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور لوگوں کو حقیقت ونجات کی طرف بلاتا ہے۔ اب بتایئے کہ ابوذر نے کب؟ کہاں؟ اور کتنے عرصے تک اپنی اصلاح اور تہذیبِ اخلاق کا سفر طے کیا کہ اتنی تیزی سے اس کے اسلام میں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی باری آئی ہے؟ بس فوراً ہی اس نے امر ونہی کا آغاز کیا اور اپنے معاشرے کی اصلاح پر کاربند ہوا! اس لئے کہ اسلام میں، فرد، لوگوں کی تعمیر کے دوران اپنی تعمیر کرتا ہے اور تفکر، تجربہ، ٹکراؤ، صبر، مشکلات، خطروں سے مقابلے اور نیز چارہ جوئیوں، راہ یابیوں، فداکاریوں، دکھ دردوں، قربانیوں، تاثیر وتاثروں، نئی رونما ہونے والی باتوں، پیش بینی نہ ہونے والے مسئلوں، سانحوں، واقعیتوں اور عینی حقائق کے ساتھ...... اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کو زیبائیوں (معروف) کی طرف بلائے، اور معاشرے میں بدصورتیوں کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کرے اور ماحول بنائے، اس کیفیت میں وہ خود سنورتا ہے، اس کی روح توانائی حاصل کرتی ہے، اس کا نفس پاک ہوتا ہے، اس میں تقویٰ کی طاقت کو تقویت ملتی ہے، اس کی اخلاقی قدروں کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے، اس کی فطرت میں چھپی ہوئی استعداد کھل اٹھتی ہے، اس کے اندر خفتہ انسانی وجدان جاگ جاتا ہے، اس کی روح جلا پاتی ہے، اس کے ایمان

کو تقویت ملتی ہے اور وہ پختہ اور صیقل شدہ ہو جاتا ہے، نکھر جاتا ہے، وہ اپنی انتخاب کی ہوئی خدائی راہ کی حقیقت، اسلامی دعوت کی اصالت، اور عقیدے کو جس پر اس نے اپنا ایمان استوار کیا ہے تجربہ کے عمل سے گزارتا ہے، اپنے عمل، اپنے جہاد اور سماجی و اعتقادی مجاہدت میں، خدا کی پنہاں راہوں اور مجہول حقائق کو دریافت کرتا ہے اور اس طرح اس میں آگاہی آجاتی ہے اور وہ خود آگاہ اور خدا آگاہ ہو جاتا ہے اور یوں ''مسلمانیت کے عمل'' میں ہر روز ''مسلمان تر'' ہو جاتا ہے!!

اور آج بھی ان عظیم انسانوں نے جنھوں نے انسانی اور سماجی واقعیات پر آگاہی کو --- کتب خانوں، یونیورسٹیوں، عالمی کانفرنسوں، اور نظری انٹرویوز میں نہیں --- بلکہ ''سماجی عمل'' اور ''محاذ آرائی، جنگ و جدل، اور مسئولیت'' سے حاصل کیا ہے اس عظیم حقیقت کو --- کہ جس کی بنیاد پر اسلام نے اپنے عقائد و احکام کو استوار کیا ہے --- تجربہ کے عمل سے گزارا ہے اور ''نظری منطقیوں'' کے برخلاف جو اس بات کے معتقد ہیں کہ:

''پہلے سوچ اور پھر عمل ایک بدیہی امر ہے، پہلے فکری کام کرنا چاہئے اور پھر عملی کام''، اس عینی واقعیت کو پالیتا ہے کہ فکر و عمل، یکے بعد دیگرے آنے والے دو مرحلے نہیں ہیں کہ جو مقدم و موخر ہوں، ان دونوں کے درمیان ایک جانب والا ''رابطہ علیت'' برقرار نہیں ہے بلکہ یہ دونوں، دو جانب والے، متقابل رابطہ علیت کے حامل ہیں کہ جو مسلسل ایک دوسرے کے ساتھ تاثیر و تاثر (اثر گزاری اور اثر پذیری) کے عمل میں ہیں اور ہماری صدی کے ایک ممتاز سماجی مفکر نے کیا خوب کہا ہے: ''عقیدہ و عمل کے درمیان ایک ڈیالکٹیکی رابطہ قائم ہے''۔

کس طرح؟ اس طرح جس طرح ''شاندل'' نے کہا ہے: ''تخلیق کار اپنی تخلیق

کے زیر اثر خلق ہوتا ہے"

فردوسی شاہنامہ کو وجود بخشتا ہے اور شاہنامہ فردوسی کو۔

فردوسی، آغاز میں ایک ایسا وطن پرست دہقان زادہ تھا جس کی طبع میں شاعری تھی۔ جب ۳۵ سال بعد اس نے شاہنامہ کی تکمیل کی تو لوگ اسے حکیم ابوالقاسم فردوسی کے نام سے جاننے لگے: مشرق کا ہومر، یعنی شاہنامہ کا شعری مجموعہ تیار کرنے والا۔ ان دونوں "شخصیتوں" کے درمیان عظیم اختلاف "شاہنامہ" کا کام ہے۔ شاہنامہ نیز فردوسی کو پیش کرتا ہے، اس لئے کہ شاہنامہ، فردوسی کا عمل ہے، اور "فردوسی" سے مراد فکر ہے، اور فردوسی کی ذہانت ہے۔ فکر وعمل ایک دوسرے کو بنانے والے اور پیدا کرنے والے ہیں۔ ہر ایک دوسرے میں اور دوسرے کے ہاتھ سے بنتا، پروان چڑھتا اور شکل وصورت اختیار کرتا ہے......اور فکر وعمل کے درمیان "ڈیالکٹیکی رابطہ" یعنی یہ!

میں کیوں اس دور کے انقلابی مفکر اور ایک فطین معاشرہ ساز رہنما کی بات سے استناد کر رہا ہوں؟ اس لئے کہ اعلیٰ رتبہ والے گرامی قدر علیؑ نے ایک انتہائی دقیق اور خوبصورت تعبیر میں اس رابطے کی خبر دی ہے کہ:

"فبا الایمان یستدل علی الصالحات و بالصالحات یستدل علی الایمان" ☆

(ایمان سے نیکیوں پر استدلال کیا جاتا ہے اور نیکیوں سے ایمان پر دلیل لائی جاتی ہے)

اور اسی لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ایسے پیغمبر نہیں ہیں کہ حقائق کو بہت واضح، دقیق، اور تمام وکمال صورت میں وحی سے براہ راست لیں اور نہ ایسے امام ہیں

☆......نہج البلاغہ......۱۵۴واں خطبہ

کہ ''عصمت'' کا دست صیانت وہدایت ہم کو ذلت وضلالت سے محفوظ رکھے، ہم، سب کی طرح ایک عام آدمی ہیں اور ہم سے اسی طرح خطا ہوتی ہے جس طرح سب سے ہوتی ہے، ہم ٹھوکر کھاتے ہیں، ہم سے لغزش ہوتی ہے، ہم بشری کمزوریوں کے زیر اثر ہیں، اس کے علاوہ خدمت، خیانت، دوستی، دشمنی، توفیق، شکست، امید، ناامیدی، اور اس طرح کے اور دیگر عوامل ہیں جو ہماری سوچ، ہمارے احساس، اور ہمارے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ناچار، ہمیں چاہئے کہ ہم تکلیف جھیل کر اپنی فکر، اپنی جستجو، اپنی تحقیق، اپنی پرسش اور کتابوں کی مدد، دانشوروں کی یاوری، محققین کی زحمتوں اور حقیقت پرستوں کی رہنمائی سے...... کھوج لگائیں! اور یہ وہ کام ہے جسے بتدریج ہونا چاہئے، اور ہمیں چاہئے کہ ہم قدم بہ قدم اس کے قریب جاتے جائیں اور تھوڑا تھوڑا کر کے اسے حاصل کریں۔ ہمیں ماننا چاہئے کہ اگر ہمارا ہر اٹھنے والا قدم بلاشبہ پچھلے قدم سے بیشتر ہے تو بعد کا قدم، حقیقتِ کامل اور حقِ مطلق کی نسبت عقب تر ہے اور ہمیں یہ بھی ماننا چاہئے کہ اس کے ساتھ ساتھ ممکن ہے ہر قدم پر ہم سے غلطی ہوئی ہو، ہر لحہ ممکن ہے ہم نے پیچھے کی طرف قدم رکھا ہو۔ ممکن ہے کہ خطرات، کمزوریاں، خودغرضیاں، ضعفِ فکر، نقصِ علم، استنباط کی کجی، زمانے، تربیت اور ماحول کا اثر اور بہت سے وہ عوامل جسے ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں اس بات کا سبب بنیں کہ ہم راستے کو صحیح طے نہ کریں اور بہت سی عداوتیں، رکاوٹیں، ہم پاشیاں، شہ زوریاں، فریب کاریاں اور دیدہ ونادیدہ ہاتھ ہم کو مفلوج کر کے آگے بڑھنے سے روک دیں، لیکن ان تاریکیوں، دشواریوں اور دشمنیوں کے ہجوم میں اور اپنی بہت سی لغزشوں، محرومیوں، اور خطاؤں کے امکان کے اعتراف کے ساتھ...... ہم سب نے ایک اصل کی نسبت بڑی قوی امید باندھ رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بہر حال ہمارا علم،

ہماری عقل، اور ہماری توانائی جتنی بھی ضعیف ہو اور ہماری منتخب راہ، ہر چند کہ ممکن ہے ایک دقیق انتخاب نہ ہو اور جو کچھ ہم نے کیا ہے ہر چند شاید کہ اس کی کوئی اہمیت نہ ہو لیکن یہ ہے کہ ہم نے اپنے اس آغاز کردہ جہد و جہاد و جستجو میں، اس درد و داغ میں جس میں ہم گھل رہے ہیں اور ان تکلیفوں، بدیوں، تباہ کاریوں، فرومایگیوں، اور سختیوں میں کہ جو ہم سے دست بہ گریباں ہیں اور ہم شاکر، صابر، عشق سے لبریز دل، اور امید سے بھرے سر کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو...... آگے بڑھ رہے ہیں۔ صرف اس امید پر ہمارا سفر جاری ہے کہ یہ اس کی راہ ہے اور ہم اس پر چل رہے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے اس راہ کو انتخاب نہیں کیا ہے جس پر سب چل رہے ہیں اور جس میں یا جلبِ منفعت کی بات ہے یا دفع شر کی، صرف اس امید پر کہ یہ بات "اس کی" رضایت کا سبب بنے اور خلق خدا کی ضرورت کو پورا کرے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خواہ ہم اپنی فکر میں کتنے ہی ضعیف کیوں نہ ہوں، اس اعتبار سے کہ عمل میں ہماری ساری کوشش اور جدوجہد صرف اس کی راہ میں ہے، ہم مطمئن ہیں کہ وہ خود اپنی درست ترین اور نزدیک ترین راہوں کو ہمارے سامنے کھول دیگا اور ہم کو کہ ہمارا سارا سرمایہ ہماری ضرورت، ہماری کوشش اور اس راہ میں ہمارا صبر و جہاد ہے...... اپنی راہ پر لے جائے گا اور ہر قدم پر ہماری راہ ہموار تر اور ہر پشتہ کو گرانے کے بعد روشن تر ہو گی!

ہم، وہ گروہ جو ہر حال میں خدا...... اور خلق خدا...... کا رخ کیے ہوئے ہے اور اپنی طاقت اور توانائی کی حد میں "اٹھ کھڑا ہوا" ہے تا کہ جس یگانہ راہ کو ہمارے حوالہ کیا گیا ہے ہم اسے زیادہ سے زیادہ بہتر صورت میں پہچانیں اور پہچنوائیں، اس پر "روانہ" ہوں اور اس کے "پاسدار" بنیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر لمحہ ہمیں بہتر اور بیشتر

ہدایت و ہمت حاصل ہوگی تا کہ اس ''راہ'' میں آنے والے نشیب و فراز، موانع و مشکلات اور گرد و باد والے ہولناک طوفان، سیاہ آندھیوں، تیرگیوں، ظلمتوں، دھونس دھمکیوں، لالچوں، خوف خطروں اور ہر طرح کے مایوس کن اور ہمت شکن عوامل کے باوجود ہم اپنی توجہ نہ کریں، نا امید نہ ہوں، ایک لمحہ کے لئے بھی توقف نہ کریں، لغزش نہ کھائیں، قدم پیچھے نہ اٹھائیں، اور بالآخر خود کو اور عوام کو دھوکہ نہ دیں...... اور ابوذر کی طرح رہیں کہ جس نے عبدالرحمٰن بن عوفوں، معاویہ بن ابوسفیانوں، اور کعب الاحباروں کی دھونس، دھمکیوں، اور لالچ و تکفیروں کے بے اثر ہونے کے بعد حضرت عثمان کے کارندے سے کہا تھا:

''اگر تم اپنی تلوار کو (اپنے گلے کی طرف اشارہ کر کے کہا) یہاں رکھو اور میں یہ محسوس کروں کہ میرے گلے میں بس ایک سانس باقی ہے تو میں اس آخری سانس کو بھی چپ رہ کر باہر نہیں نکالونگا، بلکہ اس حق بات کی پکار میں صرف کرونگا جسے میں نے اپنے عظیم المرتبت دوست محمدؐ سے سنا ہے......''!

والذین جاھدوا فینا، لنھد ینھم سبلناو ان اللہ لمع المحسنین ☆

جن لوگوں نے ہمارے امر میں مجاہدت کا آغاز کیا ہم ان کی رستگاری اور نجات کے لئے اپنی راہیں ان کے سامنے کھول دیں گے۔

''......اور بلاشبہ خدا ان کے ساتھ ہے جو اچھی طرح کام کرتے ہیں اور اچھا کام کرتے ہیں''۔

اور ان ''راہوں'' میں سے ایک راہ

ایک ''کامل گروہ'' کے عنوان سے علوی تشیع کی سمجھ ہے!

☆......عنکبوت......۶۹

آج رات میری گفتگو درحقیقت اس موضوع کی ایک کلی تصویر اور ایک مکمل خاکہ ہے اور ابھی جس دوست کی بات چل رہی تھی اس کی نصیحت کی بنیاد پر یہ گفتگو ایک مؤدبانہ اور ''معلمانہ'' ڈھنگ کی ہوگی!

چونکہ یہاں سارے مطالب کو موضوع گفتگو نہیں بنایا جا سکتا...... اور حقیقت میں آپ لوگوں کے لئے ان جزئی باتوں کی تفصیل وتوضیح وتشریح کی ضرورت بھی نہیں ہے...... اس لئے ہم اس عمارت سے متعلق اصلی ڈھانچہ کی ایک مکمل تصویر کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، اس کے بعد آپ خود اپنی فکری اور عملی زندگی سے حاصل ہونے والے تجربہ اور مطالعہ اور نیز اس آگاہی اور مسئولیت کے اندازے کے مطابق جسے آپ اپنے اندر محسوس کریں گے اس کی دیدہ ریزیوں، اس کے جزئیات اور اس کے نقائص کی تکمیل فرمائیں تاکہ مکمل طور پر مطلب ادا ہو جائے۔

جو بات میں ابھی عرض کرنے جا رہا ہوں وہ اس توجہ کا حاصل ہے جو ابھی حال ہی میں مجھ پر غالب آئی ہے۔ ایک ایسی ہیجان انگیز توجہ کہ جس نے ایک مسئلہ کے حل میں مصروف میری احساس کی انگلی کو ایک انتہائی پیچیدہ ڈور پر رکھ دی۔

پچھلے تین سال سے، اسلام شناسی کی کتاب کے بعد، جب یونیورسٹی میں میرے اسباق ''بعد پیغمبر'' کے ادوار میں پہنچ رہے تھے اور سال کے دوسرے نصف حصے کو میں نے ''سقیفہ'' کے لئے مخصوص کر دیا تھا، میں طبعاً خلافت و بیعت اور امامت و وصایت کے فکری مسئلہ اور اس کے سیاسی، سماجی، اور اعتقادی تضادات سے روبرو ہو رہا تھا، میری یہ کوشش تھی کہ میں اس بنیادی مسئلہ کا کہ جو تاریخ اسلام اور پھر اس کے بعد اسلامی عقائد میں پہلا اختلاف شمار ہوتا ہے فرقہ وارانہ حُب وبُغض سے دور ایک

نئے زاویہ نگاہ سے جائزہ لوں اور تکرار مکررات سے پرہیز کروں اور اپنے آپ کو سانچے دار موروثی قضاوتوں سے دور رکھوں۔ چونکہ اس تاریخی واقعیت نے ایک شدید فرقہ وارانہ شکل اختیار کرلی ہے اور اس سخت مذہبی تعصبات میں، تاریخی ادوار کے دوران بہت سے سیاسی اور طبقاتی عناصر آگئے ہیں اور اس روسے انہوں نے علمِ تحقیق کے کام کو دشوار کردیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر، جس کسی نے چاہا ہے کہ اس بارے میں کچھ کرے، وہ خواہ ناخواہ یا سنی رہا ہے یا شیعہ، اور اپنی تحقیق کے اختتام پر اسی جگہ پہنچا ہے جہاں اس سے پہلے شیعہ یا سنی قدماء پہنچے ہیں۔ ان کے علمی کام میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ ان کے استدلال واستقراء کے درجے، معلومات کے فقر وغنا اور بیان کی سستی یا استحکام میں ہے، ایک مستقل تحقیقی راہ کی دریافت، ایک بدیع علمی نقطہ نظر، ایک تازہ ادراک اور کام کی نوعیت میں نہیں ہے اور چونکہ دونوں فرقوں کے زیادہ تر مورخوں اور متکلموں نے پہلے سے معین شدہ اعتقادات اور قبلی فیصلوں سے اس کا جائزہ لیا ہے اس لئے وہ کوئی نیا نتیجہ یا نئی بات پیش نہیں کرسکے ہیں، ان کی ساری باتیں گزشتہ میں کہی گئی باتوں کی تکرار ہے، چونکہ علمی تحقیق کے لئے اس سے بڑی کوئی آفت نہیں ہے کہ تاریخی، سماجی، اور علمی نظریات، فرقہ پرستانہ یا اعتقادی متعصبانہ قاطع عقیدوں کی صورت میں سامنے آئیں، اس لئے کہ اس صورت سے ایک طرف محققوں کی اکثریت غیرارادی طور پر ان ڈگماٹکس (Dogmatists) کی اسیر ہوجاتی ہے اور دوسری طرف اگر کسی نے کوئی نئی تحقیق کی ہو اور کسی نئی بات کا کھوج لگایا تو اس میں اس کو اظہار کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس طرح وہ اہل علم کی چوکھٹ، اور کلاس، مدرسے، حوزے اور

یونیورسٹی کی چہاردیواری، اور دانشوروں اور صاحب نظروں کے مجمع سے فوراً خارج ہو جاتا ہے اور ایسے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے کہ جس قدر ان کے لیے علمی فکری سمجھ اور کسی نئی بات کی برداشت مشکل ہوتی ہے اسی قدر ان کو اکسانا بہت آسان ہوتا ہے اور وہ بہت جلد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ وہ اہل عمل واقدام ہیں، اور چونکہ وہ اپنے مذہب کی نسبت رونما ہونے والی خطاؤں قصوروں، اور خیانتوں کے بارے میں خائن طاقتوں کے مقابل اعتراض سے عاجز ہیں اس لئے ان میں عقدہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنے دل کی بھڑاس کو ایک اہل قلم یا ایک بیکس وتنہا صاحب نظر آدمی پر خالی کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سامنے سینہ تان کر انہیں دھمکیوں سے نوازنا ان کے لئے کوئی مصیبت کھڑی نہیں کرتا بلکہ اس میں دینی اور دنیوی ثواب دونوں ساتھ ہیں۔ اور ان عوام فریب لوگوں کو جو کبھی اور کہیں دین کے لئے کچھ نہیں کر سکے ہیں یا علمی نقطہ نظر سے منظر عام پر نہیں آسکے ہیں، عمر بھر ان کا کام کھانا اور سونا اور دین کی خدمت کے لئے لوگوں سے معاوضہ لینا رہا ہے،...... بہترین موقع ہاتھ آتا ہے کہ وہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' ☆ کو کام میں لائیں، اس لئے کہ اس میں مالی اور جسمانی نقصان کا احتمال نہیں بلکہ فائدہ بھی ہے، اس کے علاوہ اس طرح وہ اپنی شخصیت کی محرومی اور ایک عمر کی کمزوریوں، خاموشیوں، اور اسلام مخالف، انسان مخالف، اور شیعہ مخالف تقیوں کا مداوا کرتے ہیں اور تنہا وہی ایک شخص ہے جس پر یہ لوگ حملہ کر سکتے ہیں

☆...... یہ جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک دوسرے سے جدا دو مستقل اصل کی صورت میں یاد کیا جاتا ہے اور نیز امر بالمعروف کو --- کہ جو ایک مثبت مبارزہ ہے --- نہی عن المنکر پر --- کہ جو منفی مبارزہ ہے --- مقدم گردانا جاتا ہے، دونوں قابل تأمل اور سبق آموز ہیں! آپ سمجھے میں نے کیا کہا؟...... ''سبق آموز'' ہیں!

اس کے خلاف لوگوں کو اکٹھا کر سکتے ہیں، جہاد کا حکم صادر کر سکتے ہیں، طاقت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں، بدعت کہہ کر اس پر ٹوٹ سکتے ہیں، مجمع اکٹھا کر سکتے ہیں'' محاذ قائم کر سکتے ہیں اور اس کے خلاف تیز و تند نعرے لگا سکتے ہیں......'' ☆

بقول ایک عرب شاعر، اپنے بدذات اور نالائق بیٹے سے خطاب:

''اسد علی، وفی الحروب لغامه!''

(گھر میں مجھ پر شیر ہے، اور جنگوں میں، شتر مرغ)

یہی وجہ ہے کہ، اگر کوئی اس موروثی تکرار مکروات اور سانچے میں ڈھلے نظریات میں ایک اصیل اور مستقل کام کرنا اور ایک نئی راہ چلنا چاہتا ہے، بلکہ اپنی اس کوشش میں اگر وہ ایسی نتائج پر پہنچتا ہے جو کسی مذہب کی اصالت کو اثبات کرتے ہیں تو تب بھی تائید کے بجائے یہ لوگ کہ جو اپنے آپ کو اس مذہب سے وابستہ کرتے ہیں، ایک مخالف اور منحرف کے عنوان سے جنجال کھڑا کرتے ہیں، چونکہ عوام کی نفسیات کے مشخصات میں یہ بات ہے کہ اولاً، وہ کسی نئی بات کو حتیٰ اگر صرف اس کی زبان، اس کی تعبیر اور اس کا استدلال نیا ہو اور عقیدہ وہی عمومی عقیدہ ہو، برداشت نہیں کر سکتے اور ثانیاً، ہر فرقہ کے لوگ (البتہ ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے پاس علم و شعور و انصاف باہم ہے) جونہی کوئی ایسی بات سنتے ہیں جو ان کے مذاق پر پورا نہیں اترتی، یا پھر وہ دیکھتے

☆......البتہ یہ ''جنجال'' ان لوگوں کے لئے نہیں جو میری ''زبان'' سے ''آشنا'' ہیں، ہمارا ایک دوست کہہ رہا تھا: ''......واقعتاً یہ عجیب بات ہے! جن لوگوں نے کسی قدر تمہارے دروس، تمہاری تحریروں اور تمہاری کتابوں کو پڑھا ہے وہ سب تمہارے موافق ہیں اور جن لوگوں نے ان میں سے کسی کو نہیں پڑھا ہے وہ سب یکساں طور پر تمہارے مخالف ہیں!''!؟......شاید یہ بھی ایک طرح کی ترتیب ہے!

ہیں کہ یہ بات ہمیشہ کے مکررات سے مختلف ہے تو فوراً قاطعیت کے ساتھ اس کو اپنے مخالف فرقے سے منسوب کرتے ہیں۔☆

لیکن، مجھے اس اعتبار سے ان روشن خیال لوگوں کے لئے کہ جو کسی عقیدے کو صرف اس کی علمی غیر جانبداری، مضبوط منطق، علمی وزن اور انسانی اور سماجی ذمہ داری کی بنیاد پر تسلیم کرتے ہیں، خلافت و اصل اجماع اور امامت و اصل وصایت کے مسئلہ کو، دو سماجی نظاموں، دو سیاسی فلسفوں اور دو اعتقادی اور آئیڈیالوجیکی مکتبوں کے عنوان سے پیش کرنا چاہتا تھا، ناچار میں نے فرقہ وارانہ تعصب کے مقامات سے

☆......اور اس کے سامنے کی مثال یہی ''امت و امامت'' کا موضوع ہے کہ جب مکہ کے اسلامی کونسل (موتمر الرابطۃ العالم الاسلامی) نے مجھے تین بار اسلامی مبحث پر تقریر کے لئے بلایا اور تینوں مرتبہ میں نے اسی ''امت کی سماجیات'' کو موضوع سخن بنایا، اور باوجود اس کے کہ اس میں میں نے کسی شیعی اختصاصی بحث اور کسی شیعہ سنی اختلافی مسئلہ کو پیش نہیں کیا اور صرف امت کی سماجیات کے کما کیف اور قرآن، سنت، اور تاریخ اسلام کی بنیاد پر اس کے مشترکہ اصولوں پر اپنی بات ختم کی، پہلی بار اس الزام کے تحت کہ میں سوشلسٹ ہوں اور دو بار اس الزام کے تحت کہ میں ''غالی شیعہ'' (علیؑ پرست) ہوں، میری بات رد کردی گئی اور مجھے بات نہیں کرنے دی گئی، اس لئے کہ شروع گفتگو میں، میں نے کہا تھا: ''تاریخ کے نمایاں چہرے عبارت ہیں قیصر، حکیم اور پیغمبرؐ سے''، اور میں نے قیصر کو آڑے ہاتھوں لیا تھا! اور آخر میں، میں نے عینی مثال اور ابتدائی اسلام کے خالص پرورش یافتہ افراد میں، علیؑ اور ابوذرؓ کو پیش کیا تھا، اور وہ بھی بہ دلیل تشیع نہیں بلکہ بہ ایں دلیل کہ ان دونوں کی شخصیت میں بجز اسلامی تربیت کے اور کسی مذہب، کسی ماحول، اور کسی ثقافت کا دخل نہیں رہا ہے، جو کچھ بھی ان کے پاس ہے وہ سب انہوں نے اسلام سے لیا ہے۔ ابوذر، اس لئے کہ وہ صحرا سے آیا ہوا ایک بدوی ہے اور علیؑ اس لئے کہ انہوں نے آٹھ یا دس برس کے سن میں اپنے اسلام کو برملا کیا اور جناب رسالتمآبؐ کے گھر میں پرورش پائی! اور اسی متن کو میں نے بعد میں، ایک خاص شیعی مسائل کے اضافہ اور اصالتِ امامت اور شیعی وصایت کی ضرورت کے بیان کے ساتھ ''ارشاد'' میں پیش کیا اور جن دلائل کو آپ نے سنا اس کی بنیاد پر ان اتہامات پر متہم ہوا جنہیں آپ سن چکے ہیں!!

دوری اختیار کی اور روداروں اور محاذ آرائیوں کے منطقی ادارک اور علمی تجزیے اور گفتگو کے لئے ایک ''غیر جانبدار محقق'' کے کیمپ میں کھڑا ہو گیا اور ایک خشک علمی نگاہ اور ایک سماجیاتی مورخ کے مقصد سے جائزہ لینا شروع کیا اور خوش نصیبی سے میں چراغِ علم اور نئے راستوں سے ان ہی مقامات تک پہنچ سکا جن تک علوی تشیع کے حق پرست دانشور اور روشن خیال لوگ، چراغِ کتاب وسنت کے ساتھ مذہبی راہ سے پہنچے تھے اور اچانک میرے سامنے ایک افق نمودار ہوا اور سماجی، تاریخی، اور انسانی واقعیتوں، فضیلتوں اور حقائق کی دور تک پھیلی ہوئی ایک ایسی سرزمین مجھے نظر آئی جسے دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ پھر میری نظر احکام وعقائد کے عمق میں اور ان خاص شیعی شعائر ومراسم تک گئی جو آج کل ایک زوال یافتہ اور غیر قابل توجیہ انداز میں اس طرح نمودار ہو رہے ہیں کہ جس کی تائید شیعہ مذہبی روشن خیال لوگوں کی اکثریت کے لئے بھی مشکل ہے اور ان میں سے بعض باتوں نے تعبدی صورت اختیار کر لی ہے اور اندھی تقلید نے انہیں روکے رکھا ہے اور خوف ان کی نفی سے مانع ہے، بعض دیگر لوگوں کو بھی ان باتوں میں تردید وتشکیک ہے اور وہ ان کو غیر قابل استدلال مسائل کی صورت میں دیکھتے ہیں، اور یہ موخر الذکر لوگ وہ ہیں کہ جو رہبر کے تعین کے لئے اصل شورا، بیعت اور اخذ آرا عمومی (یعنی اجماع) کو اس دور کے روشن خیال لوگوں کے نقطہ نظر سے، اصل وصایت اور تعیین امامت کی نسبت زیادہ ترقی پسندانہ سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اس کو ڈیموکریسی اور اُس کو وراثت، تسلط، اور اوپری سطح سے رہبر کے چناؤ کا نام دیتے ہیں!

اور میں کہ جو نہ تو علیؑ سے اور نہ ہی علیؑ کی راہ سے آنکھیں مُند سکتا تھا اور نہ موروثی سیاسی اسلوب کو عوامی حکومت پر ترجیح دے سکتا تھا اچانک ایک ''الٰہی توفیق'' سے ''امت''

کو اس کی انسانی ترین اور علمی ترین عمرانیاتی شکل میں اور وصایت و امامت کو ایک ترقی پسندانہ ترین آئیڈیالوجیکی چہرہ میں کہ جس کے رخِ حیات پر آج کی دنیا کی انقلابی پیشوائیت اور ترقی پسند تحریک نے اپنی سمت معین کی ہے، پایا، اور جس قدر عوام فریب اور متعصب لوگوں نے اسے نہ سمجھنا چاہا یا نہ ماننا چاہا اسی قدر درست اندیش اور آزاد روشن خیال افراد نے نہ صرف اسے بڑی آسانی سے بلکہ بڑے ہیجان انگیز انداز میں قبول کیا اور اسے ایک ترقی پسندانہ ترین، انسانی ترین، اور علمی ترین مکتب اور رہبری کا انداز پایا۔ اور یہ وہی ہے کہ جس کے کلی اصول کو میں نے ایک ''پلان'' کی صورت میں چار کانفرنسوں کے دوران ''امت و امامت کی عمرانیات'' کے عنوان سے (شمسی سال ۱۳۵۱ کے پہلے مہینے کی ۱۱ تاریخ کو) حسینہ ارشاد میں پیش کیا جو بعد میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔

لیکن اس کتاب میں مجھ سے ایک بنیادی مسئلہ چھوٹ گیا اور وہ قرآن میں ''امامت'' کا ایک اور مفہوم ہے کہ اس وقت میری توجہ اس طرف نہیں گئی اور اب میں اسے یہاں پیش کر رہا ہوں۔

اس سلسلہ گفتگو میں جس پہلے شخص نے مجھے لفظ ''امت'' کے اصل مادہ کا آئیڈیا دیا تھا وہ ایک معروف اسلام شناس انگریز موٹگمری (M-Watt) تھا کہ جس نے میرے ذہن میں پہلی چنگاری چھوڑی اور وہ امت کے لغوی معنی پر توجہ سے عبارت تھی۔

لیکن اب جو بات میں پیش کرنے والا ہوں وہ امت اور اس کی ذمہ داریوں کی ایک شکل ہے اس کا لغوی مفہوم نہیں، یعنی مسلمان امت کی ایک خاص شکل اور معاشرے میں اور نیز عالم بشری میں اس کا خاص کردار!

جیسا کہ میں نے ان تقریروں میں کہا، ''امت'' اس معاشرے سے عبارت ہے کہ جس کے بطن میں، ''تعہد''، ''تحرک'' اور ''تکامل'' نہفتہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ان الفاظ کے برخلاف کہ جو مکتبوں، زبانوں، اور مختلف بشری ثقافتوں میں ''معاشرہ'' کے تسمیہ کے لئے موجود ہیں، صرف لفظ ''امت'' کے بطن میں ''ایک مُتَعہّد متحرک اور متکامل معاشرہ'' مستتر ہے۔

لفظ سوسائٹی **(Society)** ---معاشرہ--- کسی مقام پر، نفس تجمع افراد کا نام ہے کہ جو فطرتاً سماجی روابط کے حامل ہیں۔ یا لفظ نیشن (کہ جس کے معنے مشروطیت کے بعد سے ''ملت'' کہے گئے ہیں جو بالکل غلط ہے حالانکہ ملت، ہماری زبان --- فارسی اور عربی --- میں بہ معنائے مذہب ہے: ''ملة ابیکم ابراہیم.....'' **Nature** (تولد یا جنم دینے) سے نکلا ہے، اور اس کا اطلاق، افراد کے اس مجموعے سے ہوتا ہے جن کی وابستگی ایک مشترک نسل سے ہوتی ہے، لفظ ''ریس'' **(Race)** ---نسل--- افراد کے اس مجموعے کی خبر دیتی ہے کہ جو مشترک رنگ و پوست اور بدنی خصائص کے حامل ہوتے ہیں۔ لفظ ''شعب'' عربی زبان میں--- کہ جو آج کل ملت یا نیشن کے بجائے استعمال ہوتا ہے--- بشریت کی ایک شاخ یا اس کا ایک شعبہ ہے۔ لفظ ''قوم'' کا اطلاق افراد کے اس مجموعہ پر ہوتا ہے کہ جو ایک خاص ہدف یا ایک مشترک کام کی خاطر ''قیام'' کرتے ہیں۔ ''قبیلہ'' کا لفظ افراد کے اس مجموعہ کے لئے آتا ہے کہ جو صحرا میں ''قبلہ'' کے رخ پر یا ایک مشترک مقصد کے لئے حرکت کرتے ہیں: صحرا میں آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی گروہ کسی چراگاہ یا چارے پانی کے مرکز کی طرف جاتا ہے اور کوئی دوسرا گروہ دوسری چراگاہ یا چارے

پانی کی طرف چونکہ ہر کسی کا ایک مشترک ''قبلہ'' ہے اس لئے اسے قبیلہ کہا جاتا ہے۔
''طائفہ'' افراد کے اس گروہ کے لئے آتا ہے کہ جو صحرا میں ایک مشترک کنویں یا چراگاہ کے گرد اپنا دائرہ سفر طے کرتے ہیں......

لیکن اسلام نے، ان مغربی یا مشرقی الفاظ میں سے کہ جن میں سے ہر ایک نے اس خاص مفہوم کے تحت جو اس بشری گروہ کا ہے اس مشترک صورت کو اپنے تسمیہ کا معیار بنایا ہے یعنی شعب، قوم، طائفہ، قبیلہ، نیشن، سوسائٹی، طبقہ اور ملت...... میں سے ''امت'' کے لفظ کو اپنے خاص معاشرے کے اطلاق کے لئے منتخب کیا ہے۔ کوئی نیا لفظ ایجاد نہیں کیا ہے۔

''امت'' لفظ ''ام'' سے نکلا ہے۔ ''ام'' لغوی اعتبار سے راہ، عزیمت، چلنے کے عزم، سفر، ہجرت، آگے بڑھنے اور خاص طور پر ''سیدھی، آشکار اور استوار راہ'' کے مفہوم میں ہے۔ اس بنا پر ''امت'' --- جس طرح تفصیل سے ہم نے اسے ''امت اور امامت'' نامی کتاب میں پیش کیا ہے --- عبارت ہے اس انسانی افراد کے مجموعے سے جو (اپنے اختیار سے) ایک دوسرے کے گرد اکھٹے ہو گئے ہیں تا کہ ایک مشترک جہت یا ہدف کی سمت ایک سیدھے، واحد آشکار، اور استوار راہ کو مل جل کر طے کریں۔ (اور یہ سب باتیں عزیمت کے مفہوم میں پنہاں ہیں)۔

دوسرے لفظوں میں ''امت'' وہ ہمفکر، ہمراہ، ہمگام، ہم ہدف اور مسئول افراد پر مبنی معاشرہ ہے کہ جو ایک واحد، مستقیم، آشکار، استوار، اور مشترک مقصد کی سمت حرکت میں ہے۔

پھر یہ کہ مختلف بشری معاشروں کا ہدف کلی طور پر، اچھی خوشحال زندگی، بہبود، اور ''سعادت'' ہے، اس مفہوم میں کہ انہوں نے خاص طرح کے طبقاتی

اور سماجی نظاموں، انسٹیٹیوٹس اور خصوصی روابط و تشکیلات کے ڈھانچے میں صورت اختیار کی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ''صاحب ثروت''، ''پر آسائش''، ''پر سکون''، ''آسودہ''، ''خوش معاش''، ''طاقتور''، ''فطرت پہ مسلط''، لذائذ سے بہرہ مند'' اور بالآخر سعادتمند'' رہیں''۔ ('' رہنا'' یہاں ایک فعلِ ربط بے ربط نہیں، سب کچھ ہے، اصل ہے)۔

جب کہ ''امت'' کا ہدف، سعادت کے مقابل ''کمال'' ہے، اس لئے کہ ''سعادت'' خوش رہنے سے عبارت ہے، حالانکہ، کمال بہ معنائے ''نیک ہونا'' ہے! ☆

کسی ہوٹل میں رہنے والے افراد ایک دوسرے کے ساتھ اور نیز ہوٹل والے کے ساتھ خاص روابط کے حامل ہیں۔ ہوٹل والا اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے گیسٹ کے گوناگوں وسائل کو ''آسانی'' سے فراہم کرے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ، ''خوش'' ''رہے'' اور اس طرح زیادہ گیسٹس کی توجہات سے اسے ''نفع'' حاصل ہو۔ ان کا ہدف بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ''محظوظ'' ہوں۔

بنیادی طور پر ہوٹل، ''ہٹ'' سے نکلا ہے جس کے معنے مہمان کے ہیں۔ ان بناء پر یہ لیٹنے، آرام کرنے، اچھا وقت گزارنے اور ''اپنے چند روز ٹھہرنے والے ساکنوں کی ضرورت کو پوری کرنے کی جگہ ہے''۔

جبکہ کسی ''کاروان'' کا ہدف، ''خوشحالی''، ''لذت'' یا ''آرام'' کے عالم میں رہنا نہیں ہے بلکہ اس مشترک مقصد کی سمت ''چلنا'' ہے جس کا سب نے اقرار کیا ہے۔

☆..... زیادہ واضح الفاظ میں ''سعادت'' و ''کمال'' کا تفاوت عبارت ہے ایک طرف ''خوشی'' اور ''خوبی'' سے، اور دوسری طرف ''رہنے'' اور ''ہونے'' سے۔

اس بناء پر چونکہ ہوٹل کا وجودی فلسفہ، اس میں سکونت اختیار کرنے والے افراد کا ''خوش رہنا'' ہے اس لئے جو شئے اس ''خوش رہنے'' کے عمل میں مددگار ہوگی یا اسے ''سہل الوصول'' بنائے گی وہ قابل قدر سمجھی جائے گی اور جو چیز اس میں رکاوٹ ڈالے گی یا اس کو دشوار بنائے گی وہ ناقابل قبول ہوگی۔ جبکہ بہ ایں سبب کہ ''کاروان'' کا وجودی فلسفہ، سب کا یکجا طور پر ایک مشترک مقصد اور ایک واحد راہ کی سمت چلنا ہے اس رو سے ہر وہ شے کہ جو ''اس مشترک مقصد کی سمت ایک ساتھ چلنے'' میں معاون ہوگی، اور منحرف نہ ہونے، تیز رفتاری سے چلنے اور اطمینان کے ساتھ پہنچنے کی ضمانت دیگی وہ قابل قدر ہوگی خواہ وہ ''نامقبول''، ''دور از لذت''، حتیٰ سخت، تلخ اور رنج آور کیوں نہ ہو، بلکہ بعض قلبی مرض میں مبتلا افراد، تن و مند حضرات، ڈرپوک اشخاص اور ان لوگوں کے لئے جنہیں سفر اور تیز چلنے کی عادت نہیں یا انہوں نے اپنے پیچھے ملکی علائق، مال و اسباب، دکان، عشق، کینہ اور بہت زیادہ حساب و کتاب چھوڑا ہو، زیاں آور کیوں نہ ہو اور شاید خطرناک بھی ہو! موت کا خطر! بلا سے! اگر وہ کاروان کے درست تر اور تیز تر اور اہل کاروان کی وحدت و سلامتی میں کام دکھائے گی تو وہ اچھی ہے، اور اگر وہ ''جمود'' میں، ''نفاق میں''، ''غلط راہ چلنے'' میں، ''مسافروں کو سڑک کے کنارے یا آدھے راستے میں مصروف کرنے میں، ''ہم سفروں کو ایک دوسرے سے لڑوانے میں''، ''غلط جہتیں دکھانے میں'' لوگوں کو کارواں سالار کی اصالت کی نسبت بدظن کرنے میں''، ''کاروان میں رنجش پیدا کرنے اور حرکت میں تاخیر ڈالنے کی غرض سے ذاتی دشمنیوں اور پرانے اختلافات کو ہوا دینے میں''، ''فرعی مسائل کو اصل کرنے اور اصل کو فرع کرنے میں''، ''منزل تک پہنچنے اور راہ کو طے کرنے میں'' ہر حقیقت یا ہر

باطل کو اپنا شعار بنانے میں“......غرض یہ کہ ہر اس چیز میں جو اس باہمی حرکت (امت) کو نقصان پہنچاتی ہے اور اس پر اثر انداز ہوتی ہے نا قابل قبول ہے۔اب اس کا نام حق ہو کہ باطل؟ دین ہو کہ کفر؟ علم ہو کہ جہل؟ سود ہو کہ زیاں؟ راحت، لذت اور ثروت ہو کہ رنج والم وفقر، ہنر ہو، زیبائی ہو، تقویٰ ہو، عبادت ہو، معنویت ہو، مادیت ہو، ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں۔ جو چیز ہدف کو ”ابھی“ میں دیکھتی ہے اور مسافروں کو ”حال“ میں مصروف کرتی ہے اور انہیں راستے کی انتہا تک پہنچنے سے روکتی ہے وہ مذموم ہے، اور جو چیز کاروان کی سرشت، راستے کے سرانجام اور اس سفر کے اختتام کو مدنظر رکھتی ہے اور اس سے اپنا رابطہ قائم کرتی ہے وہ مقبول، مقدس، اور قابل قدر ہے!

یہ ہے ”دنیوی“ کا مفہوم (یعنی پست، نزدیک اور بے قدر و ذلیل)، اور ”اخروی“ میں ہر وہ چیز آتی ہے جو آخر وانتہا سے تعلق رکھتی ہے، جو وراء روزمرہ ہے، جو ”خود کو“ اور عاقبت عمل کے پایان راہ کو دیکھتی ہے، اور اس کا تعلق اس حرکت کے انجام سے ہے۔ وہ ان تمام چیزوں سے الگ ہے جو ہمارے اطراف سے گزر رہی ہیں اور کوسوں دور، آئندہ کی طرف متوجہ ہے، اور آدمی کو نزدیک بینی، پست اندیشی، دل رجھانے، اور ”رہنے“ (جمود) کی کیفیت سے، اور ان چیزوں سے جنہیں کل پر ٹالا جاتا ہے...... بلند نگاہی، بلند فکری، دور اور بلند برتری خواہی، اور بلند وجودی آرزو طلبی کی طرف بلاتی ہے......☆

☆......یہاں پر دنیا اور آخرت، اخلاقی مفہوم میں پیش ہوئی ہے اور اس مفہوم کو لئے ہوئے ہے کہ دنیا مطلق طور پر پست اور نازیبا ہے اس لئے کہ اس میں خود پرستی اور خود غرضانہ سماج دشمن فرد پرستی کا عنصر ہے جس چیز کا رخ اپنی طرف ہو وہ دنیا ہے اور جس کا رخ دوسروں کی طرف ←

دوسرے لفظوں میں ہوٹل کا ہر شخص اتنے بڑے اس نظام کو اس کے سارے افراد و اسباب کے ساتھ صرف ''اپنے لئے'' چاہتا ہے تا کہ اس میں ''سکونت'' اختیار کرے اور زیادہ سے ''زیادہ'' ''خوش رہے'' جبکہ کاروان کا ہر فرد اپنے آپ کو اس لئے چاہتا ہے کہ کاروان اپنے مقصد کی سمت ''بہتر سے بہتر'' انداز میں ''آگے بڑھے'' اور جتنی جلد ہو سکے مقصد تک پہنچے، خواہ اس پر ''اچھا نہ گزرے''۔ اس کے لئے یہ بات آسان ہے کہ کاروان کی سرنوشت کے لئے اپنے جی تک سے گزر جائے......!

یہ وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جب ''زندگی کا فلسفہ'' بدل جاتا ہے تو ''معاشرے کا فلسفہ'' بلکہ ''معاشرے کی شکل'' بھی بدل جاتی ہے۔

امت، آگے بڑھنے والا ایک معاشرہ ہے، مکان میں رہنے والا معاشرہ نہیں بلکہ راہ میں، ایک جہت کا حامل اور ایک ہدف کا عازم معاشرہ۔ یہ ہے ''امت'' کا مفہوم اور یہیں سے ''امامت کی ضرورت'' کا آغاز ہوتا ہے۔

اس لئے کہ ہوٹل کو ''رہبر'' کی نہیں بلکہ ایک ''ناظم'' یا ''منیجر'' کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس پورے سسٹم یا نظام کو ایک ''پائیدار'' محور پر ''گردش دے''۔۔۔ انتظام و انصرام کرے۔۔۔ تا کہ ہر کسی کی ضرورت کو پورا کرے، جبکہ ''امت'' میں، کہ جس کے وجود کا جدا نہ ہونے والا ذاتی فلسفہ، ''ایک مشترک ہدف کی سمت سیدھے

ے اور اسلامی تعبیر میں، خدا کی طرف ہو وہ آخرت ہے
لیکن اس فلسفی اور عامی مفہوم میں دنیا مادی زندگی یا موت سے پہلے کا عالم ہے، اور آخرت موت کے بعد کی زندگی ...... مگر اس کے برخلاف دنیا مقدمۃً آخرت اور مزرعۃ آخرت ہے اور اس دنیا کی آبادکاری، کمال اور پیشرفت زندگی کے ساتھ دوسری دنیا کی زندگی اس کی غائی، مطلق اور فطری نتیجہ کے عنوان سے ہاتھ آتی ہے، مگر افسوس کہ یہ دونوں مفہوم ہمارے مذہبی دین میں تہ و بالا ہو گئے ہیں۔

راستے'' پر باہمی دائمی حرکت ہے، رہنما اور رہبر۔۔۔یعنی امام۔۔۔کی ایک قطعی ضرورت ہے تا کہ کاروان آگے بڑھنے سے متعلق اپنے اصلی کام کو صحیح اور مطمئن صورت میں انجام دے اور انسان کہ جس کا اصلی کام اور اس کا وجودی فلسفہ ''رہنا'' نہیں ''ہونا'' ہے ایک نمونے اور طرزِ عمل کا حامل ہو اس لیے کہ ''ہونا'' حرکت سے قریب ہے، حرکت ذات میں، ماہیت میں، کس سمت میں؟ یعنی کیا ہونا، کیسا ہونا؟ اس کے لیے نمونۂ عمل درکار ہے۔ اور اس کا نمونۂ عمل امام ہے!

جو چیزیں ''امت'' کو۔۔۔کہ جس کا وجودی سبب ''اچھا بننا'' اور ''اچھی راہ طے کرنا'' (یعنی تکامل و پیشرفت) ہے۔۔۔خوف زدہ کررہی ہیں ان میں سے ایک ''ہونے'' یا ''آگے بڑھنے'' کے بجائے جمود کی حالت میں اس ''رہنے'' یا ''ٹکنے'' کا خطرہ ہے جو کسی داخلی تضاد، بیرونی یلغار، جنگ زرگری (دکھاوے کی جنگ)، پراکندگی، انحراف، گمراہی یا اور کسی رکاوٹ کے زیر اثر امت کے سرِ راہ ابھرتی ہے اور امت کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے جس سے امت، امت نہیں رہتی۔ اور دوسرا ''خوبی'' کے بجائے ''خوشی'' کا خطرہ ہے جو امت کو اپنی گرفت میں لیتی ہے کہ یہاں پھر امت، امامت نہیں رہتی! اس لیے کہ پہلا خطرہ ''ہونے'' کو (یعنی پیشرفت کو) امت سے چھین لیتا ہے گرچہ وہ ''اچھا ہو''، دوسرا خطرہ ''خوبی'' کو اس سے سلب کر لیتا ہے گرچہ وہ اس سے ''خوش ہو''، اور دونوں حالتوں میں امت، امت نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ ''امت'' کو ان دونوں خطرات سے بچنے کے لئے کہ جن میں سے ہر ایک اس کی نابودی کے لئے کافی ہے ایک طاقتور حیاتی اور حتمی عامل کی ضرورت ہے کہ جو ان دونوں خطرات کے لئے سدِ راہ بن جائے اور ''امت'' میں ''چلنے'' کے

بجائے ''رکے رہنے'' اور ''کمال'' کے بجائے ''رفاہ'' کی بیماری کو ابھرنے نہ دے اور اس طرح امت اضمحلال کی طرف جانے سے بچ جائے اور یہ عامل وہ ''امامت'' یا وہ رہبری و رہنمائی ہے کہ جو امت کی حیات و حرکت کا عامل ہے، اس لئے کہ اس کا وجود اور اس کی بقا، امت کے وجود اور اس کی بقا کو ممکن بناتی ہے اور سماج کی اعتقادی حرکت اور اس کی سمت کو معین کرتی ہے۔ امام وہ شخصیت ہے کہ جو اپنے وجود میں ''ہونے'' کے نمونے کو اور اپنے عمل میں امت کی رہبری کو مفہوم دیتی ہے۔

امام نامی شخصیت ''پرستش'' کے لئے نہیں اس لئے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور عالم کی عظیم ترین شخصیت اور امام کا ممتاز ترین نمونہ کہ جو پیغمبر اسلام کی ذات گرامی ہے، خود خدا کی بندگی کا بہترین نمونہ ہے اور بنیادی طور پر وہ اس لئے آیا ہے تا کہ انسان کو اس کے غیر کی پرستش...... (شرک)...... سے باز رکھے۔ ایک ایسی شخصیت کہ جس کا نام ''امام'' ہے وہ صرف اور صرف ''امام'' ہے اور بس...... یعنی پیشوا، نہ کہ اس کے فاشی اور استبدادی مفہوم میں کہ جو کشتی گری، جاہلی رہبر پرستی اور خلاف توحید ہے، بلکہ وہ اس کے امتی مفہوم میں ''پیشوا'' ہے تا کہ وہ ''امت'' کو ''رہنے'' اور ''ٹکنے'' میں مبتلا ہونے نہ دے، وہ ''پیشوا'' ہے تا کہ امت کو ''خوشحالی'' اور ''لذت پرستی'' کے آگے جھکنے نہ دے اور بالآخر وہ ''پیشوا'' ہے تا کہ اس کی ہدایت کے پرتو میں ''امت'' اپنی حرکت اور حرکت کی جہت کو کھونہ دے''۔

امام کی زیارت کے جملوں میں یہ جملے بھی ہیں:

''......ساسة العباد و ارکان البلاد'' اور اس پر یہ اضافہ ''ومعالم الطریق''! ان کی تعبیرات کو حقیقی شیعہ زبان میں دیکھئے!

''نوع بشر کے سیاست مدار، معاشروں کی بنیادیں، اور علائم راہ''!

''معالم الطریق'' وہی ''رہنمائی کی نشانیاں'' ہیں کہ جن کی مدد سے ''اہل حرکت''۔۔۔امت۔۔۔ایک تو ''چلنے'' سے نہیں رکتے اور دوسرے راہ سے نہیں بھٹکتے...... اس بنا پر امت کی ''صحیح سمت میں حرکت''۔۔۔جو ان کے وجود کا اصل سبب ہے۔۔۔امام اور رہبر کے وجود سے ممکن ہے۔ دوسرے لفظوں میں امت کے ''وجود'' کی حیات کے لئے اس ہستی سے مفر نہیں جسے ہم امام کہتے ہیں۔☆

ا۔ آئیڈیالوجی ۲۔ ہدف (یا ذمہ داری) ☆☆

لیکن وہ نیا مسئلہ جسے میں یہاں چھیڑنا چاہتا ہوں، ''امت'' بہ معنائے ''سماج'' نہیں بلکہ اس نئے مفہوم میں ہے جو قرآن میں بھی بہت واضح اور صریح صورت میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام اور خاص طور پر تشیع کی ذمہ داری صرف اس ''امت'' کو سنوارنا نہیں ہے کہ جس کا ہدف دوسرے معاشروں کے برخلاف صرف ''نیک ہونا'' یا ذاتی طور پر ''کمال'' حاصل کرنا ہو بلکہ اس کے علاوہ، اس کا ایک دوسرا ہدف بھی ہے۔ (یہی وہ نکتہ تھا جس کی دریافت سے اسلام اور خاص طور پر تشیع کی جماعتی ذمہ داری۔۔۔کہ جس نے ایک ایسی پارٹی کو وجود بخشا ہے جس کی تدابیر بلکہ جس کی ظاہری تنظیمات اور فارمولے اس کے جنگی احساسات سے بھرپور طول تاریخ میں

☆...... امت، امامت، امام، اور وصایت کے وجودی فلسفہ کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے لئے آپ ''امت اور امامت'' نامی کتاب سے رجوع فرما سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس موضوع کو ''اسلام شناسی'' نامی کتاب کے اس باب میں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں جو ''رسول خدا آئندہ کی فکر میں'' (فلسفہ غدیر) کے موضوع پر مشتمل ہے۔

☆☆...... ان دونوں جداگانہ مباحث کو یہاں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ان کی سخت آمیختگی کے سبب ایک عنوان کے تحت قرار دیا ہے۔

ثبت ہیں۔۔۔میری سمجھ میں آئی)۔

"تلک امة" قد خلت لھا ما کسبت و لکم ما کسبتم و لا تسئلون عما کانوا یعملون" ☆

"یہ ہے وہ پچھلی امت: جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے سامنے آیا اور جو کچھ تم کماؤ گے تمہارے سامنے آئے گا اور تم لوگ ان کے "اعمال" کے ذمہ دار نہیں ہو گے"

دوسرے لفظوں میں ہر امت کی سرنوشت وہی ہے جسے وہ خود اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔گزشتہ میں رہنے والے لوگ اسی سرنوشت کے حامل ہیں جسے انہوں نے خود بنایا تھا اور تم، امت۔۔۔اسلام۔۔۔کی سرنوشت بھی وہی ہوگی جسے تم اپنے ہاتھ سے بناؤ گے۔

خصوصیت کے ساتھ "لاتسئلون عما کانوا یعملون" کا ٹکڑا پیش نظر رہے! اس لئے کہ یہاں تاکید مقصود ہے (یا کم از کم اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ) تم امت جو اس اسارت و بدبختی میں مبتلا ہو اس بہانے سے کہ تمہیں یہاں تک پچھلی قوموں یا پچھلی نسلوں نے پہنچایا ہے اس بدبختی اور اسارت کی توجیہ اور اس پر خاموشی اختیار نہیں کر سکتے۔تم اپنے نادرستیوں، کج رفتاریوں، بدبختیوں اور اسارتوں کو صرف اس بہانہ سے کہ یہ دوسروں کی سستیوں اور دغابازیوں کا نتیجہ ہے فطری عمل نہیں کہہ سکتے اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔تم جس بدبختی اور بدحالی کے پنجہ میں جکڑے ہوئے ہو وہ صرف اور صرف تمہاری اپنی پیدا کردہ ہے گو کہ یہ دوسروں کے ہاتھ سے عمل میں آئی ہو!

☆......بقرہ......۱۳۴

اگر تم نے ان بدبختیوں پر جنہیں دوسروں نے تم پر مسلط کی ہے خاموشی اختیار کی تو گویا تم نے خود اپنے ہاتھ سے ان بدبختیوں کو اپنے لئے فراہم کیا ہے اور یہ تم خود ہو کہ جو اس ''تحمل'' اور ''چپ سادھ رہنے'' کی خاطر یہ دن دیکھ رہے ہو اور اس کی سزا بھگت رہے ہو۔☆

پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ میں قرآن کی تمثیل پر کہ جو خود رہبر، اور امام ہے ایک امت بنائی۔ اس امت کی حرکت کی خدائی جہت بیت المقدس تھی۔ اس مفہوم میں کہ بیت المقدس اس امت کی قطعی یکجائی کا مظہر تھا۔ چودہ سال گزرنے کے بعد اس امت کا قبلہ مدینہ کے شمال میں واقع بیت المقدس سے مدینہ کے جنوب میں واقع مکہ میں تبدیل ہوا۔ یعنی امت کا قبلہ ۱۸۰ درجہ گھوم گیا! قرآن پیشگوئی کرتا ہے کہ اس تبدیلی سے بہت سے اعتراضات کا آغاز ہوگا۔

"سیقول السفهاء من الناس، ماولیهم عن قبلتهم التی کا نوا علیها ......"؟☆☆

''بے شعور لوگ یہ کہیں گے کہ آخر کس چیز نے انہیں اس قبلہ سے ہٹایا جس پر وہ تھے''؟

اور ہم نے دیکھا کہ یہی کچھ ہوا۔ خاص طور پر یہودیوں نے اعتراض کیا۔ اس

☆...... یہاں میں آپ سے درخواست کرونگا کہ اگر آپ اس نکتہ کو زیادہ دقیق اور زیادہ عمیق صورت میں سمجھنا چاہیں تو آپ: امت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، قسط، حکمت، عدل، اور ان سے مربوط دوسرے لفظوں کو قرآن کے کشف آیات سے نکال کر مطالعہ کریں اور ان پر۔۔۔ خواہ آپ کے چند گھنٹے کیوں نہ صرف ہوں۔۔۔ صبر و تحمل کے ساتھ غور وفکر کریں۔

☆☆...... بقرہ...... ۱۴۲

لئے کہ بیت المقدس ان کا اور مسلمانوں کا مشترک قبلہ تھا اور اس اعتبار سے کعبہ کی سمت اس امت کی واپسی ان کے لئے بڑے صدمے کا باعث تھی۔ اس لئے کہ اس تبدیلی میں یہ نکتہ شامل تھا کہ ''۔۔۔شاید۔۔۔اب اس قبلہ کی اصالت ختم ہوگئی ہے اور اس نے اپنی خدائی وابستگی کھودی ہے وگرنہ کیا بات تھی کہ وہ اس طرح بدل جائے؟......''

ناسمجھ لوگوں نے کہا کہ: ''آخر یہ کس طرح کا خدائی تعلق ہے کہ جو اتنی ''آسانی'' سے بدل جاتا ہے؟ آخر؟......؟

لیکن قرآن اپنی پیش بینی کے سامنے خود جواب بھی دیتا ہے کہ جو ''اہل قالب و ظاہر'' کے لئے سخت دنداں شکن ہے اس لئے کہ وہ سمجھانا چاہتا ہے کہ ''مواد'' کی حفاظت کے لئے قالب (سانچے) کو توڑا اور تلپٹ کیا جاسکتا ہے!

قبلہ کی تبدیلی کے فلسفے سے متعلق اگرچہ کہ بہت سے دلائل لائے گئے ہیں (کہ جن میں سے بہت سے واقعی دلچسپ اور عمیق ہیں) تاہم ان میں سے ایک حساس اور بنیادی دلیل پر توجہ نہیں گئی ہے۔ یہ وہ حیاتی نکتہ ہے کہ بعض اوقات ''مواد'' کی اصالت کے تحفظ کے لئے فورم اور قالب کا ضائع کرنا ناقابل اجتناب ہوتا ہے اس لئے کہ جو چیز مطمح نظر اور بیش قیمت ہے وہ ''مواد'' ہے، قالب یا وہ ظاہری صورت نہیں کہ جو قراردادی نشانیاں ہیں۔

اس لئے کہ بنیادی طور پر ''قالب'' ''مواد'' کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے، اور اگر وہ خود ''مواد'' کی ویرانی کا سبب بن جائے تو یقیناً اسے ضائع کردینا چاہئے۔☆

☆......مگر......بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ''مواد'' کو اپنے ''مفادات'' کے خلاف تشخیص دے کر اسے ضائع کیا ہے اس رو سے کہ وہ ''قالبوں'' کے حامی اور ان کے نگہبان بن گئے ہیں۔۔۔تاکہ لوگوں کو مواد سے غافل کرکے انہیں قالب پرست بنائیں۔۔۔عوام الناس کے درمیان قدر و ''قداست'' و اعتبار کے حامل بھی ہو جاتے ہیں!!......

یہاں قرآن عملاً قالب کو توڑتا ہے اور حتمی، قطعی، اور خدائی وابستگی کے مظہر۔۔۔قبلہ۔۔۔کو بدلتا ہے تا کہ اس روح اور ''مواد'' کو بچائے جو بھیٹ چڑھ رہا ہے اور اس ''قالب شکن'' کی نسبت نا سمجھ لوگوں کے اعتراض کے جواب میں کہہ رہا ہے:

خانہ خدا۔۔۔کعبہ۔۔۔کے عزیز ترین، مقدس ترین، آسمانی ترین اور پاک ترین پتھروں کو جنہیں پے در پے سیلابوں نے ویران کر دیا تھا...... عبداللہ بن زبیر، عبدالملک، اور حجاج بن یوسف جیسے غلیظ ترین، خونخوار ترین، پست ترین، اور انسان دشمن ترین افراد کے ہاتھوں نصب کرایا گیا ہے!...... تا کہ کعبہ کے پتھروں کو اصالت حاصل نہ ہو۔ جبکہ سب یہ آرزو کرتے ہیں کہ ''......اے کاش جناب ابراہیمؑ کے زمانے کے پتھر باقی رہتے...... اے کاش وہی پتھر رہتے جنہیں جناب رسالتمآبؐ کے ہاتھوں نے مس کیا ہے۔''

یہ وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حتیٰ روشن خیال (؟) اور منطقی حضرات کے درمیان بھی ''پتھر'' کی سمت کشش پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی اب آہستہ آہستہ ''پتھر'' مقدس ہو کر کعبہ کی جگہ لے لیگا! یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جنہوں نے ان پتھروں کی حیثیت سے آگاہی حاصل کی ہے لیکن ان پتھروں کے سوا اس گھر سے اور کوئی بات نہیں سمجھی ہے حتیٰ ۹۰ عظیم الشان پیغمبروں کو ان کے نیچے دفن کیا ہے تا کہ اپنی سوچ میں ''کعبہ کی حیثیت'' کو ''قابل قبول'' بنائیں!......

قالب پرستی صرف مادی شکل میں نہیں، بعض اوقات لفظی یا حتیٰ ذہنی اشکال میں بھی ہے۔ میں نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا کہ ''...... کعبہ ہماری نمازوں، ہمارے آئیڈیلز، اور ہماری حد درجہ محبتوں کا قبلہ ہے، ہم اسی کے رخ پر زندگی بسر کرتے اور اسی کی رخ پر موت کو لبیک کہتے ہیں......''

میرے خلاف چھپنے والی ''تنقید و تجزیہ'' نامی کتاب میں کہ جو اتفاقاً اس طرح کی دوسری چھپنے والی کتابوں سے زیادہ منطقی ہے اور اس کے لکھنے والے آقای روشنی کسی مسجد کے پیش نماز ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک طالب علم متعارف کرایا ہے! (معلوم ہوتا ہے کہ ''طالب علم'' نے اتنی منزلت حاصل کی ہے کہ ایک علمی اور روحانی شخصیت اپنے آپ کو طالب علم کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے......) بہر حال میرا مشورہ ہے کہ اگر آپکو یہ کتاب مل جائے تو آپ ضرور اس کا مطالعہ فرمائیں۔ (شاید آپ کے علم میں ہے کہ ان حالیہ چند مہینوں میں میرے خلاف دوسری کتابیں بھی یکجا طور پر چھپی ہیں، اچھا ہے کہ آپ ان کا بھی مطالعہ فرمائیں، ان ہی کتابوں میں ''اسلام شناسی، عقل و دین کی میزان پر'' نامی ایک کتاب ہے جسے ''الف۔ زنجانی'' نے تحریر کیا ہے کہ اس کا ہونا بھی آپ کے پاس ضروری ہے تا کہ آپ دیکھ سکیں کہ یہ بشری موجود بلندی میں نیز کہاں تک فطانت، اور پیشرفت کی استعداد رکھتا ہے! اسی طرح آقای ''الف۔ قمی'' کی لکھی ہوئی کتاب: ''اسلام اور روحانیت کا دفاع'' ہے۔ اس کتاب کو پڑھیے مگر خرید کر ہرگز نہیں!!) خیر جانے دیجیے۔

"قل لله المشرق و المغرب، یھدی من یشاء الیٰ صرابط مستقیم"!☆

''۔۔۔ان بے خرد لوگوں سے۔۔۔کہو: مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے (اور وہی ہے کہ جو) جسے چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔'' اس لئے کہ خدا نہ شمال میں ہے نہ جنوب میں، نہ بیت المقدس میں ہے نہ کعبہ میں بلکہ عالم میں ہر جگہ ہے۔۔۔معاشرہ میں، ہر اس جگہ جہاں ''لوگ'' ہیں۔۔۔اور یہ سب ''معنوی وابستگی'' کے لئے معیار ہیں''۔۔۔!

وگرنہ:

"لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب"

''نیک کام یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف پھیر لو۔ (بنیادی قبلہ شمال، جنوب، اور مشرق و مغرب میں نہیں ہے)۔

"و لکن البر من آمن باللہ، والیوم الآخرۃ والملائکۃ والکتاب و النبیین و ......"

''بلکہ ''نیکوکار'' آدمی'' وہ ہے'' جس کا ایمان......خدا، روز آخرت، فرشتوں، آسمانی کتاب اور پیغمبروں پر ہو۔''

ﷺ ''تنقید و تجزیہ'' نامی کتاب کے لکھنے والے میری اس تحریر پر تنقید کرتے ہیں کہ گویا میں نے کعبہ کو صحیح اور کامل طور پر نہیں پہچنوایا ہے! اس لئے کہ مثلاً میں نے نہیں کہا ہے کہ کعبہ کی خصوصیات اور ''ترجیحات'' میں ایک بات یہ ہے کہ مسلم معاشرہ ''رفع حاجت'' کے موقع پر اس کی طرف منہ کر کے یا پشت کر کے نہیں بیٹھتے!!......یعنی مجھے وہاں اس طرح لکھنا چاہئے تھا کہ:
''کعبہ......ہماری نمازوں، ہماری ضرورتوں، ہمارے آئیڈیلز، اور ہماری انتہا درجہ کی محبتوں کا قبلہ ہے۔ ہم اسی کے رخ پر زندگی بسر کرتے، اسی کی رخ پر موت کو لبیک کہتے اور رفع حاجت کے وقت اس کے رخ پر نہیں بیٹھتے! اور......! اُف میرے خدا! ذرا ذائقہ ملاحظہ فرمائیے!

☆......بقرہ......۱۴۲

''وکذالک جعلنا کم امة وسطاً''

''اور اس طرح ہم نے تمہیں امت وسط ۔۔۔ نمونہ ۔۔۔ قرار دیا'' نہ اِس طرف والا نہ اُس طرف والا۔''

اب یہاں سے ذرا دھیان دیجئے کہ اس منزل پر، اس امت کی، کہ جو ہم ہیں اہم ترین ذمہ داری سامنے آرہی ہے اور ''پارٹی'' بن رہی ہے:

''لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا''

''تاکہ تم دنیا کے مقابل نمونہ (عمل) بنو اور رسول تمہارے مقابل نمونہ (عمل) بنیں!''

زیادہ واضح الفاظ میں ''اسلام کی برتر امت'' کا ہدف اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بالکل اسی طرح پوری دنیا کے لئے سرمشق اور نمونہ عمل بنے جس طرح رسول خدا اس کے لئے نمونہ عمل بنے ہیں۔

البتہ شہید کے ایک دوسرے معنی بھی ہیں، لیکن یہاں اس کے معنی وہی ''شہداء'' والے ہیں جس کا ذکر آیت کے ابتدائی حصہ میں بصورت جمع آیا ہے۔ ''شہید'' وہ مثالی انسان ہے جو ہر زمانے اور ہر مکان میں، ہر انسان کے لئے نمونہ عمل ہوتا ہے اور شاہد کا مفہوم بھی یہی ہے۔ شاہد وہ ہے جس کی طرف آنکھیں اٹھتی ہیں۔ شہید ہمیشہ حی و حاضر رہنے والا شاہد ہے، حق و باطل کا پیمانہ ہے، ہر کسی کے لئے نمونہ عمل ہے، خود کو پرکھنے کا میزان ہے اور برترین انسان کا برترین نمونہ ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ''امت'' ایک آئیڈیل ''معاشرہ'' کے بجائے ایک کامل و اکمل ''پارٹی'' سے قریب تر ہے اس لئے کہ اس کی مسئولیت صرف

ذاتی بلندی اور ذاتی کمال نہیں بلکہ یہ ایک عالمی اور جاودانی مسئولیت کی حامل بھی ہے، ایک ایسی مسئولیت جو اس کے وجودی حصاروں کے پس پشت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ''امت'' کی ذمہ داری صرف یہ نہیں کہ وہ اپنی خاص آئیڈیالوجی اور امامت کی بنیاد پر منزل کمال کی سمت دوڑے اور اپنی نجات کے کاموں کی فکر میں رہے، خواہ وہ الٰہی رستگاری کیوں نہ ہو، اور دوسرے معاشروں کی ''رستگاری''، ان کی ''راہ'' اور ان کی سرنوشت پر اس کی توجہ نہ ہو بلکہ اپنی سرنوشت کی ذمہ داری کے علاوہ، اس اعتبار سے کہ وہ امت ''وسط'' ہے دوسروں کی سرنوشت کا بھی ذمہ دار ہے، اس لئے کہ ''شہید'' اور ''وسط'' کی دو صفتوں کے درمیان۔۔۔ کہ جو ایک دوسرے کے متناسب ہیں۔۔۔ ہونا اور عالمی ذمہ داری رکھنا ایک سازگار اور منطقی رابطہ کا حامل ہے۔ شہید بہ معنائے شاہد ہے، وہ کہ جس پر سب کی نظریں ٹھہرتی ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں خوبرو یا معشوق کے لئے ''شاہد'' کا جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ بھی اسی لئے ہے کہ شاہد ہر کسی کا مشہود ہوتا ہے اور محفلوں میں ہر کوئی اس کے گرد اس کا نظارہ کرتا ہے۔

فطری بات ہے کہ ایسی ہستی کی جگہ بیچ میں ہونی چاہئے، نہ کہ مشرق، مغرب، شمال یا جنوب میں۔ بے سمت، تا کہ ہر سمت میں اس کا وجود ہو۔ تا کہ اس کا فاصلہ سارے متضاد اور دائیں بائیں پراکندہ گروہوں، اِس بلاک اور اُس بلاک سے پیوستہ لوگوں، اس نظام یا مخالف نظام کے اسیروں اور مطلق دنیا پرست یا مطلق آخرت پرست لوگوں کے ساتھ......ایک ثابت شعاع، میں، ہر سمت سے یکساں انداز لئے ہوئے ہو! اور اس طرح کی یہ ''امت''، انسانی نقطہ نظر سے ایک مثالی نمونہ، ایک اعلیٰ

مجسمہ، اور انسانی معاشرے کے اجتماعی اور انسانی تکامل کا مظہر و سمبل ہے، اس نے مکانی اعتبار اپنے آپ کو کسی خاص سانچے کا اسیر نہیں بنایا ہے، منفی غیر جانبداری، بشری جھگڑے جھمیلوں سے کنارہ کشی اور بشریت کے کلی پیکر سے علیحدگی اختیار نہیں کی ہے۔ زمین پر رہائی کی تلاش میں سرگرداں دکھی اور ظلم وستم کے شکار جتھوں کی سرنوشت سے اپنی سرنوشت الگ نہیں کی ہے، عالمی خلوت کے حصار میں گھس کر نہیں بیٹھی ہے، اپنی کامیابی پر اکتفا نہیں کی ہے۔ عدالت اور لوگوں کی نجات کے لئے عالمی انقلاب سے دور، اپنی ''تہذیب اخلاق''، ''پیشرفت'' اور ان متعین اہداف تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف نہیں ہوئی ہے جنہیں داخلی منصوبہ بندی کے لائحہ عمل نے پیش کیا ہے، حق و باطل کے معرکہ سے دوری اختیار نہیں کی ہے بلکہ وہ کشمکشوں کے ''بیچ'' میدان میں، عالمی انقلاب کے ''وسط'' میں اور نجات کے متلاشی ستمدیدہ لوگوں کے ''قلب'' میں ایستادہ ہے اور لوگوں کی نجات اور ان کی رہبری اور آگاہی کی ذمہ داری کی پابند ہے!

اس سورہ میں دیکھئے۔ قرآن مجاہدوں اور جنگ آزما سواروں کی گفتگو کرتا ہے، بلکہ ان کی قسم کھاتا اور جہادی جنگی سواروں کی تصویر کشی کرتا ہے اور آخر میں ان کے کردار کو بھی عینی تجسم دیتا ہے:

والعادیات ضبحاً، فالموریات قدحاً، فالمغیرات صبحاً، فاثرن به نقعاً، فوسطن به جمعاً،

قسم ہے (غازیوں کے) پھنکار مارتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی جو پتھر پر ٹاپ مار کر چنگاریاں اڑاتے ہیں۔ پس یہ صبح کے یلغار کرنے والے اور صبح کے وہ یورش کرنے والے ہیں جنہوں نے بے تحاشا غبار اڑایا اور اسی میں (دشمن) کے

ایک گروہ کے درمیان پہنچ گئے۔

اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی دوسری طاقتوں کے قیاس پر اشتباہ ہونا چاہئے کہ اسلامی امت میں صرف ایک اداری نظام، ایک رسمی گروہ، یا ایک معین عمر کے لوگ، جہاد اور دفاع کے جیالے سپاہیوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس امت میں، ہر فرد، ہر عمر اور ہر سماجی گروہ میں ایک مجاہد ہے۔ یہ صاحب یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں، وہ صاحب مذہبی پیشوا ہیں، وہ ایک محترم ہستی ہیں، یہ حضرت ایک سیاسی شخصیت ہیں، فلاں شخص عابد زاہد اور اونچے درجے کا آدمی ہے..... اس میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ اس معاشرہ میں ہر وہ شخص جو سنِ بلوغ کو پہنچتا ہے، مکلف ہے۔ جہاد بھی اسی سن و سال میں اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز!

اس بنا پر اس ''امت'' میں ہر انسان جوں ہی سن تکلیف کو پہنچتا ہے، مسئول ہو جاتا ہے، نہ صرف اپنی نجات کا مسئول ہوتا ہے بلکہ اپنی امت کا مسئول بھی ہوتا ہے، میری گفتگو کہاں جا رہی ہے؟ وہ بشریت کی نجات کا مسئول ہو جاتا ہے!

اور یہی وجہ ہے کہ ایک ''مسلمان'' آغاز ''بلوغ'' ہی سے نہ صرف یہ کہ اپنی انفرادی زندگی میں، حتیٰ اپنی معنوی اور مذہبی زندگی اور اپنے خاندان میں محصور نہیں ہوتا بلکہ اپنی عظیم فکری قومیت اور اپنی اعتقادی سرزمین کے حصار میں بھی محدود نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کا مسئول اور پیوستہ عضو ہو جاتا ہے کہ جس کا کردار ''عملی نمونہ'' اور ''عالمی گواہی'' کا حامل ہوتا ہے اور جس طرح انہوں نے رسول خدا کو اپنی بیچ زندگی میں جگہ دی ہے اور اپنے بیچ معاشرے میں انہیں اپنے اقدار، اپنی تعمیر اور اپنے نصب العین کا نمونہ قرار دیا ہے اسی طرح وہ خود بھی زمانے کے بیچ میں،

وسط زمین میں، مشرق و مغرب کے لوگوں کے لئے رہبری کا کردار ہوتے ہیں اور دنیا میں آگاہی، حرکت، مبارزہ، نجات، اور عدالت کو قائم کرنے میں ''واسطہ'' ہوتے ہیں اور اپنے معاشروں کی سرحدوں سے باہر، صدموں، سانحوں، زیادتیوں، انسانی حرمتوں کو پامال کرنے والی طاقتوں اور عوام دشمنوں کے مقابل منفی غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار نہیں کرتے اور ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے دنیا بھر کے لوگوں کو استعمار اور غلامی کی طرف گھسیٹا ہے، صلح، پرامن بقائے باہمی، اور وزارت امور خارجہ والے رسمی احترامات کی بات نہیں کرتے، اور اس کیفیت میں کہ وہ خود عالمی توحید، نسلی توحید، اور طبقاتی توحید کے دعویدار ہیں اور ساتھ ہی ایمان و عدالت ورستگاری کے پاسدار اور نیز خلق خدا کے درمیان خدائی ذمہ داری کے حامل بھی ہیں...... اپنی سرحدوں سے باہر کفر و شرک و ظلم واسارت و بت پرستی کے پاسداروں کی سلامتی میں اپنے جام شراب کو نہیں اٹھاتے، اس لئے کہ ''امت'' کی سرحد ایک جغرافیائی حد بندی نہیں ہے، وہ محدود، ثابت، اور یک ''مکاں'' نہیں ہے، بلکہ اس راستے میں پانے والا ایک گروہ ہے کہ جو بشریت کے بیچ سے اور افراد زمین کے قلب سے گزرتی ہے، اس لئے کہ اسلام کی سرحد وہاں تک جاتی ہے جہاں تک انسان ہیں، جہاں تک لوگ ہیں، میں کیا عرض کر رہا ہوں؟ مسلمانوں کا وطن پوری دنیا ہے، پورا عرصہ وجود ہے اور اس امت کا مالک اور اس پر تنہا حاکم قوت، خدا ہے!

اور وہ رسول برحق جو ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے میں ترازو لئے ''مساوات کی نسبت قیام'' کے لئے آیا ہے اور اپنی امت کا ''شہید'' ہے اور جو زمان و مکان اور ایک خاص نسل کے لئے نہیں آیا ہے وہ ''لوگوں'' کے لئے، ''دنیا کے تمام

افراد“ کے لئے بھیجا گیا ہے۔

”...... کافۃ للناس“

عام طور پر برپا ہونے والے انقلابات میں ہم نے دیکھا ہے کہ حتیٰ وہ لوگ بھی جن کا نعرہ عالمی محنت کشوں کا اتحاد اور پورے کرہ خاک پر عدالت کا استقرار ہے اور جن کی آئیڈیالوجی انٹرنیشنلیزم ہے جونہی وہ اپنی سرحد اور اپنی قومیت کے دائرہ میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں بجائے اس کے کہ وہ استحصال کا شکار ہونے والوں اور حتیٰ اپنی سرحد سے باہر کے ہمرزموں کی فکر میں ہوں، اپنا سر، تیغ انقلاب سے کٹے ہوئے چاروں کے کھور میں دے کر پچھلی طاقت کے مردہ جنس کو کھانے میں مصروف ہوگئے ہیں، اور دردسری سے بچنے کے لئے برق رفتاری کے ساتھ روح انقلاب کو قدامت پسندی اور گٹھ جوڑ سے بدل دیا ہے اور عوام دشمن طاقتوں کے ساتھ حتیٰ اپنی عوام کے خلاف عشوہ گری اور سودے بازی کی ہے اور ”مثبت اور منفی نظریوں کے درمیان بقائے باہمی“ کا نعرہ بلند کیا ہے، حتیٰ کہ تاریخ وسماج وزمین وزماں سے ڈیالکٹیکی تضاد کو برطرف کردیا ہے کہ اب یہ ان کے کام میں نہیں آرہی ہے، اور وہ اس عالم کے لوگوں کی نابودی کی قیمت پر اپنی زندگی کے اسباب معیشت کی بہتری اور برتری میں مصروف ہوگئے ہیں اور اپنے اطراف انہوں نے آہنی دیوار کھڑی کردی ہے، اور اگر کبھی انہوں نے اسے اٹھایا بھی ہے تو اس لئے کہ وہ عوام دشمن عناصر سے مصافحہ کریں، انہوں نے اپنے انقلابی نعروں اور عالمی اہداف کو ”زیادہ سے زیادہ ثروت ولذت وامنیت والے“ بورژوائی اہداف اور اقتصادی منصوبہ بندیوں میں پلٹایا ہے اور آخر میں اپنے انقلابی امت سے (بورژوائی طبقہ والے مغربی معاشرے کے

مقابل) ایک بورژوائی معاشرہ بنایا ہے کہ جو پوری قوم کے اندام پر ایک طبقہ کی برتری ہے اور مختصر یہ کہ سو سال کی عالمی جدو جہد اور بشری نعروں کے بعد جونہی ان کا گدھا پل سے پار ہوا ہے انہوں نے پل کو اپنے پیچھے تباہ کر دیا ہے اور ''چلنے'' سے رہ گئے ہیں اور گھر بیٹھ کر اپنے دروازوں کو اور دیواروں کو بلند کر کے حصار اختیار کی ہے اور اپنے آپ میں مصروف ہو گئے ہیں، بھاڑ میں جائیں دنیا کے تمام لوگ اور وہ سب حضرات بھی جنہوں نے ہماری بات کا یقین کر لیا تھا اور ایک عمر ہمارے ساتھ ہمارے پیچھے چل پڑے تھے اور ہمیں اپنا ''شہید'' بنا لیا تھا اور ایک قبیلہ کی طرح ہم کو اپنے ''وسط'' میں رکھا ہوا تھا!

اسلام کی ماوراء علمی اور ڈیالٹیک سے بالا آواز کو اس مسلمان سپاہی نے سمجھا کہ جب ساسانی فوج کے کمانڈر نے یہ اعتراض کیا کہ تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟ اگر تم بھوکے ہو، اگر تمہیں کوئی چیز مطلوب ہے؟...... ہم تمہارے لئے مہیا کرتے ہیں، بہتر ہے کہ لوٹ جاؤ اور ہمیں چین سے رہنے دو (اسلام دشمن افراد کے لئے توجہ کا مقام جو ان پر جارحیت کا الزام دھرتے ہیں اور اسلام کے وہ دوست کہ جو اسے کلی طور پر صلح و امن کا دین سمجھتے ہیں)

اور اسلحہ سے لیس مسلمان۔۔۔ کہ جس نے اسلام کو اس کی اسلامی روح کے ساتھ سمجھا ہے نہ کہ زمانے پر مسلط روح اور اس تبلیغ کے ساتھ کہ جو آج ایک رواج بن گیا ہے۔۔۔ ایسا جواب دیتا ہے کہ جو دشمن کے الزام کا جواب اور جاہ طلبی، کشور کشائی، یا معاشی تجاوز کارانہ جنگ کی نفی بھی ہے اور ان دوستوں کا جواب بھی جو اسلام کی صلح جوئی اور امن پسندی کی، خلاف واقع نفی کرتے ہیں۔

ایک ایسا جواب کہ جسے اسلام کی تقدیر ساز عالمی ذمہ داری کے عظیم ترین نصب العین کے عنوان سے دنیا بھر کے مسلمانوں کا شعار ہونا چاہئے:

تم کیوں آئے ہو؟ تم نے شمشیر کے قبضوں پر اپنا ہاتھ کیوں رکھا ہوا ہے، کیوں ہم پر چڑھ آئے ہو؟

......ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمہیں ایک دوسرے کی بندگی سے نجات دلا کر خدا کی بندگی کی طرف لائیں، زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچائیں، اور جور ادیان سے نکال کر عدل اسلامی میں داخل کریں''!

اب آپ بتایئے کہ یہ ایک معاشی، سیاسی، اور ملک گیرانہ جنگ ہے یا نجات سے ہمکنار کرنے والی جنگ؟

کیا یہ دنیا کے عظیم ترین ترقی یافتہ معاشرے سے متعلق ایک متمدن تربیت یافتہ افسر کے سامنے اس مسلح جارح کی گفتگو ہے جو صحرا سے آیا ہے!؟

ہاں، ہے تو یہی، مگر اِس کے پاس ''آئیڈیالوجی'' ہے اور اُس کے پاس ''تمدن''، اِس کے پاس ''ایمان ومقصد'' ہے اور اُس کے پاس ''علم وثقافت''، اِس کے پاس ''عشق'' ہے اور اس کے پاس ''طاقت''۔

یہ اسلام ہے جو ایک بدوی کی زبان سے بول رہا ہے۔ ''زشیر شتر خوردن وسوسمار'' ☆ (اونٹ کا دودھ پینے اور گوہ کھانے) والے عرب کی بات اب یہاں تک پہنچی ہے کہ اس نے عالم کے کیانی تخت کو زیر کرلیا ہے!

☆......فردوسی کے شاہنامہ کے مشہور شعر کا مصرع:

''زشیر شتر خوردن وسوسمار عرب را بجائی رسیدہ است کار

اس نے یہ جملے اسلام سے سیکھے ہیں۔ ان باتوں کو اس نے کسی جگہ بیٹھ کر اپنے ذوق اور اپنی فطانت سے خلق نہیں کیا ہے۔ افسوس کہ اسلام کو ایک ''آئیڈیالوجی'' کی صورت سے ایک ''ثقافت'' کی صورت دی گئی ہے کہ اسے صرف عالِم سمجھ سکتا ہے اور دوسرے نہیں، لوگ عامی ہیں اور عامی (عام آدمی) ثقافت سے عاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کو اب نہ عالِم سمجھتا ہے اور نہ عامی!

جب اسلام ایک ''آئیڈیالوجی'' تھا، ایک ''عوامی آئیڈیالوجی''، اس وقت اس نے ایک صحرانشین وحشی عرب کو کہ جسے نہ بولنا آتا تھا اور نہ ہی فلسفہ، کلام، منطق اور علم و عرفان واصول و حکمتِ اُولیٰ سے اسے واقفیت تھی، اس طرح اسے آگاہی، بیداری، اسلامی شعور، بشری ذمہ داری، جہاں بینی، زماں شناسی، طاقتوں کی پرکھ اور اس طرح کی زبان دی!

زمین پر ''آزادی''، تکامل اور عدالت کے لئے اسلام کی اس جنگ میں جس معین، بھاری اور عالمی ذمہ داری کا اس مسلمان سپاہی نے اعلان کیا ہے اسے اس نے قرآن سے سیکھا ہے۔ اُن دنوں قرآن مسلمانوں کی دینی کتاب میں شمار ہوتا تھا، اس کو ابھی مطالعہ اور مذہبی تعلیم سے دور کر کے طاقچوں اور ''سونے کے موقع پر'' سر کے نیچے نہیں رکھا گیا تھا۔ ابھی ''شہر'' سے ''قبرستان'' نہیں لیجایا گیا تھا اور اس کی جگہ دعا کی کتاب کو جس کی صحت کا کچھ پتہ نہیں قبرستان سے شہر نہیں لایا گیا تھا، قرآن اموات سے مخصوص نہیں تھا اور ارواح پر نثار نہیں ہوا تھا، وہ اس قدر پیچیدہ، مرموز، اور معمّائی نہیں تھا کہ جس کا سمجھنا محال بلکہ اس میں تعقّل گناہ ہو اور اس کی سزا آگ اور تعقل

کرنے والے کی مقعد کا جلنا ہو" ! ☆

اس ذمہ داری کو قرآن نے بڑے واضح طور پر بیان کیا ہے۔

اس آیت میں بنیادی طور پر "امت" سے ایک خاص گروہ مراد لی جارہی ہے ایک ایسے نئے مفہوم میں جو انتہائی ہیجان انگیز ہے اور یہ اس موضوع کی اساس ہے جسے میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

"ولتكن منكم امته يدعون الى الخير، ويعمرون بالمعروف ، وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون" ☆☆

ان ساری باتوں کے برخلاف، رسول خداؐ حتیٰ اپنے سیاسی، فوجی، اور سماجی مبارزات میں انصاف دشمن طاقتوں (قاسطین) کو کچلنے، ایک "اسلامی امت" کی بنیاد رکھنے اور حکومت کی تشکیل کے لئے ہرگز اپنے جغرافیائی، نسلی اور قومی سرحدوں میں متوقف نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ایک ایسا حیرت انگیز کام کیا کہ جس کا سمجھنا ہماری سیاسی منطق کے لئے مشکل ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے چھٹے اور ساتویں برسوں میں

☆......اس انتہائی علمی اور عمیق حدیث: "من فسر القرآن برایه فلیتبوء معقده من النار" (جو کوئی اپنی ذاتی "رائے" سے قرآن کی تعبیر کرتا ہے اس کی نشیمن گاہ آگ میں ہوگی) میں "رائے" کے بجائے "عقل" مراد لی گئی ہے! کیا بغیر عقل کے سمجھنا اور تفسیر کرنا ممکن ہے؟ (جس طرح کہ ان میں سے بعض لوگوں نے کیا ہے!)

"رائے" عقیدہ اور نظریہ سے عبارت ہے اور یہاں اس کے معنی قبلی فیصلے کے ہیں، یعنی تفسیر میں قرآن کو قبلی اور اپنے ذاتی آراء کے ساتھ نہ ملاؤ، (وہی کام جو ان میں سے بعض لوگ کر رہے ہیں)! آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس مذہب پر، ان لوگوں پر، اور عوام الناس کے ایمان و شعور پر کیا آفت ڈھائی جارہی ہے۔

☆☆......آل عمران۔۱۰۴

اپنی عالمی دعوت کا آغاز کیا اور دنیا پر چھائی ہوئی بڑی بڑی طاقتوں کو خطوط لکھے، انہیں للکارا! اور تابعداری کے لئے کہا!

اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ان دنوں ان کی طاقت کا گھیرا مدینہ کے چھوٹے سے شہر میں دور کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ سے زیادہ نہیں تھا، بلکہ ابھی مکہ بھی ان کے اختیار میں نہیں تھا حتیٰ ہر عرب قبیلہ کی طرح ان میں یہ طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ حج کے موسم میں زیارت کے عنوان سے دوسرے تمام اعراب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں بلکہ جب وہ احرام کی حالت میں بغیر اسلحے کے قربانی کے اونٹوں کے ساتھ حج کی زیارت کا قصد کرتے ہیں تو انہیں شہر کے دروازے ہی سے ناکام لوٹا دیا جاتا ہے اور ظاہراً بہت کمزوری قرارداد ان پر مسلط کی جاتی ہے☆ اور اسی زمانے میں وہ مشرق و مغرب کے دو عظیم الشان طاقتوں، رومی امپائر اور ایرانی شہنشاہ کو خشک، مختصر، قاطع اور آمرانہ انداز میں بغیر تشریفاتی رعایت اور ذکر القاب کے حتیٰ ان کے رسمی مقام، "عظیم فارس"، "عظیم روم" اور "عظیم مصر" کو بھی خاطر میں لائے بغیر (یعنی وہی بڑی شخصیت

☆...... جب آپ اس بات کو مان لیتے ہیں کہ جو کوئی مکہ میں مشرف بہ اسلام ہوا اور اس نے مدینہ میں آکر پناہ لی تو پیغمبر خود اس کو پکڑ کر دشمن کے حوالے کریں گے، لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ میں اسلام سے پھر گیا اور بھاگ کر مکہ آیا تو قریش اس کو روک لیں گے اور پیغمبر کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اسے لوٹانے کا مطالبہ کریں۔ (اور یہی کمزور شق مسلمانوں کی کامیابی کا سبب بنا اور اس نے شورشی مسلمانوں کی آزاد طاقت کو ابوبصیر کی رہبری میں جنم دیا جس نے مسلمان ہو کر مکہ سے راہ فرار اختیار کی لیکن مدینہ جانے کے بجائے وہ قریش کے کاروانوں کی راہ میں گھات لگا کر بیٹھ گیا، اور چونکہ وہ کفر و اسلام، دونوں حکومتوں کی قید سے آزاد تھا اس لئے اس نے غارتگری شروع کی اور انہیں عاجز کر دیا!)

(اسلام شناسی: "باغی مسلمانوں" کا باب)

والا آدمی، ملکِ عظیم کے سربراہ وغیرہ) ان پر اپنے نام کو مقدم کرتے ہوئے خطاب کرتے ہیں: ''اسلم، تسلم''!

اسلام کو تسلیم کرو تا کہ سلامتی کے ساتھ رہ سکو!

اور یہی وجہ ہے کہ وہ عالمی طاقتیں جو اس عالمی انقلاب کے جارحانہ طرز عمل سے خوفزدہ ہیں۔ انہوں نے اس ''مسئولیت'' کو متہم کیا ہے اور ایک ہڑبونگ مچائی ہے کہ یہ تلوار کا دین ہے، یہ کشور کشائی والا دین ہے، اور اس میں اسلام کے بعض مبلغین اور مدافعین بھی مار کھا گئے ہیں اور بڑی کوششیں کیں ہیں کہ مثلاً اس کا دفاع کریں اور اسلام کو اس الزام سے نکالیں کہ: ''اسلام، سلم سے نکلا ہے اور سلم☆ کے معنی صلح اور پرامن بقائے باہمی ہے اور اگر رسول خداؐ اور مسلمانوں نے تلوار اٹھائی اور جنگ کی ہے تو وہ صرف اپنی دفاع کے مراحل میں ہے اور جہاد صرف اس وقت کے لئے ہے جب باہر سے مسلمانوں پر جارحیت کی جائے وگرنہ العیاذ باللہ اسلام نے کبھی دنیا کی عوام دشمن طاقتوں کے خلاف مزاحمت کی نہیں ٹھانی ہے''!

بہت شکریہ، آپ نے بڑی زحمت اٹھائی اور اسلام کی آبرو رکھی!

☆......عجیب استدلال ہے! اسلم، سلم سے ہے اور سلم کے معنی ہیں تسلیم، بالکل درست، لیکن کس کے آگے؟ اس کا رابطہ کس طاقت سے ہے، صرف خدا اور ہستی پر حاکم قوت سے نہ کہ خوانین، قبیلے کے سردار اور عوام دشمن ظالم و جابر طاقتوں سے کہ جو بہ تعبیر قرآن زمین پر فساد اور سرکشی کرتے ہیں اور برتری کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اسلام کے مدافعین نے اسلام کو بہت اچھا مفہوم دیا ہے لیکن خداوند عالم سے خداوندان زمین کو بالعوض لیا ہے!! اور موجودہ اسلام کو کہ جو بڑی طاقتوں کے مقابل اسلام تسلیم ہے اس اصلی اسلام کے بجائے دائرہ تفسیر میں لائے ہیں کہ جو صرف خدا کے آگے اسلام تسلیم ہے اور جس کا لازمہ ان تمام افراد کے آگے جھکنے سے سرکشی ہے جو اس کے غیر ہیں۔

یہ لوگ جارحیت کی جنگ اور آزادی کی جنگ کو ایک دوسرے سے تشخیص نہیں دیتے۔ شاید اسلام کو متہم کرنے والے دشمنوں میں سے بعض نے اسے تشخیص دی ہے اور وہ اپنی طاقت اور اپنے مفادات کو بچانے کے لئے اس آزادی طلبانہ، عدالت خواہانہ، اور انقلابی جنگ کو اس جاہ طلبانہ امپریلسٹیکی جنگ کی صورت میں پیش کرتے ہیں جو ان کا خاصہ ہے۔ لیکن ان لوگوں نے کہ جو اسلام کو بچانے اور اس کے دفاع کے عنوان سے اسے ساری طاقتوں کے ساتھ مفاہمت جوئی، آشتی، اور صلحِ کُل والا دین کہتے ہیں اس بات کو نہیں سمجھا ہے۔

''اور تم میں سے ''ایک امت'' ایسی بھی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ، ہاں یہی لوگ رستگار ہیں (آخرت میں نجات پانے والے ہیں)''

یہاں ''امت'' سے مراد ایک ''اسلامی معاشرہ'' نہیں ہے، حتیٰ وہ بھی نہیں ہے جس کی ابھی تشکیل نہیں ہوئی ہو، اور ہم آج کی طرح ''اسلامی معاشرے'' سے محروم ہوں، بلکہ ہمارے پاس ''اسلامی معاشروں'' اور ان سرزمینوں کا وجود ہو جس میں مسلمان بستے ہیں اور ہر حال میں، ہر نظام میں اور ہر معاشرے میں مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ۔۔۔ ایک مجموعی ذمہ داری کے عنوان سے کہ جسے اصطلاحاً وجوبِ کفائی کہتے ہیں۔۔۔ اپنے بیچ سے ایک گروہ تشکیل دیں، ''ایک خاص مسئول گروہ''۔

مگر کیا ہر مسلمان مسئول نہیں ہے؟ کیوں نہیں، مگر یہ گروہ ان مسلمانوں کا مجموعہ ہے جنہوں نے سماجی مسئولیت کو اپنی زندگی کے ساتھ ایک فریضہ کی طرح نہیں بلکہ اپنی زندگی کے فلسفہ کے عنوان سے منتخب کیا ہے! روشن خیالوں کا ایک ایسا گروہ کہ جس نے

اپنی ہستی اور اپنی حیات کو ایمان اور مسئولیت کے حوالے کیا ہے، جیسے عصر پیغمبر میں ''اصحاب صفہ'' کہ جو گھر بار کی طرف نہیں گئے اور انہوں نے مسجد کی صفہ نشینی اختیار کی۔۔۔خانہ خدا اور لوگ، ان کے عقیدے اور ان کی مسئولیت کے مرکز تھے۔۔۔تا کہ لوگوں کی خاطر اور راہ خدا میں جہاد کی خاطر، ان کی انفرادی زندگی، ان کی عمر کے ایک لحہ اور ان کی توانائی کے ایک ذرہ کو ان سے نہ لے اور اسے ضائع نہ کرے۔ ایک ناآرام، پیکارجو اور ایمان و مسئولیت کا فریفتہ گروہ کہ جس کے کاندھوں پر دنیا کی دگرگونی، نیکی کی دعوت، زیبائیوں کے ارشاد اور نازیبائیوں کی نفی و رد کا بوجھ ہے اور وہ ہمیشہ اس طرح کی مسئولیت اور اس طرح کی بھاری ذمہ داری کی انجام دہی کا ''عازم'' (قصد کرنے والا) ہے۔

یہ ہے وہ گروہ جو رستگار (نجات سے ہمکنار ہونے والا) ہے، نہ کہ وہ خودغرض، لاپرواہ، قدامت پسند، شکم پرست، عاقبت طلب لوگ کہ جنہوں نے اپنے گھروں کے دروازوں کو گھر کی دیوار کے باہر ہونے والے ہر ماجرے کے لئے بند کر رکھا ہے، اور اپنی چادر میں سمٹے، اپنے کھور میں سردیے شب و روز کسی پوشیدہ دروازے کے کھلنے کے انتظار میں ہیں کہ ''عوام'' اور ''خلقت'' سے دور کوئی ہاتھ باہر نکلے اور صرف ان کا ہاتھ پکڑے، اور لفظی اوراد، پانی سے بھرے حماموں کا غسل، گریہ وزاری، عبث اور بےضرر والے اظہار احساسات، شاعرانہ مناقب، فیوڈالی اور استبدادی دور کے خاص چاپلوسانہ توسل و تقرب، جیسے امور یا کبھی کبھار بہ حسب اتفاق دوستوں کو کھانے کی دعوت اور بےنوا لوگوں کو دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کی بخشش جیسے بےدردِ سر، کم خرچ اور بلازحمت والے فردی اور سطحی ''بھلائی کے کاموں کے'' ارتکاب،

اہلبیت اطہار سے اظہار ارادت، نماز کی اجرت، قرآن کی تلاوت کا معاوضہ، یا کسی مینار کی طلا پوشی کا کام یا دعا کی کتاب کے حواشی پر عمل ......اور دعا یا زیارت کے ان چند جملوں کا ورد جس کے مفہوم سے بھی وہ نابلد ہیں، ان کو ایک عمر کی پلیدی، بیدردی، زراندوزی، خودغرضی، اور مسلمانوں پر گزرنے والے حوادث کے مقابل ان کی عمر بھر کی خاموشی اور رضامندی کے بعد اس طرح انہیں ہر گناہ سے پاک کردے جس طرح کوئی بچہ پہلے دن شکم مادر سے متولد ہوتا ہے حتیٰ اگر اس کے گناہ ریگِ صحرا، آسمان کے ستاروں اور دریاؤں کی جھاگ جتنے کیوں نہ ہوں! اور اس برین واشنگ کے بعد۔۔۔نہیں۔۔۔میں کیا کہہ گیا؟! شہداء "بدر" میں سے ستر شہداء کا ثواب ان "چالاک ست عناصروں" کو عطا کرے!

اور میں کیا عرض کروں؟ حتیٰ وہ لوگ بھی کہ جو درحقیقت پارسا ہیں اور عمر بھر ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا اور ان کی کوشش رہی کہ وہ عادت، ریاضت اور ترک لذات سے اُخروی سعادت حاصل کریں وہ بھی "خودغرض" اور "خودخواہ" ہیں، اس لئے کہ ان کے ہاتھ بھی مظلوموں کے خون سے آلودہ ہیں اور وہ یہ بات نہیں سمجھتے، اس لئے کہ "ہرگاہ زمین کے کسی گوشے پر کوئی ناحق خون بہہ جاتا ہے، ان تمام لوگوں کے پنجے اس خون میں رنگین ہوتے ہیں جو اس کے مقابل خاموشی اختیار کرتے ہیں"۔

یہ امام حسینؑ کی زیارت کے جملے ہیں جسے حسینؑ کے چاہنے والے تکرار کرتے ہیں، اور اس میں تین گروہوں کو یکے بعد دیگرے لعن کرتے ہیں:

لعن الله امتة قتلتک، ولعن الله امتة ظلمتک، ولعن الله امتة سمعت به ذلک و رضیت به!

(خدا کی لعنت اس گروہ پر جس نے تمہیں قتل کیا، ......اس گروہ پر جس نے تم پر ستم کیا، اور اس گروہ پر جس نے اس المیہ کو سنا، اس پر خاموشی اختیار کی اور راضی ہوا) ☆

البتہ شاید ایسی ''انفرادی''، ''درمیانی'' اور ''گرہ کھلنے والی'' بہت آسان راہوں کا وجود ہو جس کے تحت بغیر کسی دکھ، بغیر کسی دردسر اور لوگوں کی نسبت دکھ جھیلے بغیر نجات حاصل ہو سکے اور بہت معمولی خرچ سے عمر کے آخری حصہ میں، پیدائش کے پہلے دن کی طرح معصوم بنا جا سکے، اور تھوڑے سے سرمائے اور تھوڑے سے الفاظ سے اللہ کے عدل کی ترازو کو ناکارہ بنایا جا سکے، یا پھر جونہی اپنے پیر، ......اپنی دکان یا اپنے بستر سے باہر نکال کر کوئی معجزاثر ورد زبان پر لائے، ایک نہیں، دس نہیں بلکہ ستر شہداء، وہ بھی ''بدر'' کے شہداء کا ثواب حاصل کر سکے، لیکن یہ راہیں ابھی اُس زمانے میں دریافت نہیں ہوئی تھیں اور حتیٰ ائمہ اطہار، اصحاب اور خود بدر کے مجاہدین کو اس کا علم نہیں تھا ورنہ صرف ایک شہید کا ثواب حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو موت کے منہ میں نہیں ڈالتے اور امام حسینؑ اپنے آپ کو اور اپنے بیٹوں اور عزیزوں کو قتل گاہ میں نہیں لے جاتے اور اپنے خاندان کو یزید کی اسارت کی طرف کھینچ نہیں لاتے اور قتل گاہ کے بجائے خلوت گاہ چلے جاتے اور خلوص قلب کے ساتھ دعا کی کتاب

☆......''امت'' اور ''معاشرے'' کے باب میں عرض ہے کہ ہم بہت سے اسلامی معاشروں اور بہتر مفہوم میں: مسلمانوں پر مبنی معاشرہ کے حامل ہیں، لیکن یہ امت نہیں ہے۔ امت ،ایک خاص اہداف، خاص اقدار و تعلیمات، خاص اسٹرکچر، خاص استوانے اور خاص رہبر و روابط کا حامل نظام ہے، جبکہ مسلمانوں کا معاشرہ آج وہ معاشرہ ہے جو کم و بیش ذہنی اور عبادی نقطہ نظر سے ان مسلمان افراد کا مجموعہ ہے جو تنزل کا شکار اور تباہ و برباد ہیں۔

کھولتے اور اس کے حاشیہ پر دیکھتے کہ کوئی ایسا ورد ہے جو دوزخ کی آگ کو قابو کرے اور اس کے ہر جملے میں کوئی ایسی چابی ہے جو جنت کے کسی دروازے کو پھونک میں ہر اس نااہل کے لئے کھولے جس پر ''وجد'' طاری ہو۔

اُن دنوں دین کا کام بھی دنیا کے کاموں کی طرح مشکل تھا، یہ آج ہے جو الٰہی توفیق اور اخروی سعادت مثل مادی سعادت ورفاہ اور توفیق زندگی کے، بجلی اور بیٹری کی صورت میں ''یکسر آٹومیٹک'' اور ہاتھ کی دخالت کے بغیر حاصل ہوتی ہے اور جس طرح تم ہیٹر کے آگے اپنے آرام دہ صوفے پر تکیہ کیے پلگ کو بجلی میں لگاتے ہو اور آن واحد میں بغیر اس کے کہ تمہاری سمجھ میں کچھ آئے کہ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ دنیا کے اس سرے سے تمہارا براہ راست رابطہ ہو جاتا ہے، تم بات چیت کرتے ہو، دیکھتے ہو، اور چاند کے کرہ کو بھی اپنی خواب گاہ میں لے آتے ہو، اسی طرح کرسی پر بیٹھے بیٹھے تم وجد کرتے ہو، ورد سے رشتہ جوڑتے ہو اور بے ساختہ یہ سمجھے بغیر کہ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ اسی کرسی پر بیٹھے بیٹھے، ایاب وذہاب کا خرچ اٹھائے بغیر ''جنت کے اعلیٰ غرفوں'' میں پہنچ جاتے ہو اور اپنے سود خور، بیدرد، بے شعور، آلودہ اور خستہ وخراب ہم پیشہ لوگوں کے درمیان سے اور اپنی ایک عمر کے پلید زندگی کے غلیظ کیچڑ سے کہ جو تمہاری ناسمجھیوں بددیانتیوں، کذب گوئیوں، جفاکاریوں، ناجائز منافع خوریوں، سانحوں کے آگے خاموشیوں اور ذمہ داریوں کے آگے تجاہل وداد خواہیوں کی قیمت پر تمہیں حاصل ہوئی ہے اچانک تم اپنے آپ کو، اہلبیت علیہم السلام کے درمیان دیکھتے ہو، خود کو علیؑ وفاطمہؑ وحسینؑ کے ہمراہ پاتے ہو! اور دنیا کے باوقار ترین شہداء کی صف سے بھی ستر قدم آگے اپنی ہستی کا مشاہدہ کرتے ہو!

واللہ! کیا خوب چال ہے!

ہمیں اس ''بگڑی روحانیت'' کا کس قدر رہین منت ہونا چاہئے کہ جس نے اس ذمہ داری عائد کرنے والے بھاری تشیع کو، اس سراسر رنج وتحمل وصبر و جہاد وشہادت والے مذہب کو۔۔۔ کہ جس نے علیؑ کو عاجز کیا اور اپنے سارے اکابر پیشواؤں کو میدان یا پھر زندان میں زہرِ خیانت یا شمشیر جنایت سے قتل کیا۔۔۔ اس طرح کے آسان، بے دردسر، ''فوری'' اور سرتاپا آٹومیٹک تشیع میں بدل دیا!!

کون کہتا ہے کہ اسلام زمانے سے پیچھے رہ گیا اور وہ تکنیک، تیز رفتاری، بجلی، جٹ، اور الیکٹرونیکی صنعتوں کے دور سے ہم آہنگ نہیں اور اس نے اپنے آپ کو موجودہ شرائط سے سازگار نہیں بنایا ہے؟ یہ روشن خیال لوگ ان باتوں سے بے خبر ہیں!

"ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر،و یعمرون بالمعروف و ینهون عن المنکر و اولئک هم المفلحون"!(آل عمران......۱۰۴) ☆

(اور تم میں سے ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہونا چاہئے جو (لوگوں کو) نیکی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے، اور یہی وہ لوگ ہیں جو نجات یافتہ ہیں)

اس امت کی ذمہ داری خالصتاً ''سماجی مسئولیت'' نہیں کہ وہ۔۔۔ نیشنلسٹوں کی طرح۔۔۔ ''اپنے معاشرے'' کے مقابل احساس مسئولیت کرے، صرف طبقاتی مسئولیت نہیں کہ جس کے افراد۔۔۔ سوشلسٹوں کی طرح۔۔۔ (خواہ ان کے پاس

☆...... یہاں ''اولئک'' کے بعد ''ہم'' کی ضمیر ہے اور یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں یعنی ''یہی لوگ''، اور اس کی تکرار صرف تاکید کے لئے ہے۔ یہی لوگ، جی ہاں ''یہی لوگ'' نجات یافتہ ہیں۔

ایک بھر پور جہاں بینی اور عالمی محنت کش طبقے کی وسیع ذمہ داری کیوں نہ ہو) فقط اپنے طبقے کے مقابل مسئول ہوں، بلکہ یہ سماجی مسئولیت سے بالاتر ہے، یہ ایک عالمی اور جاودانی ذمہ داری ہے، وہ مسئول ہیں کہ "مبارزہ کریں"۔ "خیر" کی دعوت کی راہ میں مبارزہ، امر "بالمعروف" اور نہی عن "المنکر" کی راہ میں مبارزہ۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن مجید کے عمیق ترین، خوبصورت ترین، سنگین ترین، نفیس ترین اور انسانی ترین جملوں، اصطلاحوں، اور دستور العمل کو بدترین، سطحی ترین، بے وقعت ترین، پست ترین او بے قدر ترین موارد میں اس قدر استعمال اور "مستعمل" کیا گیا ہے اور اتنا آلودہ کیا گیا ہے کہ اب بڑی مشکل سے ان کی زیبائی، ان کی گہرائی، ان کی بلندی اور ان کی شادابی کو واپس لوٹایا جا سکتا ہے۔۔۔ اس لئے کہ اب ذہنوں نے انہیں غلط انداز میں دائرہ فہم میں اتارا ہے۔۔۔ بعض مفاہیم کو بنیادی طور پر بالکل الٹا لباس پہنایا گیا ہے، بعض کو انحرافی مفہوم دیا گیا ہے، بعض کو معنی سے گرا دیا گیا ہے، بعض کے درجے کو گھٹا کر انہیں حقیر کر دیا گیا ہے اور ان ہی میں "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا جملہ بھی ہے۔

حالانکہ یہ وہ جملہ ہے جس میں ہم مسلمانوں اور ساری بشریت کی آگاہی، حرکت، نجات، آزادی، اور تکامل گروی ہے۔

لیکن اس کے باوجود نجات کے اس تنہا ستون کے ذہن سے ڈھلنے اور اس کے بگڑنے سے ہماری اونگ تک نہیں ٹوٹتی اس لئے کہ یہ کام آسان ہے کہ ہم چند ایک نوجوان افراد کو۔۔۔ بعنوان منکر۔۔۔ اس کام پر لگائیں اور خود بیٹھ کر غم کھائیں اور غصہ سے کانپتے رہیں۔

ان ہی سخت اور تند مزاج "ناھین عن المنکر" میں سے ایک شخص میرے پاس آیا تھا کہ: ''جناب! آپ کو معلوم نہیں کہ وہاں بیرونی دروازہ کھلنے کے انتظار میں بہت سی عورتیں جمع ہو گئی ہیں، بہت برا حال تھا، مجھے بڑا غصہ آیا!''

میں نے کہا:

''کیوں؟ کیا کسی خاتون نے پردے کی رعایت نہیں کی ہے؟'' کہا:

''......نہیں جناب، پردہ اپنی جگہ، لیکن میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا کہ اس نے اپنی چادر کے نیچے ایسی اسکرٹ (SKIRT) پہنی تھی کہ جو مناسب حال نہیں تھی......''!

میں نے کہا:

بندۂ مومن! چادر کے نیچے مختصر دامن والا اسکرٹ پہننا زیادہ منکر ہے یا ایک جمع غفیر میں مختصر دامن کو چادر کے نیچے سے جھانکنا؟

......مشہد میں ان ہی ''آمرین بالمعروف اور ناھین عن المنکر'' میں سے ایک مورکھ نے یہ طے کیا تھا کہ وہ ''اخروی ثواب حاصل کرنے'' کے لئے روزانہ اپنا ایک گھنٹہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں صرف کرے گا، اس پروگرام کے مطابق وہ مسجد گوہر شاد کے دروازے پر کھڑے ہو کر دو باتوں کے سلسلے میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کرتا تھا:

ایک یہ کہ وہ وہاں سے گزرنے والے ''ناواقف'' نوجوانوں کے قریب آہستگی سے جا کر (جبکہ وہ خود بھی تیئیس، چوبیس سالہ نوجوان تھا) بڑے مؤدبانہ اور خاکسارانہ انداز میں کہتا تھا:

محترم! معاف فرمایئے گا، استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنی اس جگہ کو، جی ہاں اپنی داڑھی کو صرف ایک جو جتنا رکھیئے۔۔۔ صرف ایک جو جتنا۔۔۔ تاکہ داڑھی کا صدق بھی باقی رہے اور آپ تراشنے کے عمل سے بھی بچے رہیں..... خدا حافظ، ''وما علی الرسول الا البلاغ''!

دوسری بات یہ تھی کہ وہ ان خواتین کا راستہ روک کر جو مختلف قصبوں سے آتی تھیں اور ان ہی نوجوانوں کی طرح ''ناواقف'' تھیں اور مثلاً ان کا پردہ بہت زیادہ دقیق اور ریاضی نہیں تھا، چپکے سے کہتا تھا:

......ہمشیرہ! معاف کیجئے گا جسارت کر رہا ہوں لیکن..... مہربانی فرما کر چادر کے کونے سے نکلے ہوئے ان ''چند عدد'' بالوں کو اندر کر لیجئے! اور آپ ماں جی، صرف چہرے اور ہاتھ کی ہتھیلیوں کو کھلا رکھنے کے لئے کہا گیا ہے، وہ بھی بعض علما کے بنا بہ احتیاط......''

ایک دن جب وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سرگرم عمل تھا، آستانے اور مسجد کے بعض خدام نے سمجھا کہ یہ جوانسال چھوکرا دوسروں کی عورتوں پر فقرے چست کر رہا ہے اور اس کا تعلق چھیڑ چھاڑ کرنے والے بانکے چھبیلوں سے ہے۔ سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے گھسیٹ کر آستانے کے چوکسی خانہ میں لے گئے تاکہ آستانہ کے آمرین معروف اور ناھین منکر اس باری خود اس کو، جی ہاں خود اس کو! نھی عن معروف اور امر بہ منکر کریں۔

ان سے زیادہ عجیب تر مکہ اور مدینہ کے ان دس، بیس ہزار افراد کا ''امر بالمعروف اور نھی عن المنکر'' ہے کہ جو ''الآمرین بالمعروف

اور الناهين عن المنكر" کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ پوری طرح مسلح اور بہت زیادہ حساس، بیدار اور ذمہ داری نبھانے میں سخت گیر ہیں، رسول خدا کے گھرانے کے قبرستان میں اگر کسی مسلمان نے ان کے کھینچے ہوئے سرحدی خط سے ایک قدم بھی آگے رکھا اور جناب ابوطالب اور عبدالمطلب کی قبروں کی طرف ایک قدم بھی آگے بڑھا تو گویا اس نے اسلام میں ایسے منکر کو داخل کیا کہ اب اس کا خون اس کی گردن پر ہے! لیکن پورے فلسطین پر اسرائیل کی جارحیت اور مکمل طور پر مسلمانوں کے اس عظیم قوم کی دربدری، ان کے لئے بنیادی طور پر منکرات میں نہیں آتا اور شرعاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اس کا شمار نہیں ہوتا۔ کس رسالہ میں ہے؟ دکھاؤ!

آج امر بالمعروف اور نہی عن المنکر "فردی اور فرعی" مسائل کے دائرہ میں سمٹ گئے ہیں وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اس میں کسی ضرر کا احتمال نہ ہو! وگرنہ ساقط ہے۔

مذہبی مقررین میں سے ایک مقرر کہ جو بڑی درخواستوں کے بعد تہران سے مشہد آیا تھا تاکہ میرے خلاف تقریر کرے، میری اس تنقید پر کہ آخر کیوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اتنا حقیر اور نحیف ولاغر ہو گیا ہے اور اس پر پیچیدہ اور بعض اوقات محال مشروط کا اضافہ ہو گیا ہے، گویا معاملہ صفر ہے! اپنی تضحیک آمیز لحن اور اس کیفیت کے ساتھ کہ گویا اسے حظ حاصل ہو رہا ہے کہ وہ ایسی مکروہ زبان استعمال کر رہا ہے اور اس نے ایسی دانداں شکن دلیل دریافت کی ہے، فرمایا: "حضور والا! ایک سنڈ امسٹنڈا جلاد نشہ میں چور ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں شراب کی بوتل لئے لال آنکھوں کے ساتھ کھڑا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر میں

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کام لیتے ہوئے شراب کی بوتل اس کے ہاتھ سے لے لیتا ہوں تو وہ خنجر میرے پیٹ میں اتار کرناف تک مجھے چیر دے گا تو جناب والا میں ایسا کام نہیں کرونگا اور شرعی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بھی اپنی ذات سے ساقط سمجھونگا، اس لئے کہ اس میں ضرر بلکہ خطر کا احتمال ہے۔ تم جو کہتے ہو کہ خطرے کا احتمال اس حکم کو کیوں ساقط کرتا ہے اور تمہارا دل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے جلتا ہے تو تم جاؤ اور اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور اس کے ہاتھ سے شراب کی بوتل لو، میں اس کا اہل نہیں ہوں......!

ان صاحب نے اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جس اعلیٰ ترین، بھاری ترین، اہم ترین اور عظیم ترین دائرہ عمل کو اپنے ذہن میں لانا چاہا ہے وہ اسی میکش سے مبارزہ ہے کہ البتہ اگر اس کے ہاتھ میں خنجر بھی ہو تو حکم شرعاً ساقط ہے!

اب آپ امام حسین علیہ السلام کو دیکھئے کہ انہوں نے اس حکم کے دائرہ کو کہاں تک پھیلایا ہے اور کس حد تک اسے سمجھا اور سمجھایا ہے۔

لیکن افسوس کہ یہ لوگ حسینؑ کے افکار کو پیش کرنے اور اسے سکھانے کے بجائے، صرف ان کے جسم اقدس کے زخموں پر گفتگو کرتے ہیں اور ان کی سخت ترین تکلیف کو کم آبی دکھاتے ہیں اور وہ واحد بات جو ان سے نقل کرتے ہیں اور اس کی تکرار کرتے ہیں یہ ہوتی ہے کہ وہ شمر اور حرملہ کے سامنے اپنے معصوم بچہ کو ہاتھوں پر اٹھا کر ان کے دلمیں رحم ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور زاری کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''یاقوم! ان لم ترحموا الی، ترحموا لھذا الطفل'' اے قوم اگر تم مجھ پر رحم نہیں کرتے تو کم از کم اس بچے پر رحم کرو، اگر میں گناہ گار

ہوں تو یہ بچہ تو گناہ گار نہیں......!

ان لوگوں نے اپنی ذلت کی نفسیات کو کس حد تک نوع بشر کی دلاوری کے عظیم ہیرو پر ٹھونسا ہے!؟ یہی وہ ہستی ہے کہ جب کربلا کی سمت حرکت کرتی ہے تاکہ اپنی، اپنے فرزندوں کی اور اپنے کنبہ کی باہمی شہادت پیش کرے اور ایک ایسا انقلاب برپا کرے کہ جس سے تاریخ پر کپکپی طاری ہو اور اپنے پنجے وقت کی عظیم ترین طاقت کے پنجوں میں گاڑ دے تو ایک خط لکھتی ہے کہ جو اس کی فکری وصیت کا حکم رکھتی ہے اور اس خط کو اپنے بھائی محمد حنفیہ کے حوالے کرتی ہے تاکہ لوگ یہ جان لیں کہ اس کام سے اس کا ہدف کیا ہے۔ یہی وہ خط ہے جس میں وہ عظیم ترین ہستی لکھتی ہے: اس راہ میں میرا ہدف سوائے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اپنے جد کی سنت کو زندہ کرنے کے اور کچھ نہیں ہے''!

حسینؑ بن علیؑ کی مجلس پڑھنے والے کے معروف و منکر کی سطحِ اختلاف کو دیکھئے اور اس حسینؑ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ملاحظہ فرمایئے۔

تاریخ کے سارے جلادوں اور جباروں کے تخت پر تکیہ زن یعنی خلیفہ، یزید اور اس خنجر بہ کف شرابی کے درمیان اختلاف، ذہنی ہے کہ جسے اس نے اپنے ذہن میں بنایا ہے اور پھر بھی اس پر لرزہ طاری ہے اور مجھ سے کہتا ہے: ہم اس کے اہل نہیں، مجھ سے تکلیف شرعی ساقط ہے، اب تم آؤ اور اس سے نبٹو! اور حسینؑ ہیں کہ جو اپنے کنبہ، اپنی بہن، اپنے بچوں اور اپنے مختصر سے ساتھیوں کے ساتھ یزید پر حملہ کرتے ہیں!

ابتدائی اسلام اور صادق القول علیؑ نے اس حکم کو معنی سے بھرا ہوا بتایا ہے اور اس کی ظرفیت کی وسعت میں وہ سب نعرے اور وہ سب اہداف ہیں کہ جو نئے روشن

خیالوں، انسان دوستوں، عدالت خواہوں، آزادی کی جنگ لڑنے والوں، سامراج دشمن مجاہدوں اور دنیا کی ساری انقلابی اور ترقی پسند آیڈیالوجیوں کی ثقافت میں ''مسئولیت'' کے عنوان سے آئے ہیں اور وہ ان سب سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ بلند مرتبہ والے علیؑ کہتے ہیں:

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کُل کی کُل عبادتوں کے مقابل ایسے ہی ہیں جیسے سانس کی گرمی سے پیدا ہونے والی نمی کے آگے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر''!

اسلام نے اپنے پیروکاروں کی ''سماجی مسئولیت'' کے لئے جس زبان کا انتخاب کیا ہے وہ ایک ایسے مذہب کی زبان ہے کہ جس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سارے تاریخی ادوار، اور ان سارے جھگڑے جھمیلوں اور بے شمار تضادات میں کہ جو نوع بشر کو دکھ پہنچا رہے ہیں، زندہ رہے اور رہبری کا کردار ادا کرتی رہے۔

اور اسی لئے اس نے اپنے لئے دو عام اور ظرفیت بھرے الفاظ ''معروف'' اور ''منکر'' کو چنا اور ان میں سے ہر ایک کے موارد و مصادیق کی دریافت کو ہر دور اور ہر نظام کے اجتہاد اور ہر زمان و ہر زمین کی زیبائیوں کے نظریات پر لوگوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اس طرح کی حقیر اندیشیوں، فردی اور فرعی کھانچے سازیوں، محکم بندشوں اور ''خدا فریبانہ'' تفنن بازیوں کو ایک طرف رکھیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرہ کو داڑھی، لباس، آرائش، اور ان ناچیز چیزوں میں منحصر نہ کریں کہ جن کے امر اور جن کی نہی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر** کو اس کے اسی اصیل اور وسیع اسلامی

مفہوم میں پیش نظر رکھیں اور اس پر عمل کریں، اس لئے کہ معاشرے میں بہت سے منکروں اور معروفوں کے مصادیق آئے دن نئے رنگ اور نئی صورتیں اختیار کرتے ہیں اور اگر ان سے ہمارے مفاہیم صرف ایک یا چند ایک، خشک ذہنی سانچے میں منجمد ہو جائیں اور ہم صرف اور صرف ایک یا ان چند ایک، ثابت خارجی مصادیق کو کاسہ فہم میں جگہ دیں جس کی خصوصیت گزشتہ ادوار سے وابستہ ہے، یا حتیٰ آج ایک خاص نظام میں اس کا استقرار ہے تو ایسی صورت میں وقت کے ساتھ ساتھ نہ کسی معروف کا وجود ہوگا اور نہ منکر کا! ☆

لوگوں کو دوسری طرح کے منکروں سے تکلیف اور دوسرے معروفوں کی ضرورت ہوگی اور مذہب کسی اور، معروف اور کسی اور منکر کی بات کریگا اور یہ فاصلہ، مذہب کو زمانے سے پیچھے ہٹا دے گا۔

اگر آج ہم ''معروف'' یا ''منکر'' کے مفہوم کو صرف فلاں طرح کے لباس پہننے اور

☆......جس طرح کہ مصادیق و موارد میں، اسی ثابت اندیشی نے اسلام کو، کہ جسے سارے نظاموں میں سارے ادوار کا دین ہونا چاہئے، مثلاً زندگی کے اہم ترین مسئلہ میں کہ جو اسلامی اقتصاد ہے اور اس کا اہم ترین حکم زکات ہے، موجودہ شرائط میں فرسودہ اور جدید ذریعہ آمدنی سے بالکل بے ربط کر دیا ہے! اس طرح کہ ایک امریکی طالب علم مسلمان ہو گیا تھا اور میں نے اسے ''مشرف بہ اسلام (؟) ہونے کے مراسم، کی ادائیگی کے لئے ایک عالم دین کے پاس بھیجا جس نے اسے کہ جو اربوں کے ''کاؤچو'' (coautchouc-) اور گنے کا شیئر ہولڈر تھا، زکات کی ادائیگی سے معاف کر دیا تھا اس لئے کہ جن چیزوں پر زکات واجب ہوتی ہے وہ حتیٰ آج کے امریکہ میں بھی عربستان کے گلہ بانی کے دور کی پیداواری میزان پر ہے جس میں نقدین (سونا، چاندی)، انعام ثلاثہ (بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ) اور غلاۃ اربعہ (گندم، جو، خرما، اور مویز) ہیں۔ اس وقت ۔۔۔ صدر اسلام کے بالکل برعکس ۔۔۔ صرف معاشی اعتبار سے زبوں حال افراد ہی پر زکوۃ لاگو ہوتا ہے!

فلاں انداز ے کی داڑھی رکھنے میں جامد کردیں تو پھر داڑھی کی کیفیت اور اصلاحِ لباس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے اور کوئی موضوع نہیں رہے گا، جبکہ ایک دن استعمار۔۔۔خواہ وہ جدید ہو کہ قدیم۔۔۔مصداقِ ''منکر'' ہے اور دوسرے دن جب یہ فنومن (Phenomen) ختم ہوگا تو۔۔۔مثلاً۔۔۔''طبقاتی استثمار'' مصداق ''منکر'' ہوگا اور جس دن ''طبقاتی استثمار'' اپنا بستر سمیٹے گا تو اس وقت۔۔۔مثلاً۔۔۔اخلاقی برائیاں، اس کی جگہ لیں گی یا پھر شخصیت پرستی یا قومی خودغرضی، یا جاہ طلبانہ برتری جوئی، یا اصلی اصولوں سے بدیانی اور بدعت یا انحرافی آراء کی تجدید سامنے آئے گی......!

سب سے بڑا منکر یہی ہے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرہ کو ''فرعی اور فردی'' مسائل کے فریم میں منحصر اور ثابت ''فنومناز'' میں منحصر کریں!

نوع بشر کے لئے خروج کرنے والی بہترین امت کی نظر میں آج کی سب سے بڑی منکرات، بین الاقوامی امپریالیزم، عالمی صیہونیزم، استحمار (استعمار کی ایک قسم)، قدیم و جدید استعمار، استثمار (استعمار کی ایک قسم)، استبداد، طبقاتی تضاد، دستہ بند جماعتوں کی تنظیم (مختلف مفادات کی جتھ بندیوں کی نمائندگی کرنے والا گروہ)، نسل پرستی، ثقافتی استعمار اور مغرب پرستی وغیرہ ہے۔

اس حکم کی بنیاد پر کہ ناسخ کی نفی کے لئے منسوخ سے توسل، ترجیح دینے والے سے غفلت کے لئے ترجیح پانے والے سے توسل، ایک ''اصل'' کے بجائے ''فرع'' پر تکیہ، کسی مرجع سے فرار کے لئے ایک انفرادی امر سے وابستگی، اور ایک بڑے حق سے جہل اختیار کرنے کے لئے اس سے کمتر حق کو معرض وجود میں لانا......خیانت

ہے۔۔۔۔تو ان موجودہ شرائط میں جو کوئی ان منکرات سے زیادہ گرے ہوئے کسی ''منکر'' کو عوام الناس سے متعارف کراتا ہے اور ''لوگوں'' کو ''داڑھی'' میں پھنساتا ہے تاکہ لوگ ''اصل'' سے غافل رہیں تو وہ ''امر بہ منکر'' اور ''معروف سے نہی'' کرتا ہے۔

اور یہ کام ہر دور کے علمی رہبر اور فقہی اجتہاد کے ذمہ ہے کہ وہ اجتہاد کی راہ سے وقت کے ''معروفوں'' اور ''منکروں'' کو دریافت اور مشخص کرے اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قیادت کرے۔

یہ وہ شرائط ہیں کہ جن میں یہ دو خوبصورت، عمیق اور حیاتی الفاظ اپنے عملی، عالمی، اور جاودانی مقام کو ہمیشہ محفوظ رکھیں گے۔ اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ''روشن خیال آدمی کی جمعی اور جاودانی مسئولیت'' کے سوا اور کچھ نہیں کہ جس کے بارے میں ہمیشہ تاکید ہوتی ہے۔

امر و نہی کی مسئولیت سے عاری اسلام ممکن ہے ایک ''دین'' ہو لیکن بلاشبہ اسلام نہیں، اس لئے کہ اسلام کا عملی مرام، اس کی اجتماعی طاقت اور اس کا انسانی کردار ان ہی دو ستونوں پر استوار ہے، اور یہ ایک اتفاقی امر نہیں کہ اسلام سے ان ہی دو ستونوں کو لے لیا گیا ہے، یا اس سے بدتر، پستی کی حد تک اسے حقیر کر دیا گیا ہے۔

اس آیت میں ''امت'' اور ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے دو مفاہیم کو تعبیر کی اعلیٰ ترین اور بلیغ ترین چوٹی ملی ہے:

''کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، تأمرون بالمعروف، و تنہون عن المنکر و تومنون باللہ''!☆

☆......آل عمران......۱۱۰

''تم وہ بہترین امت ہو کہ جس نے ''لوگوں'' کے لئے قیام کیا ہے، خروج کیا ہے، تم لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو، برے کاموں سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو''

یہ بہترین امت کہ جس کا ہدف ''لوگ'' ہیں، کیا کر رہی ہے؟ کن پایوں پر استوار ہے!

تین پایوں پر:

۱۔ ''معروف کا حکم دیتی ہے''،

۲۔ ''منکر سے روکتی ہے''،

۳۔ ''خدا پر اس کا ایمان ہے''!

حیرت ہے! یہ الٹی ہوئی صورت کیوں؟ یہ کیسی ترتیب ہے؟ کوئی مذہب، اس طرح کی درجہ بندی کرتا ہے؟ پہلے امر بالمعروف، دوسرے نہی عن المنکر اور تیسرے خدا پر ایمان؟

اہل فن، اور وہ لوگ جو دینی علوم، اور شرع کی منطق پر دسترس رکھتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلے خدا پر ایمان ہے اور اس کے بعد عمل کی باری آتی ہے، وہ بھی کونسا عمل؟ اپنی اصلاح! اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کے اصلاح کی باری آتی ہے اور امر و نہی کی تکلیف عائد ہوتی ہے، وہ بھی پہلے منکرات سے نہی ہے اور اس کے بعد امر بالمعروف ہے!

کیا آپ نے بیشتر دینی مواعظ میں نہیں دیکھا ہے کہ جاؤ، پڑھو، سمجھو اور کرو وغیرہ سے زیادہ گفتگو، ''نہ کرو''، ''نہ جاؤ''، ''نہ پڑھو''، اور ''نہ بنو'' کی ہوتی ہے''؟

کیوں نہیں......، ایسا ہی ہے جیسے آپ فرما رہے ہیں، لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے! یہ قرآن کی آیت ہے کہ جس نے اس طرح مطالب کو آگے پیچھے کیا ہے!

آخر کیوں؟ اس میں شک نہیں کہ خدا پر ایمان ایک محکم پایہ ہے، خدا پرستی مقدم ہے، بیشک یہ ایک بدیہی امر ہے، قرآن ابلاغ بدیہیات اور تکرارِ مکررات نہیں کرنا چاہتا، وہ درس دینا چاہتا ہے، آگاہی دینا چاہتا ہے، نئی بات کہنا چاہتا ہے، ان باتوں کو ہمیں سکھانا چاہتا ہے جو ہمارے معمول کے ذہن میں نہیں آتیں۔ وہ ایک عملی حقیقت، ایک کام کی بات، ایک نئے درس، ایک فکری ہدایت، ایک عملی پرورش اور انحراف سے پیش بندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، آج کے مفہوم میں ''سماجی عملی مسئولیت'' ہے۔ یہ مسئولیت متنِ ایمان سے خدا تک پہنچتی ہے، اس اصل کا عملی نتیجہ عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ ایک ایسی عینیت ہے کہ جو اس ''ذہانت'' سے ابھری ہے اور اس عینیت میں، ہدف، معروف کی برقراری ہے، نہی عن المنکر اس ہدف کی راہ پر آگے آتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہاں قرآن چند ایک علماء، عرفاء اور فلاسفہ کی گفتگو نہیں کرتا، علمی، عقلی اور ذہنی مراتب کی بات نہیں کرتا، منطقی اور فلسفی بحث نہیں کرتا، ''اس امت'' کی بات کرتا ہے جو ''ان تمام امتوں سے جنہوں نے افراد بشر کے لئے قیام کیا ہے، بہتر ہیں''۔ تو پھر بات ''امت'' کی ہے، ایک ''ذمہ دار گروہ'' کی، اور ان ہی کی توصیف میں اس نے عمل کو عقیدہ پر مقدم کیا ہے۔ سماجی عمل پر تکیے اور لوگوں کی نجات کے لئے امر و نہی کی مسئولیت کے ساتھ کہ جو امت کا وجودی فلسفہ ہے وہ اس نئے سبق اور اس حیرت انگیز آگاہی کو گوش گزار کرنا چاہتا ہے کہ اس مسئولیت اور لوگوں

کی سرنوشت کے مقابل عملی ذمہ داری کے بغیر، بنیادی طور پر امت مفہوم نہیں پاتی۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ مسئولیت پر صحیح صورت میں تکیہ کے بغیر، لوگوں کے لئے عملی ہدف کے بغیر، اور معروف کی راہ میں کوشش اور ''منکر'' کے خلاف محاذ آرائی کے بغیر خدا پر ایمان سے تم صوفیِ باصفا، عارفِ کامل، عابدِ زاہد، اور الٰہی فلسفی تو ہو سکتے ہو لیکن مسلمان؟ نہیں!

ایسا شخص اہل دیر، اہل مدرسہ، اہل خانقاہ اور اہل محراب ہوگا، ......

مگر ''امت''؟ نہیں!

امت یعنی ''ایک معتقد ذمہ دار گروہ''!

ایک ایسا گروہ کہ جو نیکیوں کے حکم اور ناپسندیدہ باتوں کے رد کرنے کے لئے بنا ہے، جس نے افراد بشر کے لئے خروج کیا ہے اور جو خدا پرست ہے!

یقیناً ان پایوں کا تقدم و تاخر نہ اتفاقی ہے اور نہ کلام کی خوبصورتی کے لئے ہے، گرچہ قرآن نے الفاظ کی خوبصورتی اور اپنے نثر کی☆ ہنرمندی کو بہت اہمیت دی ہے، اس طرح کہ آج چودہ صدیاں ہوگئی ہیں اور سخن شناس افراد قرآن کی خوبصورت باتوں کی ہنرمندی کی دریافت میں صرف علم معانی و بیان و بدیع نامی خاص موضوعات کی تدوین تک پہنچے ہیں اور ابھی تازہ ترنکتوں کے استخراج سے فارغ

☆...... اگر قرآن کو ''نثر'' کہا جا سکے، اس لئے کہ میرے عقیدہ میں ایسا نہیں ہے، اور اگر میں نے نثر کا لفظ استعمال کیا ہے تو صرف اس لئے کہ میں اسے ''نظم'' یا ''شعر'' بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ قرآن ایک نغمگین بیان ہے۔ لیکن یہ نغمہ یا آہنگ نہ نظمی ہے اور نہ شعری، بلکہ یہ وہ خاص آہنگ ہے کہ جو الفاظ میں معانی کی حرکت سے رونما ہوتا ہے، ایک ایسا آہنگ کہ جس کا احساس، حرکتِ طبیعت میں ہوتا ہے۔

نہیں ہوئے ہیں۔

بعض افراد کو نثر کی زیبائی ناپسند ہے اور وہ اسے بد اصلوبی میں لیتے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے کہ جو "ارشاد" میں کام کے آغاز کے بعد دینی لکھاری ہو گئے ہیں میرے والد کو لکھا تھا:

"زین العابدین رہنما، محمد حسین ہیکل، سید قطب، عقاد اور ڈاکٹر علی شریعتی جیسے ان متجددین کی تحریر کے انداز سے جنہوں نے اسلام کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں میری حالت بگڑنے لگتی ہے! اس عجیب وغریب تحریر اور ان مخصوص الفاظ سے کہ جو صحیح مفہوم بھی نہیں رکھتے اور جو رومینٹک اسلام کو بیان کرتے ہیں، میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے" ☆ قرآن، نہج البلاغہ، اور اسلامی ادعیہ کے بہت سے اصلی متون لفظوں کی زیبائی اور بیان کی ہنرمندی میں انتہائی اعجاز آمیز نمونے ہیں۔

لیکن قرآن ان فنی نثور کے متون میں سے نہیں کہ جسے لفظ میں تصنع اور سجع و اشتقاق وغیرہ میں وسواس، افادہ معنی کے نقطہ نظر سے لاابالی کر دے، بلکہ ایک ایسی کتاب ہے کہ نہ صرف اس کے ہر لفظ کا انتخاب بلکہ ہر لفظ کی جگہ بھی نپی تلی ہے اور ہر لفظ کے استعمال کی صورت بلکہ اس کی ترتیب، اور اس کا تقدم یا تاخر تک عمدی ہے اور اس کے ہر لفظ کی جائے نشت ایک عنصر کے محل وقوع کی طرح ایک نہایت ظریف بافت میں مرکب ہے، اس کے اجزاء کے روابط، فطرت کے گوناگوں اجزاء کے روابط کی طرح ہیں کہ جو علمی قواعد اور ریاضی کی زبان سے محل بیان اور محل توجیہ پر آتے

☆...... ان ہی افراد میں سے ایک شخص موسم بہار میں کسی شیرازی کا مہمان تھا۔ صبح، بڑی خفگی اور آلکسی کے ساتھ بار بار کہہ رہا تھا:

"رات بھر پھولوں کے گند اور بلبل کی بھوں بھوں سے میری نیند حرام ہو گئی"!

ہیں۔۔۔ استاد بازرگان کی دریافت کے مطابق۔۔۔ یہ کتاب ایسی ہی ہے جیسی فطرت، جیسی کتاب ہستی جس طرح یہ ہستی وہ کتاب ہے جو ایٹموں کے حروف، مالیکیولز کے الفاظ اور مادی فنومناز کی عبارتوں اور ان کی کیفیت وکمیت سے لکھی گئی ہے، اسی طرح یہ کتاب وہ خلقت یا وہ فطرت ہے کہ جو حروف کے ایٹموں، لفظوں کے مالیکیولز اور عبارتوں کی موجودات (اور دونوں کا نام: آیت) سے خلق ہوئی ہے☆ اور میرے والد کے کہنے کے مطابق: یہ ایک اتفاقی امر نہیں ہے کہ: ''خداوند عالم نے قرآن کے بارے میں بھی اور قدرتی مظاہر کے بارے میں بھی ''وحی'' کے واحد لفظ کو استعمال کیا ہے''۔☆☆

یہ بات صحیح ہے کہ ''خدا پر ایمان'' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مقدم ہے اور یہ بھی درست ہے کہ بنیادی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔۔۔ روشن خیال آدمی کی انسانی مسئولیت کے ساتھ۔۔۔ ایک ایسی آئیڈیالوجی پر اعتقاد سے پھوٹتا ہے کہ جو اسلام میں ''خدا پر ایمان'' ہے اور اسی رو سے وہ فرد بشر کو آگاہانہ ''ایثار'' اور عاشقانہ جانثاری کی طرف کہ جو عاقلانہ اور منطقی بھی ہے، بلاتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ۔۔۔ گرچہ ممکن ہے آپ اسے نہ مانیں...... ''تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر'' کی ان دو عبارتوں پر ''وتومنون باللہ'' کی تاخیر اس لئے ہے کہ قرآن ہمیں اس حقیقت

☆...... انشاء اللہ بہت جلد ہم ایک عظیم قرآن شناس اور اسلام شناس ہستی، استاد بازرگان کی ''تحول تدریجی قرآن'' نامی کتاب کو منظر عام پر لانے کی سعادت حاصل کریں گے کہ جو میرے خیال میں نظام قرآن میں ایک بہت بڑی دریافت ہے۔ اگر یہ کام تکمیل کی منزل پر پہنچے تو قرآن کا وحی ہونا اتنا ہی واضح ہوگا جتنا فطرت کا علمی ہونا!
(یہ کتاب ''سیر تحول تدریجی قرآن'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔)

☆☆...... استاد محمد تقی شریعتی کی ''تفسیر نوین''

کو بتانا چاہتا ہے کہ تمہاری اصلی ذمہ داری اور تمہاری تخلیق سے خدا کا ہدفِ غائی کہ جس میں تم ''بدترینِ امت'' کے عنوان سے اٹھائے گئے ہو یہ نہیں رہا ہے کہ تم خدا پر ایمان لاؤ، اس لئے کہ خدا کو تمہارے ایمان کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ''تمہارے اٹھائے جانے'' کا ہدف یہ رہا ہے کہ تم ''نوعِ بشر'' کی راہ میں، معروف کی برقراری کیلئے کوشاں رہو اور منکر کو دور کرنے کے لئے جنگ کرو، جس طرح رسول خداؐ تمہارے لئے نمونہ حیات تھے اسی طرح تم بھی دوسروں کے لئے نمونہ کمالِ انسانی اور عاملِ ہدایت و آگاہی و رستگاری بنو، اپنے آپ کو رسول خداؐ کی راہ پر سنوارو اور خلق خدا کیلئے ایک رہنما شاہد بنو، لوگوں کو نیکی کی طرف بلاؤ اور معروف کا امر اور منکر کی نہی کرو۔

یہ ہیں تمہاری اصلی ذمہ داریاں، اور ان ہی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خدا پر تمہارا ایمان ہو! یہ تم ہو۔۔۔ تم کہ جو ارتقا کوش اور افراد بشر کی نسبت مسئول ہو۔۔۔ کہ جسے ''خدا پر ایمان'' کی ضرورت ہے۔

اس رو سے، اگر کسی ''گروہ'' کا خدا پر ایمان ہو مگر وہ انسانی ذمہ داریوں کو نبھانے کی راہ میں قدم آگے نہیں بڑھاتا، یعنی انسانی تکامل میں اللہ پر اس کا ایمان،۔۔۔ کہ جس کی اعلیٰ ترین فطری تجلی، عوام کے ساتھ اس کا احساسِ ارتباط، اپنی نوع کے ساتھ ہمدردی، برائیوں اور زیبائیوں کے مقابل احساسِ مسئولیت، اور لوگوں کی سرشت کے مقابل اپنی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔۔۔ کوئی دکھائی دینے والا عینی اثر اور سماجی زندگی میں کوئی تعمیری کردار نہیں رکھتا تو وہ ایک ایسا گروہ ہے کہ جس نے عالم میں ایک علمی حقیقت اور ایک فلسفی واقعیت کی نسبت ذہنی اعتقاد پیدا کیا ہے اور چونکہ نوع بشر کی سرنوشت میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہے اس لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اور چونکہ خدا کو بھی اس کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اس کی حیات بیہودہ ہے...... لہٰذا

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ ہم ہیں کہ جنہیں انسانی اور اخلاقی ترقی وکمال، انسانی تعمیر اور اپنی نوعی تکامل کے لئے خدا کی نہیں "خدا پرستی" کی ضرورت ہے اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا ایک "مادی انسان" کو جو اسے نہیں پہچانتا لیکن اپنی سماجی مسئولیت کو سمجھتا ہے اور خدا کی عبادت نہیں کرتا، مگر خدمت خلق کرتا ہے اس خداشناس سے زیادہ لطف وعنایت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو سیکڑوں فلسفی، عرفانی، علمی اور منطقی دلیلوں سے اسے اثبات کرتا اور ایک دقیق ضابطے کے ساتھ عبادت کرتا ہے لیکن اس سے خلق خدا کو ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے اور اس نے اپنی قوم اور اپنے لوگوں کی سرنوشت کے مقابل ہرگز کسی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس کا انکار کسی تعبیر وتوجیہ سے نہیں کیا جا سکتا کہ زمین کا وہ خطہ جہاں خدائے واحد پر ایمان مضبوط تر ہے اور جہاں خدا کی پرستش دنیا کے باقی تمام خطوں سے زیادہ ہوتی ہے وہ دنیا کا پست ترین اور پسماندہ ترین خطہ ہے اور خدا کے مومنین زمین کے مغضوبین (یعنی پھٹکارے ہوئے لوگ) ہیں!

بقول شمس (تبریز): "کوئی شخص خدا کا اثبات کر رہا تھا! میں نے کہا: حضرت، خدا کو تمہارے اثبات کی حاجت نہیں، تم خود اپنے آپ کو اثبات کرو"!

دنیا کی موجودہ سرنوشت اور انسانی معاشروں کی طبقہ بندی اعتقادی نقطۂ نظر سے ہمیں ایک عجیب وغریب اور ناقابل یقین حقیقت کا درس دیتی ہے، اس لئے کہ، اگر ہم بشری اعتقادی گروہوں کو تین حصوں میں تقسیم کریں: ملحدین، کہ جنکا اساساً خدا پر ایمان نہیں ہے؛ مشرکین، کہ جو خدا پرست ہیں مگر انہوں نے خدا کو شرک سے آلودہ کیا ہے؛ اور موحدین، کہ جن کا خدائے واحد پر ایمان ہے؛ تو دیکھیں گے کہ تمدن،

ثقافت، طاقت، عزت، برکت ، اجتماعی وحدت، تسخیرِ فطرت، فکری بالیدگی، سائنس، صنعت، ہنر، انسانی حقوق ، بشری آزادی، درجہ عدالت، صلاحیتوں کی بالیدگی کے امکان، حق سے بہرہ مندی اور مادی اور معنوی نعمتوں اور ایسے وسائل و ذرائع سے بہرہ وری جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے خلق کیا ہے اور نیز ان صلاحیتوں کی برقراری کے نقطہ نظر سے جنہیں اس نے انسان کی سرشت میں رکھا ہے، اس کی ترتیب بالکل الٹ ہے! اور بالتحقیق صاحبان ایمان اور خدائے واحد کے پرستار، ملحدوں اور مشرکوں کی دونوں صفوں سے پسماندہ تر اور الٰہی نعمتوں سے بے نصیب تر، کمزور تر، فقیر تر، اسیر تر اور نادان تر ہیں...... اور میں کیا بول رہا ہوں؟ بنیادی طور پر یہ ''اوصاف'' ان ہی ''خدا کے مومنوں'' میں مقید ہیں! اور ان کی سرنوشت زیادہ تر شرک والحاد کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئی ہے اور یہ لوگ اپنی قُوتِ بسری میں ان کے محتاج ہیں۔

میٹریلسٹ ، یہودی، اور نصرانی لوگ نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور زمین و زماں بلکہ چاند اور مریخ پر مسلط ہیں اور مسلمان؟ ابھی ابتدائی دور کے انسانوں کا دکھ جھیل رہے ہیں: پانی، روٹی، آزادی، تعلیم!

یہ ایک ''تلخ اور ہولناک لیکن صریح واقعیت'' ہے اور اس کا صحیح جواب بہت دشوار ہے!

غیر مسلم، یا غیر مذہبی روشن خیال حضرات کہتے ہیں، یہ اس اصل پر خود ایک عینی دلیل ہے کہ اسلام ایک فیٹیزم مذہب، اور انسان کی اصالت وارادہ کو مفلوج کرنے والا ، دینِ قضاوقدر ہے اور یہ اس کا نتیجہ ہے، یا یہ خود اس اصل کے اثبات پر کہ بنیادی

طور پر دین عوام الناس کی افیم، علم و پیشرفت کی مخالف اور انسان اور اس کی زندگی کی اصالت پر تکیہ کی عینی دلیل ہے۔

اور ان الزامات سے زیادہ مزیدار، بعض مومنین کی توجیہات ہیں کہ چونکہ وہ عزت وقوت وسعادت ونعمت وترقی وعلم وصنعت وتمدن کو وہاں، اور اس کے برخلاف، ذلت وضعف ونکبت وقمت وانحطاط وجہل وپسماندگی کا یہاں، انکار نہیں کر سکتے، ☆ بنیادی طور پر آگے بڑھ کر انہوں نے دین کے نام پر خود کو اور قوم کو یکسر آسودہ کر دیا ہے! اور تمام الٰہی نعمتوں کی تحقیر اور ان تمام انسانی فلاکتوں کی تجلیل بلکہ تقدیس کی ہے!

☆...... البتہ اس علمی اور دینی مسئلہ کے تجزیے میں دوسرے خصوصی نظریات بھی شامل ہیں، جن میں سے ایک مکمل انقلابی نظریہ میرے ہی مقدس شہر کے ایک مشہور واعظ کا ہے کہ جو بنیادی طور پر دنیا کو الٹا دیکھتا تھا، اس کی نظر میں وہ لوگ دکھ اور بدبختی کے عالم میں، اور ہم مومنین مادی رفاہ و آسائش میں تھے! اور وہ اسی "عینی واقعیت"! کی دینی توجیہ وتعلیل کرتا تھا کہ یہ علی بن موسیٰ الرضاؑ کی اس ولایت مدار بارگاہ سے ہماری ارادت کی برکت ہے کہ خدا نے دنیا کو اس طرح بنایا کہ فرنگی کفار رات دن معدنوں اور کارخانوں میں دھویں کھائیں، سختیاں جھیلیں، دق کی بیماری میں مبتلا ہوں اور گاڑیوں کو بنا سنوار کر، اچھی طرح لکڑی کے بکسوں میں بند کر کے بڑے ادب، بڑے کھلتے چہروں بلکہ بڑی آرزوؤں، اور چرب زبانی (تجارتی ایڈورٹائزنگ) کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے ہمیں پیش کریں اور ہم آقاؤں کی طرح کہ جو اپنے کارندوں اور مزدوروں کو اس کی مزدوری کا صلہ دیتے ہیں، ان کو ان کی محنت کا صلہ دیں اور بغیر دردسر کے آرام کے ساتھ بن سنور کر ٹھاٹھ سے اسٹیرنگ پر بیٹھیں...... اور ایکسیلیٹر دیں۔

خدا تمہاری عمر دراز کرے کہ مغرب کے ان ناہنجاروں کے مقابل کہ جو اپنے آپ کو ہم سے بھی آگے سمجھتے ہیں اور اب تک انہوں نے ہم پر اپنی بڑائی جھاڑی ہے، تم نے اپنے حقارت کے سارے عقدے کھول دیئے! اب تک ہمیں یہ سمجھایا گیا تھا کہ ہم گدھے کی طرح کام کر رہے ہیں اور وہ ایکسیلیٹر دے رہے ہیں، اب پتہ چلا کہ نہیں، اس کے برخلاف وہ لوگ کام کر رہے ہیں اور ہم بیٹھے ایکسیلیٹر دے رہے ہیں! شکریہ! بہت شکریہ!

''وہ سب مادی باتیں ہیں؛ سب جسمی لذات ہیں؛ سب دنیا کی سڑی لاشیں ہیں؛ سب ہوس و گناہ و یاد خدا اور کل کے دن سے غفلت ہے، اور اس کے برعکس، یہ سب الٰہی آزمائشات ہیں، حقیقی نعمتیں اور خدائی توفیقات ہیں، تزکیہ نفس، تصفیہ روح، کسب معنویت، اجر صبر، سختیوں کی پاداش، قلت گناہ، اور معصیت پر عدم استطاعت، کے عامل ہیں، خدا کی طرف توجہ، اس پر ایمان و امید، ذکر خدا، معنوی فضائل کی تقویت، روحانی مراتب، درجات طاعت، کسب ریاضت اور سعادت آخرت کا سبب ہیں......''!

''دنیا، مومن کا زندان اور کافر کی جنت ہے''،

اور بعض لوگوں نے تو اپنے آپ کو اتنی ''بھرپور فلسفی تحقیقات، اور دین سے بالاتر اجتہادات'' کی بھی زحمت نہیں دی ہے اور زیادہ فلسفیانہ اور ایسی زیادہ روحانی کیفیت کے ساتھ کہ جو مشیتِ حضرت حق کے مقابل کمال ایمان اور درجہ تفویض و تسلیم و رضا کی صورت کو پیش کرتی ہے، ان باتوں کو مختصر کر کے ایک جملے میں سمیٹ دیا ہے کہ: ''جی ہاں، مگر حکمت بالغہ الٰہی کا تقاضا یہی ہے اور ہم پر اس کا راز پوشیدہ ہے''!

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک واقعیت ہے، اور ساتھ ہی اس میں شک نہیں کہ ان کی مذہب دشمن اور اسلام دشمن توجیہ بھی تہمت ہے اور ان کی مذہب نما اور اسلام نما توجیہات بھی خرافات!

پھر ایسا کیوں ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا جواب اتنا آسان نہیں۔

حیرت ہے، یہ قرآن کس طرح گفتگو کرتا ہے؟ اور کیا کیا باتیں سکھاتا ہے؟

آہ، کاش کہ اس کتاب کو ہم سے الگ نہیں کیا جاتا! اس آسمانی کتاب کو کہ جو کلام وحی ہے، جو ایک پیغمبر اور ایک مطلق الٰہی شخصیت کی زبان سے جاری ہوا ہے، اور اس کے باوجود وہ اُمّی ہے۔ (کیا یہ ممکن ہے؟) اور پھر سماجی مسائل، تاریخی تجزیے اور انسانی تضادات کے اسسمنٹ میں اس طرح کی علمی نگاہ، اس طرح کی بصیرت و بینائی اور اس طرح کے مطلقاً منطقی تجزیہ کے ساتھ، اور ساتھ ہی مادی عوامل، فطری اسباب اور عینی و عملی واقعیات پر اس طرح کا تکیہ، اس قدر ''ریلسٹک''!

اگر ان لوگوں کو جن کا خدا پر ایمان نہیں ہے اور ان میں بقاء، کسب طاقت، اور زمین پر سیادت کی شائستگی ہے تو خدا انہیں وہ چیزیں دے گا جن کی ان میں صلاحیتیں ہیں، اور اگر تم نے کہ جس کا خدا پر ایمان ہے، اپنے آپ کو عمل میں، ذلت، ضعف اور زوال کے حوالے کیا ہے تو خدا تمہیں وہ چیز نہیں دیگا جس کی تم میں صلاحیت نہیں ہے''!

''وہ قوم کہ جس نے روحی اور فکری نقطہ نظر سے اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کی اور اپنے اندر طاقت و نعمت کی شائستگی نہیں ابھاری اور کسب معروف کی راہ میں کوشش نہیں کی اور منکر کو راہ سے ہٹانے کے لئے مبارزہ نہیں کیا، خدا ہرگز اس کی تقدیر کو کسی صلہ کے عنوان سے، ''اپنے او پر ایمان'' کے متبادل، نہیں بدلے گا''۔

ایک جملہ میں، پیشرفت و عزت، ''عمل'' سے حاصل ہوتی ہے اور کسی معاشرے کی سیادت و رستگاریِ حیات، معروف کے لئے کوشش اور منکر کے خلاف جہاد میں گروی ہے، اور وہ لوگ جن کا ''خدا پر ایمان'' ہے، لیکن ''عمل'' کے سلسلے میں عاجز اور قومی امر و نہی کی مسئولیت سے گریزاں ہیں، خدا پر ان کا ایمان انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا!

اور موجودہ دنیا کی سرنوشت، اس سبق کو بڑی تلخی سے ہمیں سکھاتی ہے!

اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے جہاں ''برترامت'' کی بات کی ہے وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مقدم رکھا ہے۔

پھر کیوں خدا نے ''اپنے اوپر ایمان'' کو نیز، ان دونوں امور پر اضافہ کیا ہے، ہر چند امر و نہی کے بعد سے؟

جانِ سخن اور عظیم ترین درس اسی میں ہے۔

''جی ہاں، ہدف؟ لوگ! مسئولیت؟ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر!''

لیکن صرف وہی لوگ صحیح طور پر دنیا میں ''بہترین امت'' کو تشکیل دے سکتے ہیں'' اور صرف وہی امت ''صحیح طور پر پورے اخلاص کے ساتھ'' لوگوں کی خاطر قیام کر سکتی ہے، کہ جو اپنی تمام روحی اور مادی فردیت کی بندشوں اور وابستگیوں سے باہر آئے اور لوگوں کو نجات سے ہمکنار کرنے کے لئے ساری عوام دشمن طاقتوں کے خلاف خروج کرے اور اس قیام میں اس کا ہدف صرف اور صرف عوام ہوں، اور لوگوں کے لئے جسورانہ نہیں بلکہ رہبرانہ ذمہ داری کو ادا کرے، کہ ''خدا پر اس کا ایمان ہو''

زبان کے اعجاز کو دیکھئے! ایک طرف وہ، عمل اور سماجی مسؤلیت کو مذہبی ایمان و ذہنیت پر مقدم کرتا ہے، اس لئے کہ وہ عینیت اور عمل پر تکیہ کرنا چاہتا ہے، اور دوسری طرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ بہترین ''عمل'' خالصانہ ترین سماجی مسئولیت اور عوام کی راہ میں کوشش و جہاد ''خدا پرستی'' کی لازوال اور شکست ناپذیر طاقت کے منبع سے غذا حاصل کرتا ہے، اور سچا خدا پرست ہی سچا عوام دوست اور مخلص نجات دہندہ ہو سکتا ہے!

وہ شخص کہ جو عوام الناس کی سعادت و آزادی کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش

کرنے کے لئے حتیٰ عام لوگوں تک سے کسی شکر گزاری، حق شناسی اور منت پذیری کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ آکر ایک سورما اور ایک فخر قوم کے عنوان سے اس کی قبر پر پھولوں کا گلدستہ سجائیں اور شہید کے نام سے اسے یاد کریں، وہ نیز صلہ بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ اس نے اپنے ''شہید'' پیغمبر سے سیکھا ہے کہ: ان اجری الا علی اللہ!

اور سوا اس امت کے کہ جو اپنی زندگی میں خدا پر ایمان سے قوت وغذا حاصل کرتی ہے اور اس عظیم ہستی کے اندر اس کی برتر قوت کی تکیہ گاہ پر تکیہ کئے ہوئے ہے، وہ کونسا گروہ ہے کہ جو دنیا بھر کے لوگوں کی نجات کے لئے ''اخلاص'' کی بلندترین چوٹی پر ''ایثار'' کا تجربہ کرے؟

آج کی دنیا کے حلِ تضاد میں ہماری غلطی یہ رہی ہے کہ ہم ''ملحد مجاہدین'' کو ''مومن قاعدین'' کے ساتھ پرکھ رہے ہیں اور مسئلہ کے حل سے عاجز ہیں۔ اور یہ جانچ منطقی طور پر غلط ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم ''ملحد مجاہدین'' کو ''مومن مجاہدین'' کے ساتھ پرکھیں۔ اس وقت ایک ''ملحد مجاہد'' نیز، خود معترف ہوگا کہ لوگوں کی نجات کی راہ میں اپنی ذات کے ایثار اور اپنی جان کے انفاق کے لئے ''خدا پر ایمان''، اعتقادی جہاں بینی اور منطقی اساس زیادہ سازگار شے ہے، اس لئے کہ ایک ''خدا پرست''۔۔۔ کہ جو دنیا کو صاحبِ احساس وشعور وقانون ومنطق پاتا ہے اور خود کو ایک زوال ناپذیر ''عمل'' کہ جو اس ہستی سے نہیں مٹتا۔۔۔ ''خدا'' اور ''معاذ'' سے جو قوت حاصل کرتا ہے، خلق خدا کی حیات اور اپنی ذمہ داری کی راہ میں موت کو اس قدر فطری اور آسان سمجھتا ہے کہ جس کے انتخاب میں وہ حتیٰ دلیری کا احساس بھی نہیں کرتا اور اس کے ساتھ مقابلہ کو حقیر تر سمجھتا ہے کہ دلیری کی ضرورت پیش آئے۔

اور ہمیں معلوم ہے کہ آگاہ اور مسئول خدا پرستوں میں ایک ''شہید'' اس طرح جی سے گزرتا ہے جیسے وہ ''نماز کے لئے کھڑا ہے''!

اور یہی وہ لوگ ہیں کہ جو: ان سارے آگاہ انسانوں، مجاہدوں، آزادی کے متوالوں اور ان تمام لوگوں کے مقابل ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے والوں کے درمیان کہ جنہوں نے بنی نوع انسان کے لئے قیام کیا ہے ''بہترین امت'' ہیں۔

وہ بہترین امت کہ جو بنی نوع انسان کی راہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں''۔

اور ''خدا پر ایمان رکھتے ہیں''!

اس لئے کہ ''خدا پر ان کا ایمان ہے''!

اس آیت میں جو خوبصورت اور دلپسند نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ آیت اعتراف کرتی ہے کہ ایسی اور بھی امتیں رہی ہیں کہ جنہوں نے عوام الناس کے لئے خروج کیا ہے، لیکن یہاں بات ''بہترین امت'' کی ہے،

وہ بہترین امت کہ جس نے ''نوع بشر'' کے لئے قیام کیا ہے۔

اس آیت اور نیز اس سے پہلے کی آیت۔۔۔''**ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر، ویامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر، وا ولئک ھم المفلحون**''۔۔۔میں ''امت'' کو معنی اور مصداق کے اعتبار سے بھی اور اس کی اصلی مسئولیتوں اور وجودی فلسفہ کے اعتبار سے بھی اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ آج اس کے اعلیٰ ترین اعتقادی مفہوم میں اسے ''حزب'' (گروہ) کہا جاتا ہے اور اس بنیاد پر اب میری گفتگو کا اصل موضوع۔۔۔شیعہ ایک حزب تمام (شیعہ ایک کامل گروہ)

۔۔۔کھل کر سامنے آگیا ہے۔

اب جبکہ ہم نے امت (حزب) کے مفہوم و مصداق اور مسئولیتوں اور روشوں کو معین کر دیا ہے تو پھر اس امت کے خود سے رابطے کی طرف آتے ہیں:

"ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ، وانا ربکم، فاعبدون"!(انبیاء... ۹۲)

"یہ ہے تمہاری امت، امتِ واحدہ، اور میں تمہارا رب ہوں، میری عبادت کرو"۔

"عبادت بھی ان عمیق اور عمل کو وجود میں لانے والے مفاہیم میں سے ہے کہ جو موجودہ صورت میں اپنی وسعت، بلکہ "درجہ مفہوم" کے نقطہ نظر سے گر کر فقیر ہو گیا ہے۔ ☆

میں نے "دعا" کے موضوع پر اپنی گفتگو میں "عبادت" کے مفہوم کو پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ "عبادت"، "عبد" سے نکلا ہے جس کا مفہوم سڑک کو کوٹنے اور اسے ہموار کرنے کے ہیں۔ "عبد الطریق" یعنی "سڑک ہموار ہوگئی"۔

اس بناء پر "عبادت"، "اپنے" تصرفات (ستم شعاریوں) اور ناہنجاریوں کو کوٹنا اور ہموار کرنا ہے تاکہ انسان، ہستی پر حاکم ارادے کے زیر قدم ایک سیدھی اور ہموار راہ بنے، تاکہ "حقیقت" ایک پرسکون نہر کی طرح انسان کی وجودی گزرگار سے گزر جائے، آدمی عبادت کے ضربات سے اپنے آپ کو سچائی، ایمان، اور "حق" کی سلطنت کے آگے کوٹے، کچلے اور "راہ" کرے!

اب میں لفظ "ملت" کے بارے میں نیز، کہ جو قرآن کی بنیادی اصطلاحوں میں سے ایک اصطلاح ہے، کسی قدر اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ لفظ

☆......ملحقات نمبر ۱ سے رجوع فرمائیے

قرآن میں تقریباً سات، آٹھ بار آیا ہے، ☆ کہ جس کا ذکر زیادہ تر ''ملت ابراہیم'' یا ''ملت اسحٰق و یعقوب'' کے عنوان سے ہوا ہے۔

''ملت ابراہیم'' اس مکتب کے عنوان سے آیا ہے کہ رسول اسلامؐ اس مکتب کو جاری رکھنے والے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ملت ابراہیم وہ مکتب ہے جسکی طرف آغازِ رسالتِ توحید سے پیغمبر اسلامؐ تک سارے انبیاء اس ''ملت'' کو بلاتے رہے ہیں، اور اس بناء پر سارے انبیاء نے، ہر دور میں، اور ہر قوم میں بشریت کو ایک ''ملت'' کی دعوت دی ہے، گو کہ ان سب کی ''شریعت'' ایک دوسرے سے مختلف رہی ہے۔

اس مفہوم میں کہ ہر وہ پیغمبر جو اپنی قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتا رہا ہے اس کی شریعت اس کے زمان و مکان اور ماحول کی گوناگوں صورتحال کے مطابق رہی ہے۔ ہر دور کا سماجی نظام، اس کی معاشی بنیاد، اس کی تاریخی مناسبت، اس کی فکری اور اخلاقی انحراف کی صورت اور اس کا تمدن و ثقافت، اس شریعت کا تقاضا کرتی ہے کہ جو ماحول کے شرائط اور زمانے کی عینی واقعیتوں اور لوگوں کی بنیادی ضرورتوں کے مطابق ہو اور یہی وجہ ہے کہ پہلے اور بعد میں آنے والے پیغمبروں کی شریعت ایک دوسرے سے مختلف رہی ہے۔ بہر صورت ہر شارع۔۔۔ خواہ وہ افریقہ یا ایشیا کے کسی کونے میں، کسی چھوٹی سی پسماندہ قوم کے درمیان ایک معین مدت کے لئے مبعوث ہوا ہو، یا شارع اسلام کہ جو خاتم النبیین بھی ہے اور عالمی رسالت کا حامل بھی۔۔۔ ایک ''مشترک دعوت'' اور ایک واحد جہت و جہاں بینی کا حامل رہا ہے کہ جسے۔۔۔ ایک

☆..... کل دس بار آیا ہے (اردو مترجم)

ممتاز ترین تاریخی شخصیت کے نام سے کہ جس نے اس راہ میں عظیم ترین اور طاقتور ترین تحریک کا آغاز کیا ہے۔۔۔ ''ملت ابراہیم'' کہا جاتا ہے۔

مکتب ابراہیم کے پیروکاروں میں سے ایک پیروکار کہ جو اس صحرا کی اس ذلت میں، اس ملت کی عزت کا شیفتہ ہے اور قرآن کو سمجھتا ہے، اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی ''ملت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اسی مفہوم کو پیش کرتا ہے جسے آج آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس مفہوم میں کہ ابراہیمؑ کی ''ملت''۔۔۔ کہ جس کی طرف تاریخ کے سارے پیغمبروں اور عوام الناس کی عدالت و نجات کے سارے ہدایت کرنے والوں نے ہر زمانے اور ہر نظام میں بنی نوع انسان کو دعوت دی ہے ۔۔۔''ابراہیم کی آئیڈیالوجی'' ہے۔

میں فی الحال اس استنباط کا، تقریباً، معتقد ہوں، اور آپ کو بھی اختیار ہے کہ اسے مانیں یا نہ مانیں، بالکل میرے دیگر نظریات اور باتوں کی طرح، جنہیں آپ پڑھتے یا سنتے آئے ہیں۔☆

(یہ جو میں نے تقریباً کا لفظ استعمال کیا ہے، اس رو سے ہے کہ میں خود، ''کتاب'' کو ''آئیڈیالوجی'' کے مفہوم میں لیتا تھا لیکن اس کے توجہ دلانے کے بعد میں نے اس کے نظریہ کو پسند کیا، تاہم ابھی تک ''کتاب'' سے میرا دل نہیں ہٹا ہے بالکل اس شخص کی طرح کہ جو کسی چیز کو چھوڑ تو دیتا ہے لیکن ابھی اس کا دل اسی میں اٹکا رہتا ہے اور وہ ہر چند قدم کے بعد پلٹ پلٹ کر اسے دیکھتا ہے!)

☆......آپ بھی ''معجم المفهرس'' یا ان قرآنوں کی مدد سے جو کشف الآیات کے حامل ہیں ''تفسیر'' اور ''عقل'' سے رجوع کیجئے۔ اس بارے میں تحقیق و تفکر سے کام لیجئے، شاید آپ کسی بہتر نتیجہ تک پہنچ سکیں۔

ممکن ہے ''ملت'' کو ''تحریک'' کے مفہوم میں لیا جائے، لیکن ''تحریک'' وہ لفظ ہے جو زیادہ تر ''حرکت **(Movement)**'' کے مفہوم کو نمایاں کرتا ہے نہ کہ مکتب کو، جبکہ ''ملت'' اس سے زیادہ شاداب تر اور عمیق تر ہے کہ وہ (تحریک کے) اس لفظ کے سادے برتن میں سمائے۔

اگر ہم اس کو ''مکتب'' کے مفہوم میں لیتے ہیں تو یہ آئیڈیالوجی کے مفہوم سے قریب تر ہو جاتا ہے، لیکن یہاں بھی آئیڈیالوجی کی نسبت، مکتب کا لفظ گہرائی سے خالی ہے، اس لئے کہ اہل منطق حضرات کی اصطلاح کے مطابق، یہ ''جامع'' ہے مگر ''مانع'' نہیں، یعنی آئیڈیالوجی کے مفہوم کو اپنے اندر سمیٹتا ہے لیکن آئیڈیالوجی کے علاوہ دیگر مفاہیم کو اس میں آنے سے نہیں روکتا، اس لئے کہ ''مکتب''...... ادبی، ہنری اور علمی فلسفی مکتب کے مفہوم میں بھی ہو سکتا ہے کہ جو آئیڈیالوجی نہیں اور یہ یہاں ''ملت'' کے مفہوم کے ساتھ نہیں جڑتا۔

مثلاً ڈارون، حیاتیاتی مکتب کا حامل ہے، افلاطون، فلسفے میں ایسے مکتب کا حامل ہے جو ارسطو کے مکتب سے مختلف ہے۔ ''جورج سعید'' یا ''شیگل'' ایسے مکاتیب کے حامل ہیں کہ جو ''داونیچی'' اور ''مائکل آنژ و رامبراند'' کے کلاسیکی مکاتیب سے مختلف ہیں......

اس معنی میں ''آئیڈیالوجی''...... دین اور ان پیغمبروں کے ساتھ کہ جو اولوالعزم بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی، نزدیک ترین فاصلہ پیدا کرتی ہے ''مکتب'' سے بھی نزدیک تر، اس لئے کہ ''آئیڈیالوجی'' ''روشن خیال'' بناتی ہے، لیکن ''مکتب''...... فیلسوف، عالم، اور ہنرمند وغیرہ بناتا ہے...... دوسرے لفظوں میں ارسطو جیسا عالم و

فلسفی، ایک ایسے مکتب کو نمودار کرتا ہے کہ جو زیادہ تر ابو علی سینا، غزالی، اور ان جیسے لوگوں کی پرورش کرتا ہے، جبکہ جناب ختمی مرتبتؐ ایک ایسی آئیڈیالوجی کو معرض وجود میں لاتے ہیں کہ جو ''توابین'' اور ''سر بہ کف'' لوگوں کو جنم دیتی ہے اور علیؑ، حسینؑ، ابوذر، دعبل، اور کمیت جیسی عظیم الشان ہستیوں کی پرورش کرتی ہے۔

آئیڈیالوجی وہ ایمان ہے کہ جو ''خود آگاہی''، ''ہدایت''، ''رستگاری''، ''کمال''، ''منزلت''، ''امنگ و آرزو'' اور ''مسئولیت'' کے مفاہیم کی اساس پر استوار ہے۔

فلسفہ اور علم : ''مظہر شناسی'' کرتے ہیں

آئیڈیالوجی : ''پرکھتی'' اور اچھائی اور برائی کو سامنے لاتی ہے

فلسفہ اور علم : ''معرفت'' کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتے

آئیڈیالوجی : ''ہدایت'' سے رشتہ جوڑتی ہے

فلسفہ اور علم : فطرت، سوسائٹی اور انسان کے مقابل ''آئینہ'' ہے

آئیڈیالوجی : ایک ''ہاتھ''!

فلسفہ اور علم : ...... ''آگاہی'' ہے،

آئیڈیالوجی : سچی اور تمام، ''خود آگاہی'' سے مفہوم پاتی ہے

فلسفہ اور علم : ''اقدار'' کی توجیہ کرتے ہیں

آئیڈیالوجی : اقدار کو کھینچتی اور اسے وجود میں لاتی ہے

فلسفہ اور علم : تمہاری تشریح اور تمہاری دریافت کرتے ہیں

آئیڈیالوجی : تمہیں خلق کرتی ہے

فلسفہ اور علم : فلسفی اور عالم بناتے ہیں

آئیڈیالوجی : ''روشن خیال مجاہد''۔

فیلسوف اور عالِم، اس عالم بسیط کے تماشابیں ہیں اور آئیڈیالوج (Ideologue)، وہ مدعی جو خدا کی جگہ کھڑا، امر و نہی کر رہا ہے، اچھائی اور برائی کی بات کر رہا ہے، بتا رہا ہے، بگاڑ رہا ہے، تنقید و تصحیح کر رہا ہے، راہ متعین کر رہا ہے اور جہت و اصول و مقصد......

آئیڈیالوجی کے مفہوم میں ۔۔۔ ذہنی طور پر ۔۔۔ قرار پانے والے سارے عناصر وہی ہیں کہ جو دین کے کامل مصداق کو تشکیل دینے والے ہیں:

آئیڈیالوجی کو اس کے اعلیٰ ترین، متمدن ترین، اور کامل ترین مفہوم میں ۔۔۔ اس طرح نہیں جیسا کہ ہے بلکہ اس صورت میں جس طرح کہ آگاہ لوگ اور آج کے ترقی پسند، مسئول، انسان دوست اور کام میں سبقت لیجانے والے روشن خیال افراد اپنے ذہن میں پروان چڑھاتے ہیں ۔۔۔ اس دین کے ساتھ کہ جو اپنی کامل ترین شکل میں اجاگر ہوا ہے اور ''ہے'' موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ انسانی آئیڈیالوجی، اسلام کے ساتھ، کامل ترین دین الٰہی کے عنوان سے کس طرح بہ یک زبان بات کرتی ہے۔

بنیادی اصطلاحوں کو کہ جو ہر ایک کے اصلی عناصر کی مبیّن ہے، دونوں میں تلاش کیجئے، اور حیرت سے دیکھئے کہ آج کا ذمہ دار روشن خیال آدمی، اسلام کے ساتھ کس حد تک مشترک زبان کا حامل ہے۔ دونوں میں اصطلاحات ۔۔۔ بعض مفہوم میں اور بعض حتیٰ لفظ میں ۔۔۔ ایک ہیں:

آئیڈیالوجی : پیام ۔ رسالت ۔ فریضہ ۔ مسئولیت ۔ مبارزہ ۔ لوگ!

اسلام : دعوت ۔ رسالت ۔ تکلیف ۔ مسئولیت ۔ جہاد ۔ ناس!

آئیڈیالوجی : مساوات ۔ عدل ۔ طبقاتی فاصلہ کی نفی ۔ اصالتِ انسان ۔ انسان خدائے ہستی ۔

اسلام : قسط ۔ عدل ۔ انفاق ۔ تفویض یا ھبوط ۔ انسان ہستی میں خدا کا جانشین ۔

آئیڈیالوجی : انقلابی پارسائی ۔ انفرادی مالکیت کی نفی ۔ معاشرے کی مالکیت ۔ رہبری ۔ سرمایہ داری ۔ سرمایہ پر سود نہیں ۔

اسلام : زہد ۔ انفرادی مالکیت کی نفی ۔ خدا کی مالکیت ۔ امامت ۔ کنز ۔ ربا (سود) خدا سے جنگ ہے

آئیڈیالوجی	:	معاشی اصالت۔ بیگاری۔ پیسے کے پجاری انسان میں الینیشن یا پیسے کے دیو کا حلول، اخلاقی سوشلسٹ حضرات: بورژوازی نظام میں انسان
اسلام	:	اصالت معاش۔ استضعاف۔ "یتخبطه الشیطان من المس"، قران: سود خور کی دولت پرستی کے بارے میں۔
آئیڈیالوجی	:	پست بورژوازی زندگی۔ اخلاق و معنویت معاش کی اساس۔ استثمار کی نفی۔
اسلام	:	دنیاوی پست زندگی۔ من لا معاش له. لا معادله. اصل "لا ضرر ولا ضرار"۔
آئیڈیالوجی	:	فقر، برائی کی جڑ۔ پیداوار، منبع پیداوار کا نہیں، اس بازو کا ہے جو پیداوار بہم پہنچاتا ہے۔ تاریخ کا آخری انقلاب۔۔۔ آنے والے زمانے پر ایمان۔ موعود کا طبقہ سے خالی معاشرہ۔

اسلام : کا دالفقران یکون کفرا. الزرع للزارع ولو کان غاصبا۔ آخرالزماں کا انقلاب۔ انتظار۔ موعود کا تضاد سے عاری معاشرہ۔

آئیڈیالوجی : عوام کی حکومت۔ شوریٰ اور رائے۔ دوران انقلاب اونچی سطح سے رہبری۔ رازداری۔

اسلام : اجماع کی حکومت۔ شوریٰ اور بیعت۔ وصایت۔ تقیہ

آئیڈیالوجی : تنظیماتی اطاعت

اسلام : تقلید

لیکن اس شناخت کو پورا کرنے کے لئے ہم یہاں تک پہنچتے ہیں کہ اب انسانی آئیڈیالوجی یہاں آکر خاموش ہو جاتی ہے، لیکن ابھی اسلامی آئیڈیالوجی کے پاس کہنے کی اور بھی باتیں ہیں:

اسلام : غیب، اخلاق، عشق، رستگاری، پاداش، کیفر، معاد، بقا

آئیڈیالوجی : مادی آئیڈیالوجی یہاں، ذہنی آئیڈیالسٹ ہے، اس لئے کہ اس شخص کے جواب میں جو یہ پوچھتا ہے کہ: کیوں میں دوسروں کے لئے اپنی جان نثار کروں؟ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ''دلیرانہ احساسات'' پر تکیہ کرے!

لیکن فلسفہ اور علم...... وہ شناخت کہ جو اصل پر استوار ہے اور وہ عینیت کے ساتھ ذہنی رابطہ ہے۔

آئیڈیالوجی کی نگاہ، ایک حقیقت پسندانہ نگاہ ہے، اور فلسفی یا علمی نگاہ، واقعیت طلبانہ، آئیڈیالوجی، مسئولیت آور ہے یعنی وہ ''تکلیف'' اور ''ذمہ داری'' عائد کرتی ہے، اس لئے کہ تعصب (مقید ہونا)، اس کی ذاتی خصوصیت اور اس کا حتمی نتیجہ ہے، جبکہ فلسفہ اور علم ذاتی طور پر لاابالی ہیں، آئیڈیالوجی کہتی ہے: ''اس طرح ہونا چاہئے'' اور فلسفہ اور علم صرف یہ بتاتے ہیں کہ ''اس طرح ہے''۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام، نوع بشر کے لئے ایک ''مکتبِ ہدایت ونجات''، ایک ''پیام'' اور ایک ذمہ داری کے عنوان سے آئیڈیالوجی کی صف میں آتا ہے، نہ کہ فلسفہ و علم و ہنر و ادب و صنعت وغیرہ کی صف میں۔ تاہم ایک ایسی آئیڈیالوجی جو حقیقی اور کامل ہے۔ وہ ''عوامی'' آئیڈیالوجی کہ جو ''خدائی'' اصل سے وابستہ ہے۔

''آئیڈیالوجی'' سے ...... ''منجمد''، ثابت، اور موروثی و عادتی سانچوں اور معاشرے کی ناخود آگاہ روایتوں کے مجموعے میں، اسلام کی تبدیلی نے --- کہ جو عوام الناس کا خاصہ ہے --- اسے پست اور عوام پرست کر دیا ہے اور ساتھ ہی عوام نے نیز ناخود آگاہ رجعت پسندی اور روایتی انحطاط میں اس کی تقویت وتثبیت کی ہے، (زوال یافتہ معاشرے کے درمیان ایک متقابل اور ڈیالکٹیکی رابطہ)۔

اور نیز ''آئیڈیالوجی'' سے، خصوصی علوم وفنون وفلسفہ پر مبنی ثقافتی مجموعے میں اسلام کی تبدیلی نے اسے ایک فلسفی سوچ اور علمی کردار کا حامل بنایا ہے اور فطری طور پر اس بات نے اسے دیگر علمی اور فلسفی مکاتیب اور ایک ثقافتی پشتارہ کی طرح، متن زندگی

، زمانے کی رہبری اور معاشرے کی حرکت کی راہ سے، فلسفی تفکر، علمی تخصص، فنی تعقل اور ذہنی اور کلامی مباحث کی طرف کھینچا ہے۔ اور اسی بنا پر اس نے نوع بشر کی سرنوشت کے مقابل حساسیت، دکھ درد کے احساس، ضرورتوں کی شناخت، لوگوں کی رستگاری اور نجات کی راہ میں، روح حرکت و جہاد و آرزومندی و عدالت خواہی اور زمین کے مظلوم و مستضعف لوگوں پر مبعوثیت، اور نیز ذاتی ذمہ داری یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بیگانگی اختیار کی ہے، اس طرح کہ اب وہ متن حیات و حرکت و ہدایت سے اپنی غیبت کو محسوس تک نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ آج جب ہم جیسے لوگ، ذمہ دار افراد کی اپنی بنیادی ترین مسئولیتوں سے ۔۔۔ کہ جو ان کا وجودی فلسفہ ہے ۔۔۔ دوری و عزلت و بیگانگی کے خلاف درد و دعوت و اعتراض کی صدا بلند کرتے ہیں تو مورکھ لوگ حیرت زدہ نکل آتے ہیں کہ، کیوں، کیا ہوا؟ کیوں یہ ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے؟ کیوں ''علماء'' کی اہانت کر رہے ہو؟ کیوں ان لوگوں پر اعتراض کر رہے ہو جنہوں نے بحث و درس و فقہ و اصول و حکمت اور دینی علوم میں ایک عمر صرف کی ہے؟

اور سچ بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ ایک مذہبی دانشور، ایک مذہبی عالم، اور ایک مذہبی فقیہ وغیرہ ہونے کے عنوان سے وہ مقدس اور محترم ہیں، اور ان کے کام کی قدر و منزلت اس سے سوا ہے کہ کوئی ان پر اعتراض کرے یا کسی کو ان پر حقِ اعتراض ہو، اس لئے کہ علمی اور فلسفی نقطہ نگاہ سے یہ ہستیاں ہماری دینی اور علمی ثقافت کے اعلیٰ ترین چہرے ہیں۔

لیکن اگر ہم آئیڈیالوجیکی سوچ اور اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں ۔۔۔ کہ جو اسلام بہ عنوان ثقافت نہیں، بلکہ بعنوان ذمہ داری، پیام، ہدایت، اور راہ نجات و رستگاری و

عدالت وغیرہ ہے۔۔۔ تو ہمیں دکھائی دیگا کہ سارے آئیڈیالوجیز کا وجود ہے اور یہ آئیڈیالوجیز احساس وایمان ومسئولیت وآگاہی میں اور ساری واقعیتوں، سارے دکھوں، ساری ضرورتوں میں، ہماری زندگی، ہمارے روشن خیال گروہ، ہماری عوام اور ہماری نوجوان نسل کے درمیان دعوت ویکجائی وکوششوں میں مصروف کار ہیں، حتیٰ انحرافی، غیر مہذب بلکہ نیھلیسزم اور لاابالی وبیہودہ گری والی آئیڈیالوجیز تک میں بھی......لیکن اسلام ہے کہ غائب ہے۔ اسلام کے دو حصے کردیئے گئے ہیں، ایک حصہ وہ ہے کہ جس میں پسماندہ عوام کے لئے ناآگاہانہ موروثی اور تکراری شعائر اور مراسم و عبادی احکام کو صورت دی گئی ہے۔ اور دوسرے حصے میں، وہ مدرسے ہیں جن میں خاص علمی موضوعات کو معین کیا گیا ہے، بقول بعضے، ''اہل فن'' کے لئے! فنی اسلام! کا انتظام کیا گیا ہے۔

پھر وہ اسلام کہ جو ایک صحرا نورد بدوی کو۔۔۔ بغیر کسی فنی، فلسفی، علمی اور خصوصی تعلیمات کے۔۔۔ توحید کی ایک آواز، رسالت کی ایک روشن آگاہی اور نیز انسانی خودآگاہی بیدار کرتی تھی اور وہ برافروختہ ہوکر زمانے کے آگے فریاد بلند کرتا تھا اور ''ابوذر'' ہو جاتا تھا، کہاں ہے؟ ہمیں اس کا پتہ کہاں سے لگانا ہوگا؟ کس سے اور کس طرح اسے سیکھنا ہوگا؟

پوسٹ بکس نمبر؟ سے کون یہ اشتہار دے گا کہ ''جس موضوع پر جو سوال پوچھنا چاہیں، پوچھیں اور جواب حاصل کریں''؟

جی ہاں، اسلام نیز ایک ''علم'' ہے۔ لیکن جس علم کا اسلام ذکر کرتا ہے وہ نہ فزکس ہے نہ فقہ اور نہ ہی عمرانیات! ان سب کو ایک فرنگی مستشرق بھی اپنے علمی مضمون کے

عنوان سے منتخب کرسکتا ہے۔ اسلام جس علم کی بات کرتا ہے وہ کسی خاص مضمون کے خاص قواعد کی لڑی پر کسی ذہن کی فنی اطلاع نہیں ہے بلکہ وہ ''نور'' ہے، ''العلم نور یقذفه الله فی قلب من یشاء''۔ یہ وہ نور ہے جو دل کو روشن کرتا ہے۔ یہ کوئی فنی آگاہی نہیں، خود ایک فطری آگاہی ہے، روشن خیالی ہے (نور)، احساس مسئولیت ہے، شناخت راہ ہے اور علم ہدایت بھی ہے۔

میں نے بارہا کہا ہے: ''مذہبی پیشوا'' کا مفہوم، اسکا مصداق بلکہ اس کے الفاظ بھی یورپ سے آئے ہیں، اور یہ ابھی کی بات ہے، بو، ٹائی، اور مغرب پرستی کے دیگر مظاہر کے ساتھ۔ ☆ ان لوگوں نے ہماری دنیا کو اپنی سرمایہ داری سے اور ہمارے دین کو اپنی کلیساؤں سے آلودہ کیا، ہمارے متجددین کو۔۔۔ تمدن کے نام سے۔۔۔ بھانڈپن، اچھلنا، کودنا، ناچنا، کاکٹیل پارٹی، شرابخوری، اور آزادی میں فقط جنسی آزادی سکھائی، اور ہمارے ان متقدمین کو جن کو کہ ایمان اور رواجی و دینی تعصب کا حصار روکے ہوئے تھا دین کے نام سے، ان خرافات کو جو ان کے قرون وسطی کی تراشی ہوئی تھیں آہستہ سے ان میں اور ہمارے ذہن وقلب کی گہرائی میں اتارا اور ہمارے مذہبی، منطقی، عملی، اور ترقی پذیر ایمان اور نیز روح وشفاعت وتوسل وولادیت وشہادت کو غارت کیا۔

ہمارے پاس ''اسلامی دنیا'' ہے کہ جو اسلام شناس ہے بالکل عالم فطرت کی طرح کہ جو فطرت شناس ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ، کہ اسلامی دنیا، آئیڈیالوجی کی ایک دنیا ہے۔ اس کے پاس علم ہدایت ہے اور نتیجتاً مسئولیت کا حامل ہے۔ وہ ارسطو،

☆..... ایران میں علماء نے بو اور ٹائی لگانے شروع کر دیے تھے (اردو مترجم)

افلاطون، بطلیموس اور اپیکور کی داناییوں اور ان کے افکار کا وارث نہیں، وارث ابراہیمؑ وموسیٰ وعیسیٰ ومحمدؐ ہے! اس کے علم کا موضوع، فلسفی ذہنیات، عرفانی احساسات اور علمی و فنی اطلاعات نہیں ہے، اس کے علم کا موضوع ''ملت ابراہیم'' ہے۔

رسول اسلامؐ اس بات کو پہچنواتے ہیں کہ: میری امت کے علماء، بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے برتر ہیں۔

''امت'' کے مفہوم و مصداق کو اب ہم نے اسلام کی زبان میں سمجھا ہے: ''بہترین'' فکری فرض شناس گروہ، وہ کہ جس نے لوگوں کے لئے قیام کیا ہے، ایسے گروہ کے درمیان، ایسی امت سے وابستہ عالم! اسلامی عالم ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہاں امت کے علماء کا موازنہ پیغمبروں سے ہوا ہے نہ کہ فیلسوفوں اور دانشوروں سے! یہ نہیں کہا کہ وہ علماء یونان اور حکماء ہند وچین سے برتر ہیں۔

اس بنا پر بات ایک پیغمبرانہ علم کی ہے، پس، عالم کو بھی پیغمبر صفت ہونا چاہئے۔

یہ عالم کون ہے؟

پھر یہ خود رسول اسلام ہی ہیں جو اسے پہنچواتے ہیں کہ: علماء، وارثان انبیاء ہیں''! انبیاء نے ورثے میں کس چیز کو چھوڑا ہے؟ فلسفہ کو؟ تصوف کو؟ طبیعیات اور انسانی علوم کو؟ نہیں! انبیاء میں سب سے بلند و بالا درجہ ہمارے پیغمبر کا ہے جو ''امی'' ہیں۔ رسولوں نے ''پیغام'' کو میراث میں چھوڑا ہے، انہوں نے رسالت کو اپنی جگہ باقی رکھا ہے۔

جن چیزوں کو وہ لائے ہیں، جن راہوں پر وہ چلے ہیں اور جس مسئولیت کو انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

یہ چیزیں کیا ہیں؟ قرآن نے بڑی وضاحت سے اس کی نشاندہی کی ہے:

''انا ارسلنا بالبینات، و انزلنا معھم الکتاب و المیزان، لیقوم الناس بالقسط ......'' ☆

امت کا عالم! وارثِ ''شفا'' و ''اسفار'' نہیں، وارث ''کتاب'' و ''ترازو'' ہے، وہ بھی دانشگاہ یا حوزہ کے بحث و درس کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ لوگوں کو قسط (عدل) پر قیام کے لئے حرکت میں لائے اور ہدایت کرے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مسئولیت کے فریضہ میں اس ''بہترین امت'' کی مدد کرے کہ جس نے نوع بشر کے لئے خروج کیا ہے۔

اسلامی عالم، یعنی ''روشن خیال، اسلام فہم مسئول'' کہ جس کا اپنی قوم اور اپنے زمانے میں ایک فیلسوفانہ، عالمانہ، اور ادیبانہ کردار نہیں بلکہ ''راہبرانہ کردار ہو۔ ہمیں علم ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اور اب اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاتمیت وحی کے بعد انبیاء کی راہ کو لے کر آگے چلے۔ وہ ایک ایسا رہبر ہے کہ جو اپنے پیغام کو، انبیاء سے لیتا ہے، وہ پیغام رساں ہے کہ جس نے رسولوں کی رسالت کو وراثت میں لیا ہے۔ اس کا جبرئیل، محمدؐ! اس کی کتاب قرآن، اس کا ''شہید'' محمدؐ اور اس کا امام علیؑ ہے۔ وہ اپنے محدود زمانے میں اپنی قوم کے لئے پیغمبری کرتا ہے اور قوم یہود کے سارے پیغمبروں سے افضل ہے۔

☆...... ''ہم نے اپنے رسولوں کو بینات (روشن دلیلوں) کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ ''کتاب'' اور ''ترازو'' کو نازل کیا تاکہ لوگ عدل اور مساوات پر قیام کریں''، اور فوراً ہی اس کے بعد کہا: ''و انزلنا الحدید، فیہ باس شدید و منافع للناس''! اور ہم نے لوہے کو نازل کیا کہ جس میں (آلات حرب کے لئے) شدید سختی اور نیز لوگوں کے لئے نفع (کی باتیں) ہیں! (کتاب۔ ترازو۔ آہن) (سورہ حدید...... آیت ۲۵)

چونکہ اس نے ان کے کام کو اپنے ذمہ لیا ہے، اس لئے پیغمبری کرتا ہے مگر وہ پیغمبر نہیں بلکہ ایک ایسا واقف کار روشن خیال مسئول ہے کہ جس نے پیغمبروں کی رسالت کے بھاری بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ ایک سادہ انسان ہے، نہ آسمان اس سے باتیں کرتا ہے اور نہ جبرائیل اس کے ان دکھوں کو کہ جو ہر صاحب رسالت کی سرشت میں ہے، تسکین بخشتا اور اس کی دلداری کرتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں خدا کی کتاب، دوسرے میں محمدؐ کی تلوار، سامنے ''ترازوئے'' عدالت اور علیؑ کے ''دشمن''، ''قاسطین''، ''ناکثین''، ''مارقین''...... صِفّینوں، جَمَلوں، اور نہروانوں میں ہمیشہ اور ہر جگہ اس کی تاک میں، سارے انبیاء کی وراثت کے بھاری بوجھ اس کے کاندھوں پر، اور انتہائے راہ پر خدا اس کا ناظر، اور...... جور و جہل و جوع کے منکرات کا ایک انبوہ اس کے سامنے اور...... بالآخر:

''عوام الناس''!!

سچ بتایئے کیا ایک ایسا شخص۔۔۔ اگر وہ اس راہ کو صحیح طور پر طے کرے اور اپنی رہبرانہ ذمہ داری کو ادا کرے۔۔۔ بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے افضل نہیں؟

یہاں تک ہم نے ان اصلی مفاہیم کو پیش کیا کہ:

اسلام ایک ''آئیڈیالوجی'' ہے نہ کہ ثقافت و فلسفہ و علم...... ☆

اور ''علم'' اسلام کی زبان میں نہ۔۔۔ فزکس کی طرح۔۔۔ کوئی طبیعی علم ہے، نہ۔۔۔ معاشرتی علوم کی طرح۔۔۔ ایک انسانی علم ہے اور نہ۔۔۔ فقہ و اصول و کلام

☆...... ٹیچرز ٹریننگ کالج۔ تہران، میں ''ثقافت اور آئیڈیالوجی'' کے نام سے ایک مستقل کانفرنس میں اور نیز ''قاسطین، مارقین، اور ناکثین'' نامی کتاب میں (کہ جس کا اردو ترجمہ ''شہسوار عرب کی تیغ لا'' کے عنوان سے ہوا ہے) ان دونوں کے اختلاف پر تفصیلاً گفتگو ہوئی ہے۔

کی طرح۔۔۔ رائجہ مفہوم میں کوئی مذہبی اور شرعی علم ہے بلکہ ایک ''انسانی خود آگاہی، ایک رہبرانہ حقیقت شناس، ایک روشن خیالانہ بصیرت، اور ایک شعور ہدایت اور آگاہی مسئولیت'' ہے، یہ ''علم ہدایت، ملتِ ابراہیم کی مسئولیت کی صحیح سوچ، عوام الناس کے پیغمبروں کی راہ، اور درک روح و رسالت اسلام کی بنیاد پر علم نجات و رستگاری، عالم کا توحیدی ادراک، اور ''خود''، ''خدا'' اور خلق کے درمیان ایک صحیح تشخیص ہے۔

اور بالآخر امت، وہ فکری معاشرہ اور وہ اعتقادی گروہ ہے کہ جو ایک مشترک راہ میں، امامت کی آگاہانہ رہبری کے ساتھ ''لوگوں'' کے لئے، خدا کی سمت عالم حرکت میں ہے۔

ایک ایسی امت کہ جس نے سارے بلند پایہ اقدار کے سمبلز اور اپنے سارے آئیڈیلز کو۔۔۔ ''اپنے شہید'' کے عنوان سے۔۔۔ رہبر منتخب کیا ہے تاکہ وہ خود ۔۔۔ شہید کے عنوان سے۔۔۔ ساری دنیا کے لوگوں کے لئے ایک رہبرانہ کردار ادا کرے اور اس امت کا ہر فرد، نوع بشر کے لئے ایک ''شہید'' ☆ بن جائے! اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا رہبر بنائے کہ بشریت اس کو اپنے لئے ایک شاہد کے عنوان سے رہبر قرار دے۔

یعنی محمدؐ کی امت کا ہر فرد نوع بشریت کے لئے رہبر ہو۔

اور اس طرح کی رہبریوں سے ''ایک بہترین امت'' تشکیل پاتی ہے کہ جس نے اب تک لوگوں کی رہبری (پیام آوری) کے لئے روئے زمین پر خروج کیا ہے اور

☆ ...... لتکونوا ''شہداء'' علی الناس ......

اس کی رسالت (ذمہ داری)؟ وہ رسالت ہے جسے اس نے پیغمبروں سے میراث میں لیا ہے اور اسے ''اپنے شہید (گواہ)'' پیغمبر سے سیکھا ہے:

۱۔ امر بالمعروف

۲۔ نہی عن المنکر

۳۔ اور خدا پر ایمان

اور بالآخر ہر صورت میں، ہر دور میں، ہر نظام میں، خواہ اسلام، ایک ''مثالی اور مسئول''، عظیم اعتقادی معاشرے کے مفہوم میں ایک ''امت'' کا حامل ہو کہ نہ ہو، دنیا بھر کے مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے درمیان سے ''ایک خاص امت'' کو اختیار کریں۔ اور ضروری ہے کہ یہ امت مسلمانوں کے درمیان تشکیل پائے اور مسلمان اقوام اور عوام الناس کے بیچ سے اس کی نمود ہو اور وہ ذیل کے ان اہداف کی بحالی کا ذمہ لے:

۱۔ خیر کی طرف بلائے

۲۔ ''معروف'' کی راہ میں کوشش کرے،

۳۔ ''منکر'' کے خلاف صف آرا ہو،

اور یہ ایک ''حزب'' (امت) ہے۔ پورے ترقی پسندانہ، آگاہانہ اور مکمل مفہوم کے ساتھ ایک حزب، لوگوں کی راہ میں ایک مسئول اعتقادی صورت والا گروہ کہ جو دو اصولوں پر قائم ہے:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

وہ دو اصول کہ جو اپنے اندر ان تمام باتوں کو لئے ہوئے ہیں جنہیں آج ترقی

پسند روشن خیال لوگ، خود آگاہ وجدانیں، اور پیکار جو ہستیاں، بشریت کی نجات اور ان قوموں کی رستگاری کی راہ میں پیش کرتے ہیں کہ جو ظلم و ستم اور ناروا ترجیحات کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور جو "سماجی مسئولیت" اور لوگوں کے آگے روشن خیال افراد کی مسئولیت کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں وہ باتیں بھی ہیں جنہیں ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے،

اور نیز وہ سب بھی کہ جو ہر زمانے اور ہر نظام میں آنے والے روشن خیال لوگ، اور کل کی تاریخ بشریت کے انسانی وجدان، اپنے لوگوں کے لئے۔۔۔ بعنوان معروف۔۔۔ آرزو کریں گے اور اس کے امر میں کوشاں ہوں گے،

اور۔۔۔ بعنوان منکر۔۔۔ جو المیہ وہ اپنے لوگوں میں دیکھیں گے ان کی نہی میں جہاد کریں گے!

اور دیگر معروفات اور دیگر منکرات۔

وہ امت کہ جو: نہ شرقی ہے اور نہ غربی

"اس نے عوام الناس کے لئے خروج کیا ہے"،

اور زمانے کے دھڑکنے والے قلب اور دنیا کی جمعیت کے درمیان، تاریخ کے پیغمبروں کی وراثت کو اپنے ہاتھ میں اور رسالتِ خاتمیت کے بھاری بوجھ کو اپنے کندھوں پر لے رکھا ہے، اور پھر مسئول،

تاکہ ہمیشہ والے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں، انفاقِ مال اور ایثارِ جان کرے، اور نوع بشریت کی راہ میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرے

۔۔۔ اتنی آسانی سے جتنی آسانی سے وہ نماز پڑھتا ہے۔۔۔

اور اپنی شہادت کی پاداش میں لوگوں سے اپنے نام اور اپنی یاد کا منتظر بھی نہ ہو، کہ یہ امت، خلق خدا کی ''شہید'' (گواہ) ہے اور محمدؐ اس کے شہید، یہ سب محمدؐ کی امت ہیں،

اور ان میں کا ہر ایک عوام الناس کا محمدؐ!

کہ جو اپنی قوم میں، رہبری کا فریضہ انجام دیتا ہے،

یہ وہ گروہ ہے کہ جس نے اپنے ایثار کے ساتھ، خود کو عوام سے جوڑ رکھا ہے، لیکن:

''سیاست'' سے نہیں،

بلکہ:

''عشق'' سے!

ڈاکٹر علی شریعتی

شیعہ..........

”محمدی اسلام“ کے آئینہ میں

دوسرا حصہ

ترجمہ: سید محمد موسیٰ رضوی

بسمہ اللہ الرحمن الرحیمO

آج رات☆ہمیں ایک ''خوش نصیبی'' حاصل ہے اور ایک ''بد نصیبی''!

خوش نصیبی اس بات کی ہے کہ ہم نے جناب ڈاکٹر سامی صاحب کی بصیرت افروز اور ناقابل توصیف تقریر سے استفادہ کیا اور ہمیں امید ہے کہ ہم ان، اور ان جیسے افراد کے وجود سے۔۔۔ کہ جو اس زمانے میں ہمارے معاشرے میں انتہائی ''کمیاب'' اور اس رو سے بہت زیادہ ''قیمتی'' ہیں۔۔۔ استفادہ کریں۔

میں نے ''کمیاب'' کا جو لفظ استعمال کیا، یہ اس لئے ہے کہ ہم ان دو روشن اور مشخص مرکزی مقاموں کے درمیان بے مرکز رہ گئے ہیں: کہ نہ تو ہم ''قدیم'' ''موروثی سانچوں میں منجمد رہ سکتے ہیں اور نہ ہی ہم منظر عام پر لائے جانے والے ''مسلط کردہ'' سانچوں کو تسلیم کر سکتے ہیں...... اسلئے کہ قدیم نسل کے لئے ارادہ ''عمل میں آ چکا ہے'' اور نئی نسل کے لئے ''عمل میں لایا جارہا ہے''۔۔۔ اور اس رو سے ہم نے اپنے ارادہ و ''انتخاب'' کی تشخیص کو خود اپنے اوپر لیا ہے تاکہ ہم دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنی سرنوشت کی راہ کا آغاز خود کریں۔۔۔ خواہ ہمیں اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔۔۔ ناچار، ہمیں ان جیسے معدودِ چند افراد سے کوئی زیادہ توقع نہیں ہے کہ وہ ہماری۔۔۔ کہ جو برزخ میں دو دوزخوں کے درمیان الجھے ہوئے ہیں۔۔۔ رہنمائی اور یاری و یاوری کریں۔ اور اسی لئے ہمیں چاہئے کہ ہم ایسے چہروں کو غنیمت جانیں اور ان کو، ان کی زندگی اور زندگی کی ضرورتوں سے۔۔۔ خواہ بالجبر کیوں نہ ہو۔۔۔ باہر کھینچ لائیں اور انہیں اس بات پر مجبور کریں کہ وہ صرف ''ہمارے لئے ہوں اور

☆ایرانی مہینے'' آبان ماہ'' کی تیسری تاریخ، ۱۳۵۱ شمسی مطابق ۱۹۷۲ عیسوی

''ہماری راہ میں قربانی دیں''۔

اس لئے کہ وہ لوگ کہ جو ''گزری ہوئی'' راہوں کے راہی ہیں ان کو جانثاری کی ضرورت نہیں ہے اور وہ اس ''ہموار'' راہ میں اپنی روزمرہ کی زندگی کے پروگراموں کے ساتھ ''سماجی امور'' کو بھی اضافی طور پر انجام دے سکتے ہیں لیکن وہ لوگ کہ جوان راہوں کو کھولنے والے ہوں کہ جن پر ابھی تک کسی کے قدم نہیں جمے اور جو ناہموار ہوں تو ناگزیر، اس کے ''پہلے قدم'' کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے بہت سے مشروع ''حقوق'' سے بھی دست بردار ہوں اور اپنی زندگی کی ہر چیز کی ''بربادی'' کے لئے بھی تیار رہیں اور بعض اوقات اپنی جان سے بھی مضائقہ نہ کریں، اس لئے کہ اس کے سوا وہ معمولی سا قدم بھی نہیں اٹھا سکتے اور ان آغاز کرنے والوں کی بعد کی نسل وہ ہوگی کہ جس کے سامنے ایک ہموار راستہ ہوگا۔

اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے کہ کسی ''راستے کی ابتداء'' کے لئے ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو اپنی ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور ہمیں امید ہے کہ جو حضرات ہماری اس ''ویران'' راہ میں اپنا پہلا قدم دھرتے ہیں خداوند عالم ان کا حامی و مددگار رہوگا کہ سوا اس کے ان کا اور کوئی حامی و مددگار نہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ ہو بھی نہیں!

لیکن آج رات کی ''بدنصیبی'' کے ضمن میں عرض ہے کہ:

......وہ ہستی کہ جو برسوں سے اس ''ویران'' راستے کے بارے میں سوچ رہی ہے، کوشش کر رہی ہے، کام کر رہی ہے، اور قدم بڑھا رہی ہے اور جس کے خیالات اور جس کی فکری شخصیت سے، میں تقریباً 20 سال سے واقف ہوں اور میرا ان سے رابطہ

بھی ہے، یعنی جناب ڈاکٹر شریعت مداری صاحب کہ جو ایک ایسے دور میں کہ جس میں آئے دن ہم کسی ہستی کے زوال اور کسی شخصیت کی بے وقعتی کو دیکھ رہے ہیں، اس نسل کی سخت سماجی اور فکری کشمکشوں میں ان لوگوں کے درمیان جی رہے ہیں کہ جن میں سے زیادہ تر افراد وہ ہیں کہ جب ہوا موافق ہوتی ہے اور بہار کی دلفریب خوشبو ان کے دل و دماغ کو معطر کرتی ہے تو وہ فضا کو اپنے چہچہوں سے بھر دیتے ہیں اور جونہی محسوس کرتے ہیں کہ ذرا ہوا میں کمی آگئی ہے اور وہ دوست کے خیمے تک نہیں پہنچ رہی ہے تو وہ اپنی ساری ''نفوذ و توانائی'' کے ساتھ ۱۸۰ ڈگری گھوم جاتے ہیں، اور اس سے بدتر یہ کہ وہ، سعد بن ابی وقاص کی طرح (علیؑ کے خلاف معاویہ کے ریفرنڈم میں) خاموشی اختیار کرتے ہیں، اور اس سے بدتر ناکثین کی طرح، ناکسی کرتے ہیں اور ''کوفی لایوفی'' کی سنت پر عمل کرتے اور احتیاط سے کام لیتے ہیں، اور جونہی دیکھتے ہیں کہ حق، حقیقت، مسئولیت اور ''اس طرح کی باتیں'' اس وقت مصلحت سے خالی ہیں اور ان میں مالی، مقامی، صنفی، حیثیتی، وقاری، اور بعض اوقات بدنی صدمہ کا بھی امکان ہے تو وہ فوراً اپنے آپ کو پیچھے کھینچ لیتے ہیں اور اس عمل کو ہزاروں عقلی اور شرعی دلیلوں اور دینی فریضے اور سماجی مصلحت سے متعارف کرتے ہیں اور ۔۔۔ سختی کے دنوں میں ۔۔۔ دوست کو اکیلا چھوڑنے کی توجیہ کے لئے، دشمن کی باتوں کی تکرار کرتے ہیں......!

یہ ہستی وہ ہے کہ جو ہمارے لئے، اپنے لئے، خدا کے لئے، اور عوام کے لئے جی رہی ہے اور صنعت کے اس دور میں کہ جس میں بڑے خوبصورت خوبصورت لباس اور کپڑے آگئے ہیں لیکن ان میں پائیداری نہیں ہے اور دو قدم چلنے پر چرچ جاتے ہیں اور

ان کا رنگ، روپ، ڈیزائن، سب کچھ جاتا رہتا ہے اور وہ رواں رواں ہو کر دھاگے کی صورت رہ جاتے ہیں، یہ بڑی بات ہے کوئی اس قماش کا آدمی ہو کہ جسے بیس سال تک کوئی ہلا نہ سکے اور اتنے کیل کانٹوں کے باوجود اس میں دوپارگی نہ آئے، واقعی حیرت کا مقام ہے!

آج رات طے پایا تھا کہ یہ ہستی یہاں (یعنی تہران) تشریف لا کر ہمیں اپنی تقریر سے مستفیض کرے، لیکن افسوس...... یہ ہوا پیمائی...... ملی! (یہ قومی ایئر لائن)

کل رات میں نے عرض کیا تھا کہ ''شیعہ ایک کامل گروہ'' ☆ سے میری مراد کیا ہے؟ اور میں کہاں اور کس طرح اس مفہوم سے آگاہ ہوا اور پھر کم و بیش اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ ایک ایسا ''گروہ'' ہے کہ ایک طرف سے یہ ''ملت ابراہیم'' ☆☆ یا اسلام یا شیعی پالیسی یا شیعی متعین راہ سے صورت پذیر ہوتا ہے اور دوسری طرف سے یہ ذمہ داریوں کی برقراری اور بنی نوع انسان کی رہبری میں روشن خیال لوگوں کی آئیڈیلز کا جوابدہ بھی ہے، میں نے مختصراً عرض کیا کہ ''شیعہ'' ☆☆☆ ایک گروہ یا ایک جہاں بینی کی شکل میں اسلام کی تجلی سے عبارت ہے کہ جس کی بنیاد آئیڈیالوجیکی ہے اور اس میں فلسفہ تاریخ، انسان شناسی، اصول، طبقاتی یکجائی، سیاسی وابستگی معاشی فاؤنڈیشن، رہبرانہ اسلوب، محاذ آرائی کا طریق کار، تنظیم، حزبی

☆...... ملحقات، نمبر ۲ (''الف'' اور ''ب'') سے رجوع فرمایئے۔

☆☆...... فارسی میں نیشن **(Nation)** کا ترجمہ ''ملت'' کیا گیا ہے، جیسے ''ملت فرانسہ''......! جبکہ خود فارسی ادب کی زبان میں ''ملت'' بہ معنائے ''مذہب'' ہے نہ کہ قوم یا شعب واحد۔ مثلاً ''ملل ونحل'' کی مشہور کتاب میں (کہ جسے شہرستانی نے عربی میں لکھا اور فارسی میں ترجمہ ہوا ہے) ملل ''مذاہب'' کے مفہوم میں آیا ہے نہ کہ نیشنز کے مفہوم میں۔

☆☆☆...... ملحقات نمبر ۳ سے رجوع فرمایئے۔

تدبیر، اور حکمت عملی بھی کچھ موجود ہے۔ اس کی جنگی حکمت عملی اور اس کا طریقہ کار، شیعہ ائمہ کی ۲۵۰ سالہ دائمی جنگ میں منصہ شہود پر آیا اور پھر سات سو، آٹھ سو سال بعد تک (یعنی صفوی دور سے پہلے تک) ☆ حکومت جور سے محاذ آرائی اور اہلبیت کے اسلام پر تکیہ کے ساتھ، علماء، مجاہدین واعظین، شعراء، بلکہ ذاکرین اور شیعہ مداحین کے ہاتھوں ☆☆ اس کی پاسداری عمل میں آئی ہے۔

البتہ آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں ان رائجہ ''احزاب'' کو جو آج دنیا میں موجود ہیں، شیعوں پر چسپاں کرنا چاہتا ہوں! ہرگز نہیں! ان سب کھلی ہوئی دکانوں کی ماہیت سب پر روشن ہے اور ہر کوئی انہیں جانتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ سب، عیاریوں، جھوٹی باتوں، غرض ورزیوں، اور تاریخ کے دائمی حاکم طاقتوں کی تزویروں پر نفاق کے خوبصورت پردے ہیں جو کل تک عریاں تھے اور سب کو نظر آرہے تھے لیکن آج وہ ان سرپوشوں تلے چلے گئے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ وہی خونریزیاں اور ناانصافیاں ہیں کہ جو آج ''عوام دوستی'' ''دادخواہی'' اور خاص طور پر ڈیموکریسی اور لیبرل ازم

☆......اس لئے کہ ''صفوی تشیع'' اور اس کے بعد کے زمانے کو کسی اور منطق سے تجزیہ کرنا چاہئے کہ جسے میں نے ''تشیع علوی اور تشیع صفوی'' نامی کتاب کی پہلی ایڈیشن میں بیان کیا اور دوسری ایڈیشن میں اس کی اور زیادہ توضیح کی!

☆☆......جی ہاں، حتیٰ شیعہ مداحین، حسینیہ ارشاد سے شائع ہونے والے ''ذکر وذاکرین کے انقلابی کردار'' میں، میں نے عرض کیا کہ جس میں شیعوں نے اپنی جہت تبدیل نہیں کی تھی انہوں نے تاریخ کے قلب سیاہ میں، مظلوم عوام کے جہل اور ظالم حکام کے جور کے خلاف جنگ کی ذمہ داری کو اپنے سر لیا تھا۔ یہ لوگ عوام کے درمیان شہادت کی بہت بڑی فریاد تھے۔ یہ لوگ، ذاکر یا اس شہادت کے یاد دلانے والے تھے کہ جس کو سنت وخلافت کی عوام دشمن مشنری پیہم بھلانے کے درپے تھی۔ یہ لوگ یاددہانی کرنے والے تھے تاکہ مبادا یہ بات فراموش ہو کہ اس خون کو کن لوگوں نے اور کس مقصد کیلئے بہایا ہے۔

وغیرہ کے دلفریب ناموں سے سامنے آئی ہیں۔

میرے ایک دوست کے پاس ایک تحریر تھی جسے میں کل رات پڑھ کر محظوظ ہورہا تھا اُس کا تکیہ خصوصیت کے ساتھ اس نکتہ پر تھا کہ کس طرح پرانے وقتوں کے استحمار گر لوگ (یعنی استعماری طاقت سے منسلک لوگ)۔۔۔کہ جو حاکم طبقہ کی تین طاقتیں تھیں۔۔۔حتیٰ ان برحق مضامین کو بھی جو اس وقت تک عوام میں کمزور نہیں ہوئے تھے لوگوں کے استحمار (استعمار کی ایک قسم) کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔لیکن جب سے یہ عامل، مغربی معاشرہ میں کمزور پڑ گیا☆ تو دانشمندوں، ہنرمندوں، فلسفی مآبوں اور آئیڈیالوجوں (مذہبی پیشواؤں) وغیرہ پر مبنی نئے گروہوں نے اس کی جگہ پکڑی اور پھر لوگوں کے استحمار کا کام شروع ہوا، تاہم نئے زاویے سے!

وہ لوگ مذاہب کے ذریعے۔۔۔وہ سچے مذاہب ہوں کہ بہروپی۔۔۔لوگوں کو بدبختی، غلامی اور اسارت میں ''مبتلا کرتے تھے'' اور یہ لوگ علم، ہنر، فلسفے اور آئیڈیالوجی کے ذریعے لوگوں کو غفلت اور گمراہی میں ''دھکیلتے ہیں''! وہ لوگ حاکم کے سہ جہتی طبقہ کی ایک جہت تھے اور یہ بھی اسی حاکم طبقہ کی دوسری جہت ہیں۔ بہرحال کردار، وہی ''استحمارگری'' ہے جس کا نام وفا شعار نے بدل دیا ہے......

مجھے ہمیشہ اس ڈھنگ سے کراہت رہی ہے کہ میں فرضیات اور جدید علمی قوانین۔۔۔بلکہ ٹیکنیکی ایجادات۔۔۔کو دانستہ اور نادانستہ طور پر تہ و بالا کروں اور

☆......جس طرح میں نے تاریخ ادیان کے پہلے اور دوسرے درس میں بھی عرض کیا ہے۔۔۔برخلاف ان باتوں کے جنہیں عمداً پھیلایا گیا ہے۔۔۔یہ (سائنس) نہیں تھی کہ جس نے یورپ میں ''دین'' کو زک پہنچایا، بلکہ یہ بورژوازی (متمول) طبقہ کی افزائش تھی کہ جس نے مذہب کو اور معنویت کو، بہت سے انسانی فضائل کے ساتھ، روز بروز، زیادہ سے زیادہ تعداد میں انسانی زندگی کے دائرہ سے خارج کیا!

قرآنی آیات یا اسلامی احکام کو ان پر چسپاں کروں۔ یہ اسلوب عام طور پر مغرب کے مقابل ''حقارتی عقدہ'' کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ان ترقی یافتہ لوگوں کے سامنے پسماندہ لوگوں کا ردعمل ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو چھپانا اور ''زیادہ قوی'' قدروں کے ساتھ اپنی توجیہ کرنا چاہتے ہیں! اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج، اسلام کے بعض مبلغین اور اسلامی ثقافت کے بعض محافظین بھی، رجعت پسندی اور پسماندگی کے الزامات کی نسبت عقدہ کشائی اور تعلیم یافتہ نوجوان نسل میں اثر و نفوذ کے خیال سے اس میں بڑی شدت سے مبتلا ہیں ☆

یہ کام علاوہ بر ایں کہ ان مومنین میں کہ جو اپنے آپ کو اسلامی ثقافت سے وابستہ جانتے ہیں اور ان علمی انکشافات کو ''ہم سے بہتر لوگوں'' کا حق سمجھتے ہیں، عقدۂ حقارت کی شدت کو بڑھاتے اور اسی تعلیم یافتہ نوجوان نسل میں بھی فرار و بیزاری کو اور زیادہ فروغ دیتے ہیں، اور وہ اسلام کو ایک ایسا مذہب سمجھتے ہیں کہ جس میں کوئی نئی بات موجود نہیں ہے اور اپنی اصالت کے اثبات کے لئے۔۔۔ اس نسبت سے کہ وہ نئی دنیا کے مقابل اپنے آپ کو متزلزل پاتے ہیں اور باقاعدہ ان پر خوف کا عنصر طاری ہے۔۔۔ وہ آج کے افکار پر چھائی ہوئی روح و منطق و سوچ سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں اور وہ بھی کس قدر ناز یانہ اور بے ثمرانہ!

یہ ملتہب نسل، ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ اسلام، یورپ اور امریکہ کی ایجادات اور انکشافات یا علمی قوانین کی مدد سے محل وضاحت پر آئے۔ یہ مضطرب نسل اس ''صحیح سماجی وابستگی'' کی جستجو میں ہے جو آگے بڑھتے ہوئے زمانے میں اس کے دکھوں، اس کی ضرورتوں اور اس کی معاشی ذمہ داری کی ضامن اور قابلِ باز پرس ہو، یہ ایک ایسے

☆...... ملحقات نمبر ۴ ملاحظہ فرمایئے۔

عقیدہ اور ایک ایسے مذہب کی پذیرائی کرتی ہے جو زمانے کے دھارے پر عالم حرکت میں ہو اور عوام کو آگاہی اور خواص کو مسئولیت سے ہمکنار کرتی ہو اور اس کی سماجی تکلیفوں کے لئے بہترین دوا ہو، اور اسی رو سے وہ نہ صرف یہ نہیں چاہتی کہ مثلاً لیزر کی دریافت کے بعد اس کی تطبیق کے لئے کوئی آیت یا کوئی حدیث ڈھونڈ نکالے یا اپولو کی اڑان کو سورہ بقرہ سے استخراج کرے، بلکہ بنیادی طور پر اسے تکنیک، ٹیکنالوجی، فلسفہ اور جدید علوم سے شدید نفرت ہے، اس لئے کہ وہ ان سب کو اپنے قتل کا آلہ پاتی ہے۔ یہ نسل اس بات سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتی کہ امریکی اور یورپی لوگ اسلام اور تشیع کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں، وہ اس بات سے اسلام کی نسبت اچھے خیالات کی حامل نہیں ہوتی، آج کی تیسری دنیا کے روشن خیال لوگ، مغرب کے اکابرین کی نسبت ''عقدۂ حقارت'' نہیں ''عقدۂ غارت'' رکھتے ہیں! اور یہ دو ایک نہیں ہیں۔ ہماری آج کی متجسس نسل ایک ایسے مذہب کی خواہاں ہے کہ جو مغربی تمدن کے مقابل اسے اس خیرگی، فریفتگی اور احساس حقارت سے نجات دے اور اپنے آدمیوں کی گردنوں کو ان کے اس مسلط کردہ ''مصرفی تمدن'' کے طوق سے آزاد کرے کہ جس نے ان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی آزادی کو ان کے ہاتھ سے چھین لیا ہے......

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے لوگ اس رجحان کو تشخیص نہیں دیتے اور اپنے دینی وعظوں اور تقریروں میں اخباروں، درسی کتابوں، رسالوں، اور ''عام معلومات'' پر مبنی کتابوں کے مطالب کو عوام کے ذہنوں میں اتارتے ہیں وہ بھی دین کے نام سے، اور وہ بھی ان لوگوں کے ذریعے جنہیں اصل بات کا مطلقاً علم نہیں ہے ☆

☆...... ملاحظہ فرمائیے ملحقات، نمبر ۵۔

ہرگز یہ خیال ذہن میں نہ آئے کہ چونکہ آج دنیا میں ''پارٹی'' اور ''پارٹی بازی'' ۔۔۔یعنی مغرب! ۔۔۔کا دور دورہ یا اس کی ریت کار فرما ہے، میں بھی اس سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ ان کے بتائے ہوئے ڈھانچہ کو مستعار لوں اور پھر کسی آیت، حدیث اور روایت کے درپے رہوں کہ مثلاً میں ''تشیع'' کو آج کے متجددین کے ذہن میں اتارنا چاہتا ہوں! ہرگز نہیں!

اس لئے کہ میں اور وہ تمام لوگ جو اس متعین راہ پر چل رہے ہیں رجعت پسندی قدامت پرستی سے کہیں زیادہ اس تجدد مآبی، اس ثقافت وتمدن، حتیٰ اس علم وہنر وفلسفہ و سیاست وصنعت کی متعین راہ سے بیزار ہیں جو آج کی دنیا پر چھائی ہوئی ہے اور بغض و کینہ ودشمنی کو اپنے ساتھ لائی ہے۔ ہم چاہتے ہیں اسلام اور تشیع کو اس کی اپنی زبان سے جس طرح کہ وہ رہی ہے اس عصر اور اس نسل کے وجدان میں داخل کریں، اور ہمیں یقین ہے کہ اگر انسانی جہت اور اسلام کی سماجی ذمہ داری اور نیز مذہب کی علی وار سیاست کا صحیح طور پر تعارف ہو تو ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں ہوگی کہ ہم اسلام کی تجدد مآبانہ رنگ آمیزی سے روشن خیال آدمی کو اپنی طرف دعوت دیں۔ ☆

بہرحال...... آج جو بات میں کہنے جا رہا ہوں اور مجبور ہوں کہ تیزی کے ساتھ اس سے گزروں وہ اسلام کا آئیڈیل گروہ ہے۔۔۔ تشیع کے نظریہ کے ساتھ۔۔۔ کہ جو سارے فرض شناس مسلمان گروہوں اور دنیا کے تمام روشن خیال لوگوں کی آرزو ہے اور اپنی کامل ترین شکل میں وہ ان آگاہ شیعوں کی سماجی مسئولیت اور اعتقادی مکتب ہے کہ جو تشیع کو، عمل اور ذمہ داری سے گریز کی توجیہ اور رستگاری کی نسبت الٹی سیدھی

☆...... ملاحظہ فرمایئے ملحقات نمبر ۶

خیالی راہوں کی وضاحت کے لئے اور نیز انجام نہ دیے جانے والے امور کی پاداش سے بہرمند ہونے کے لئے ایک آلہ کار بنانے کے عنوان سے یا پھر اسے تفریق و فرقہ ورایت والے احساسات وذہنیات کے ایک مجموعے، کے عنوان سے نہیں بلکہ اسلام کی ترقی پسندانہ سوچ، افراد بشر کی آگاہی وعزت ونجات کی انسانی ترین راہ، اور جلابخش ترین ایمان کے عنوان سے جانتے ہیں۔

یہ وہ گروہ ہے کہ جس نے توحید کے عظیم پیغمبروں کے درمیان جگہ پائی ہے جس نے وجود کی گہرائی میں جڑ پکڑی ہے۔ یہ گروہ متنِ واقعیتِ تاریخ، بشریت کی طویل سرگزشت، حق وناحق کی جنگ اور عوام اور عوام دشمنوں کی دائمی لڑائی میں عینی حقیقت سے ہمکنار ہوا ہے اور تاریخ میں واقعی ترین اور محکم ترین صورت میں ابھرا ہے۔ یہ ایک بے نیاز، کامل واکمل اور شاداب ثقافت کا حامل ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو ناموس خلقتِ عالم سے پیوستہ اور انسانی فطرت سے ملا ہوا ہے، وہ گروہ نہیں کہ جو صاحبان قوت کے ارادے سے بنا ہے یا جسے تھیوری ساز لوگوں اور ان آئیڈیالوجوں (فکری راہ ہموار کرنے والے مذہبی لوگوں) نے بنایا ہے کہ جس کے انقلابی ترین، ترقی پسند ترین اور منحرف ترین افراد میں وہ خیالی باتیں کرنے والے سوشلسٹ حضرات بھی ہیں کہ جو تاریخ کے علمی سیر پر چھائے ہوئے تغیر ناپذیر قاعدہ سے بیگانہ، رنگین لفظوں سے تاریخ بناتے ہیں اور اپنی تحریروں سے سرنوشت لکھتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ریالسٹ دانشور نہیں بلکہ یوٹوپسٹ ہیں اور کتاب میں مدینہ فاضلہ کو جنم دیتے ہیں۔

حزب (گروہ) عالمی روشن خیال لوگوں کی عام لغت میں کلی طور پر اس سماجی تنظیم سے عبارت ہے کہ جس میں "جہاں بینی"، "آئیڈیالوجی"، "فلسفہ تاریخ"،

''ایک آئیڈیل سماجی نظام''، ''طبقاتی جہت''، ''طبقاتی وابستگی''، ''سماجی رہبری''، ''سیاسی فلسفہ''، ''سیاسی مزاحمت''، ''سماجی رسم و رواج''، ''نصب العین''، ''اسٹریجی''، اور جنگی تدبیر وغیرہ سب کچھ ہو اور یہ آرزو بھی کہ وہ انسان، سماج، قوم یا ایک خاص طبقہ کی ''موجودہ حالت'' کو ☆ بدلے اور اس کی جگہ ''مطلوبہ حالت'' کو لائے۔ اس بنیاد پر ہر گروہ مثبت اور منفی دو صورتوں کا حامل ہے: ایک ''امر'' اور دوسرے ''نہی''۔

دوسرے لفظوں میں گروہ ۔۔۔ اوپر کی تمام خصوصیات کے ساتھ ۔۔۔ ایک ایسے محکوم طبقے کے مورچہ سے عبارت ہے کہ جسے وہ اپنے جائز حقوق کے لئے بناتا ہے اور ''حاکم طبقے'' کے ہاتھ میں واقع ''اراکین سلطنت'' اس کا مخالف مورچہ ہے کہ جو اپنے قوانین کے سرپوش تلے اس بات کے لئے کوشاں رہتا ہے کہ اپنی طبقاتی حالت کو محکوم طبقہ کی خواہشوں کے برخلاف برقرار رکھے اور اس کی پاسداری کرے۔ ☆☆

اس بناء پر دو مدار یا دو محور رکھنے والے نظام میں حاکم طبقہ یا طبقات، سامنے والے محور کے مقابل اپنی برتر سماجی حالت کے بچاؤ، خصوصی امتیازات کے تحفظ، اور ''حاکم طبقاتی موقف'' کی برقراری کے لئے ''اجرائی طاقت'' کو اپنا مورچہ بناتے ہیں

☆...... عالمی، قومی یا طبقاتی ہونے کی مناسبت سے۔

☆☆...... ''اراکین سلطنت'' اور ''حاکم طبقہ'' ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ''اراکین سلطنت افراد کے اس گروہ سے عبارت ہے کہ جو حکومت یا اجرائی طاقت کے سانچے میں سماج کے سیاسی پہیہ کو گردش دیتا ہے، لیکن ''حاکم طبقہ'' اس سسٹم سے عبارت ہے کہ جس میں اجتماعی روابط، قانون، رسم و رواج، ثقافت، زبان، مجموعی رفتار، گروہی نفسیات، اخلاق، اور وہ خاص مقام شامل ہے کہ جس کے اختیار میں سیاسی، معاشی، اور معنوی، تینوں قوتیں ہیں اور وہ انہیں، عوام کی اکثریت پر عائد کرتا ہے۔

کہ جو ایک باضابطہ سیاسی مشنری ہے اور اس میں سارے اداری نظام شامل ہیں، سارے سماجی، معاشی، ثقافتی، تبلیغاتی، اور مطبوعاتی محکمے شامل ہیں اور وہ اپنی طبقاتی حاکمیت کو اعتقادی، اقتصادی، اور سماجی ابعاد میں مقابل کے مدار ۔۔۔ طبقہ یا محکوم طبقات ۔۔۔ پر عائد کرتا ہے اور چونکہ وہ صاحب ملک (Possesser) اور اس کے نتیجہ میں بنیاد پرست ہے اس لئے کوشش کرتا ہے کہ ''قوت'' اور ''قانون'' یا ''مذہب'' کی طاقت سے موجودہ حالت ☆ کی ''توجیہ'' کرے اور اسے استحکام یا تقدس بخشے۔

لیکن اس کے مقابل، مخالف مدار ۔۔۔ یعنی محکوم طبقہ یا طبقات ☆☆ ۔۔۔ موجودہ صورتحال کی تبدیلی کا خواہاں ہے اور چونکہ وہ صاحب ملک (Possesser)

☆......Statusque

☆☆ ...... یہ اس پر ہے کہ ہم معاشرے کو ''عرضی کٹاؤ'' میں لیتے ہیں یا ''طولی کٹاؤ'' میں۔ عرضی کٹاؤ میں بعض اوقات ایک معاشرہ پانچ، چھ اور سات طبقوں کا حامل ہوتا ہے مثلاً ذیل کے یہ طبقے:

اشراف، شہزادے، علماء، فوجی، زمیندار، شہری تاجر، کاشتکار اور اہل صنعت وحرفت۔ اور بعض طبقاتی نظاموں میں: زرخرید لوگ اور کبھی غیر لوگ یا نجس قرار دیے جانے والے لوگ (قدیم ہندوستان، جدید امریکی اور جدید تر اسرائیل)۔ لیکن ہم یہاں طبقہ کو، کردار یا اجتماعی کیفیت کی بنیاد پر لیتے ہیں اور یہ طبقات ہیں کہ جو ہر نظام اور ہر تاریخی مرحلہ میں بگڑ جاتے ہیں کیت کے نقطہ نظر سے بھی اور کیفیت کے نقطہ نظر سے بھی۔ لیکن سارے سماجی طبقاتی نظاموں میں ایک مشترک اور مستحکم طبقاتی تقسیم کا وجود رہا ہے اس مفہوم میں کہ طولی کٹاؤ کے اعتبار سے، ہر معاشرہ (خواہ وہ پرولتاری نظام میں ہو یا بورژوازی نظام میں، خواہ وہ عصر بردگی میں ہو یا عصر آزادی میں) دو مستحکم طبقوں میں تقسیم ہوتا ہے اور یہ طبقہ بندی معاشرے کے وسائل وذرائع اور پیداواری روابط پر بر حسب مالکیت وجود پذیر ہوتی ہے اور معاشرے کو ''حاکم طبقہ'' اور ''محکوم طبقہ میں بانٹتی ہے۔ حاکم طبقہ، قرآن کی واضح اصطلاح میں ناتواں گر طبقہ ہے اور محکوم طبقہ وہ طبقہ ہے جسے ناتوان بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں طبقے طولی کٹاؤ میں (سماجی صورت کے مطابق) ۔۔۔ خود کئی عرضی طبقوں سے مرکب ہیں۔

نہیں اس لئے انقلابی ہے، اور اس کا مذہب بھی، خواہ نام کے اعتبار سے وہ حاکم مذہب کا ہم نام ہو ایک توجہی اور تقدیری مذہب نہیں بلکہ تنقیدی اور امنگوں بھرا ہے اور لوگوں کو امر و نہی اور مسئولیت و جہاد کی طرف بلاتا ہے۔ یہ مدار چونکہ محلِ یورش ہے، محرومیت کا شکار ہے اور حاکمیت کے جال میں گرفتار ہے اس لئے رہائی، تبدیلی، حق و برابری، اور مسلط ہونے والی طاقت کو پیچھے دھکیلنے کے بارے میں سوچتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے، لیکن وہ غیر مسلح ہے، بے سہارا ہے، بے ٹھکانا ہے اور ہر طرح کے وسیلے، ہر طرح کی سہولت اور ہر طرح کی طاقت سے عاری ہے، اس کی کوئی سماجی تنظیم نہیں لہٰذا وہ اپنا ایک ''گروہ'' بنالیتا ہے اور اس طرح اس حاکم نظام میں جو اس کی نفی کرتا ہے وہ اپنے وجود کو منواتا ہے اور پھر یہ گروہ اس کے فکری اساس کو اجاگر کرتا ہے اور پھر اس مدار کی بکھری ہوئی طاقت، اس کی منتشر ثقافت، اس کا پراگندہ مذہب اور اس کے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے لوگوں کو وحدت، ہم آہنگی اور طبقاتی خود آگاہی بھی بخشتا ہے اور اپنی رہبری اور اپنے انتظام سے اس سماجی طبقہ کو کہ جو ابھی تک منظم نہیں ہوئی ہے یکجا کرتا ہے اور انہیں ایک فرض شناس صورت والی طاقت کا حامل بناتا ہے اور ایک ایسی آگاہانہ رہبری کے ساتھ کہ جو انہیں اپنے طبقاتی مقاصد کی طرف لے جاتی ہے، حرکت میں لاتا ہے اور ناتواں ساز حاکم کے محاذ کے مقابل اپنے طبقہ کی حکمت عملی کو رونما کرنے لگتا ہے اور اس کے دکھوں اور عینی احتیاجات کو جسے وہ اپنے صاف، سیدھے اور اپنے قابل بیان اصولوں میں جاگزیں کرتا ہے سامنے لاتا ہے اور بالآخر شرائط کی بنیاد پر، وسائل اور ایک ایسے مفہوم کے ساتھ کہ جس کی پیش بینی امام کی تعبیر میں ہوئی ہے، یعنی ''مستحدثہ وقایع'' (پیش بینی والے واقعات) اور وہ خاص

طرز عمل جسے دشمن نے اپنایا ہے یا اسے لوگوں پر مسلط کیا ہے، اپنی حکمت عملی اور تدبیر کو معین کرتا ہے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس تعریف میں، گروہ، حاکم طبقہ کے مقابل محکوم طبقہ سے مخصوص ایک اعتقادی، سماجی تنظیم کے عنوان سے آیا ہے اور یہ سماجی۔ اعتقادی۔ سیاسی کردار کے نقطۂ نظر سے حکمران طبقے کے مشابہ و مقابل ہے۔ اس معنی میں کہ حاکم طبقے کے پاس حکمران طبقہ ہے اور محکوم طبقہ اس کے مقابل، گروہ کا حامل ہے۔ درآں حالیکہ اولاً: دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور سارے سماجی نظاموں میں، حاکم طبقہ نیز ایک یا متعدد گروہوں کا حامل ہوتا ہے۔ خاص آئیڈیالوجیز کے ساتھ۔ اور ثانیاً حزب یا گروہ ہمیشہ طبقاتی نہیں ہوتا بلکہ ''قومی'' بھی ہوسکتا ہے اس مفہوم میں کہ اس کی آئیڈیالوجی اور مسئولیت کا مرکز، قوم ہے اور قوم ایک ماوراء طبقاتی سماجی گروہ ہے اور اس میں حاکم و محکوم طبقہ ایک مشترک محاذ حاصل کرتا ہے ایک وحدت اسے ملتی ہے۔ ان کے دکھ مشترک ہوتے ہیں اور نتیجتاً ان کے مقاصد، ان کی امنگیں، ان کی آرزوئیں اور ان کی آواز مشترک ہوتی ہے۔ اس بناء پر ایک قومی آئیڈیالوجی پر قائم ماوراء طبقاتی گروہ، دونوں طبقاتی مراکز کے افراد کو اپنے اندر سمیٹنے والا ہوتا ہے۔

ان دو حقیقتوں سے یعنی گروہ کے قومی ہونے اور سرکاری ہونے سے ہٹ کر ـــ کہ جو اوپر کی تعریف کی تنسیخ کرتی ہیں ـــ گروہ والے طبقاتی معاشروں میں ایک تیسری واقعیت بھی دیکھنے میں آتی ہے اور وہ ان گروہوں کی تعداد ہے کہ جو تین ـــ دائیں، بائیں اور متوسط ـــ بازوؤں میں نمایاں ہوتی ہیں اور ''متوسط گروہ'' اس سماجی واقعیت پر استوار ہے کہ ایک طبقاتی معاشرے میں دو حاکم و محکوم طبقوں کے

درمیان ایک تیسرا طبقہ بھی موجود ہے کہ جو نہ استثمار (استحصال کی ایک قسم) کرتا ہے اور نہ استثمار ہوتا ہے، یعنی وہ نہ مزدور ہے اور نہ سرمایہ دار، نہ دہقان ہے اور نہ فیوڈل (جاگیردار)، اس کا تعلق چھوٹی بستیوں کے چھوٹے مالکین سے ہے کہ جو اپنی ملکیت میں خود کام کرتے ہیں یا پھر ان کا شمار صنعت گروں، ہنرمندوں، بیوپاریوں، دفتروں کے ملازموں، روشن خیال لوگوں اور علماء میں ہوتا ہے۔

ان تینوں انتقادات کے جواب میں جو بہت زیادہ قابل تامل اور بہت زیادہ تفصیل وتفسیر کا حامل ہے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے بہت تیزی سے اور بہت سرسری طور پر گزرنا پڑ رہا ہے اور چونکہ اس محفل میں تمام افراد ''لائق'' اور ''ذی جوہر'' ہیں ان تمام باتوں کے بجائے جنہیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت ہے بس یہی ایک بات کافی ہے،

سچ ہے، حاکم طبقہ بھی ''حزب'' یا ''گروہ'' کا حامل ہے اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گروہ یا یہ احزاب کہ جن کے کامل ترین نمونوں کو ہم مغرب کی سرمایہ دارانہ دنیا میں دیکھتے ہیں اپنی ماہیت اور نیز اپنے کردار کا اس عنوان سے اعتراف نہیں کرتے کہ وہ حاکم طبقہ سے وابستہ ہیں، بلکہ اس کے برعکس نہ صرف یہ کہ وہ زیادہ تر حاکم طبقہ سے اپنی وابستگی کو چھپاتے ہیں بلکہ محکوم طبقے کے خاص الخاص نصب العین اور اس کی آئیڈیالوجی کا اعلان کرتے ہیں، جیسے، ڈیموکریسی، لیبرل ازم، عوام الناس، مسیحیت، محنت کش، عدالت، یہاں تک کہ سوشلزم! اور بعض اوقات حتیٰ ذونقابین! سوشل ڈیموکریٹ اور نیشنل سوشلزم۔

اپنی پچھلی گفتگو (۱ اور ۲) میں، میں نے اس گروہ کی آئیڈیالوجی اور اس کے

ہدف (یا اس کی ذمہ داری) پر بات کی ہے اور اب ہم اس کے دیگر مبانی کا اجمالی جائزہ لیں گے اور اس کی تکمیل کو آپ پر چھوڑتے ہیں۔

۳۔ نصب العین

نصب العین، پارٹی یا گروہ کے اہم ترین اصولوں میں سے ایک ہے۔ یہ پارٹی کے سارے اصولوں کی تجلی سے عبارت ہے۔۔۔ جیسے اس کی آئیڈیالوجی، اس کے اہداف، اس کے کیمپ، اس کے طبقاتی درجے اور اس کی سماجی وابستگی وغیرہ سے ۔۔۔ وہ بھی ایک یا چند ایک مختصر، واضح، اور قاطع جملوں کے ساتھ۔ ہُرّا (Hurrah) کے نعرے، تالی یا درود وغیرہ ...... حزبی یا گروہی شعار نہیں، میٹنگی شعار ہیں ۔۔۔ اس مفہوم میں کہ ۔۔۔ گروہی شعار، دوسرے لفظوں میں، اس گروہ کے سارے مقاصد، سارے مطالب، اور سارے عزائم کے آئینہ دار ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنی تحریک ۔۔۔ بعثت ۔۔۔ کے پہلے تین سالوں میں صرف "قولوا لا الہ الا اللہ تفلحو" کا شعار دیا اور اس پر کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ اس طرح کہ ان تین سالوں میں اگر کوئی اس شعار پر ایمان کے ساتھ دنیا سے کوچ کر جاتا تو اس کی موت ایک مسلمان کی موت ہوتی، اور اس کے بعد سارا قرآن، ساری سنت اور سارے نبوی امامی احادیث وغیرہ اسی ایک شعار سے منشعب ہوئے اور در حقیقت یہ سب اسی ایک شعار کی تفسیر و توضیح و تبلیغ و تفصیل ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں، یہی ایک شعار ہے جو ان سب کی اساس قرار پائی ہے۔

ولیکن اس گروہ کا شعار:

"و ممن خلقنا امة ......"

"اور ہماری مخلوقات میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے"، "کہ جسے بیچ تاریکی میں"؛ "ایک برتر امت" قرار دیا گیا ہے تا کہ وہ عالم بشریت کو ابد تک:

"یهدون بالحق"

"حق کی سمت رہنمائی کرے"

لیکن اس گروہ کا شعار لوگوں کو صرف یہی آگاہی بخشنا نہیں ہے، حق کی طرف لوگوں کی رہنمائی نہیں ہے: اس نے صرف اس لئے قیام نہیں کیا ہے کہ وہ "لوگوں" کو "آگاہی" دے۔ اس کی ذمہ داری میں صرف یہ ذہنی روشن خیالانہ مسؤلیت نہیں آتی ...... بلکہ یہ قدر اس کی اصلی مسئولیت اور اصلی ذمہ داری کے لئے ایک وسیلہ ہے۔ یہ پہلا قدم اس لئے ہے کہ:

"وبه یعدلون" ☆

"وہ اس (آگاہی اور روشنگری) کی بنیاد پر عدل و انصاف کو (اپنے لگاتار مبارزات کے پرتو میں) برقرار کرے"۔

اس بناء پر، اس "برتر امت" ۔۔۔ حزب ۔۔۔ کا پہلا قدم، کہ جس نے "لوگوں" کے لئے اور ان ہی کے درمیان سے قیام کیا ہے...... حق کی سمت لوگوں کو بلانا، انہیں آگہی سے ہمکنار کرنا اور بالآخر انہیں اصولی اور نظری تعلیم دینا ہے۔ لیکن یہ پہلا شعار ہے اور اس گروہ یا حزب کا شعار اس پر ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ ساری تعلیمات اور "حق کی طرف دعوت" اس لئے ہے کہ "به یعدلون" وہ اس حق کی اساس، اس

☆...... سورہ اعراف۔ آیت ۱۸۱

دعوت کی بنیاد اور اس نظری تعلیم کے پائے پر ''عدل وانصاف'' کی برقراری کے لئے، عملاً اٹھ کھڑے ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ان حقائق اور ان اصولی حقیقتوں کی تعلیمات کو ذہنوں میں، کتابوں میں، دانش گاہوں میں، روشن خیالانہ ذہنیت والی محفلوں یا پھر کافی ہاؤسوں میں زیر بحث لائیں:

''وبہ یعدلون''

اس ترتیب سے بر بنائے ملت اسلام اس حزب کا عالمی اور جاودانی ہدف، کہ جو اس کا وجودی فلسفہ ہے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' سے عبارت ہے اور اس کا شعار عوام کی عینی زندگی میں ''حق وعدل'' کی برقراری ہے:

وممن خلقنا امة ''یھدون بالحق. وبه یعدلون''!

''عدل'' کے اس شعار سے متعلق قرآن مجید، ایک مثال لاتا ہے جو بہت عجیب اور حیرت انگیز ہے:

''وضرب الله مثلاً رجلین احد هما ابکم لایقدرون علیٰ شی وهو کلّ علیٰ مولیه اینما یوجهه لایات بخیر......''

''اور خدا دو آدمیوں کی مثال لاتا ہے کہ جن میں سے ایک گونگا ہے (البتہ گونگا اس مفہوم میں نہیں کہ اس میں بولنے کی قوت نہیں ہے بلکہ اس نے چپ سادھ لی ہے، خاموشی اختیار کی ہے اور کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کرتا)---یعنی---وہ کچھ نہیں کرسکتا، (بس اس نے صرف غلامی میں مہارت حاصل کی ہے!)---بلکہ---وہ اپنے مالک ☆ پر بوجھ ہے۔ مالک جس سمت اسے گھسیٹتا ہے کوئی اچھا نتیجہ (یا اچھا ردعمل) اس سے حاصل نہیں ہوتا''......

☆......یہ گفتگو بالکل ان اشعار کے مصداق ہے جنہیں میں نے ''حسین وارث آدم'' ...

ہمیں، جو زیادہ تر ارسطو کی منطق کی بنیاد پر سوچتے ہیں، یہ توقع ہوتی ہے کہ خداوند عالم ایک ایسے شخص کی مثال پیش کرنے کے بعد اس کے مقابل ایک ایسے شخص کی مثال لائے گا جس کی خصوصیات اس کی خصوصیات کے برخلاف ہوں گی۔ مثلاً وہ ایک ایسا آدمی ہوگا جو بہت چالاک اور عاصی ہوگا، جو ہر کام کرسکتا ہوگا، جو آزاد، خود ساختہ، بلکہ "بردہ گیر" ہوگا اور بالآخر کسی کو یہ اختیار نہیں دے گا کہ وہ اسے کسی سمت گھسیٹے!

لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، قرآن کی منطق، فوقِ منطق ہے، ایک ایسی منطق ہے جسے ایک عام اور معمولی سوچ سے نہیں سمجھا جاسکتا...... اس کے بر عکس قرآن کہتا ہے:

"......هل يستوى هو ومن يأمر بالعدل؟" ☆

ــــ میں بھی پیش کیا ہے:

......وہاں مالک کے مطبخ کے کنارے،

نرم لکڑی کے ریزوں پر بسیرا،

ہے کتنا پرسکوں، پرلطف اور پھر:

"عزیزم" بولنا اور "جان" سننا،

۔۔۔ بچا کھانا خوراکِ جاں بنانا

۔۔۔ اگر یہ بھی نہ ہو، ہڈی تو ہے ہی

۔۔۔ سہانا جگ ہے اور آرام کیسا،

۔۔۔ عزیز و مہرباں مالک ہے کیسا!......

("کتوں اور بھیڑیوں کی آواز" کے عنوان سے ایک غیر ملکی شاعر کے اشعار)

☆......سورہ نحل۔ آیت ۷۶

''......کیا ایسا آدمی اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو عدالت کا حکم دیتا ہے؟''!

ایک دوسری جگہ ''عدل'' --- بلکہ --- قسط ☆ --- کے اس شعار کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جس سے اس گروہ کی سماجی وابستگی اور نیز اس کے دشمنوں کی وابستگی پوری طرح مشخص ہوتی ہے:

"ان الذین یکفرون بآیات الله ویقتلون النبیین بغیر حق و یقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس فبشر هم بعذاب الیم ☆☆

قرآن کی منطق میں رابطوں کو ملاحظہ فرمایئے:

''خدا کی آیتوں سے کفر اختیار کرنے والے''، پیغمبروں کو قتل کرنے والے اور اس امت یا اس حزب --- یا علاوہ ازیں --- ان لوگوں کو قتل کرنے والے جو ''عوام الناس'' کو ''قسط'' و ''عدل'' کا حکم دیتے ہیں، تینوں ایک ترتیب کے ساتھ آئے ہیں اور قرآن ان تینوں کو ایک عبارت اور ایک لحن میں عذاب کی بشارت دیتا ہے۔

جو لوگ خدا کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں اور (اللہ کے بھیجے ہوئے) رسولوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور (اس امت یا اس حزب --- یا اس کے علاوہ --- ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو بنی نوع انسان کو قسط اور عدل (کے استقرار) کا حکم دیتے ہیں تم

☆......قرآن کی منطق میں ''قسط'' اور ''عدل'' کے مفہوم کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے کافی ہوگا کہ آپ ان الفاظ اور ان کے مشتقات کے بارے میں تحقیق کریں۔

☆☆......سورہ آل عمران۔ آیت ۲۱

(اے نبیؐ) انہیں دردناک عذاب کی بشارت دو☆۔

"ان الذين يكفرون بآيات الله ويقتلون النبيين بغير حق و يقتلون الذين يأمرون بالقسط من الناس فبشرهم بعذاب اليم"! (آل عمران. ۲۱)

"جو لوگ آیات الٰہی کو جھٹلاتے ہیں" ہماری ارسطوئی منطق میں وہ یہی میٹریلسٹ، نیچرلسٹ، اور اگزسٹنسیلسٹ حضرات ہیں! لیکن خود قرآن اپنی خاص منطق کے ساتھ ان کو یکسر کسی اور طرح پہچنواتا ہے:

"وہ لوگ جو خدا کی نشانیوں (آیتوں) کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور (اس امت یا اس حزب۔۔۔ یا اس کے علاوہ۔۔۔) ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو افراد بشر کو قسط اور عدل (کے استقرار) کا حکم دیتے ہیں تم (اے نبیؐ) انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دو"!

☆......یہی وہ مقام ہے۔ جہاں "دشمن"، "دوست" کا بہترین معرف بنتا ہے۔ دشمن کی شناخت"، "دوست کی شناخت" کا بہترین ذریعہ ہے۔ یعنی پہلے ضروری ہے کہ دشمن کو صحیح طور پر پرکھا جائے تاکہ اس سے دوست کی صحیح صورت سامنے آئے۔

معاویہ، طلحہ، عبدالرحمٰن بن عوف، عثمان ......اور علیؑ کے دیگر دشمنوں کی شناخت کے بغیر علیؑ کی شناخت امکان پذیر نہیں ہوسکتی ......خود میں نے اپنے آپ کو اس وقت بہتر پہچانا جب میں نے اسی "علماء اور اسلام کا دفاع" نامی کتاب کو پڑھا! (اور اسی لئے میں آپ کو اس بات کی تاکید کرتا ہوں کہ آپ اس کتاب اور ہر اس کتاب کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں کہ جو اس "راہ" یا اس جیسی ہر "راہ" کے برخلاف ہے۔)

یہی وجہ ہے کہ ہم "بے غرض مسئول روشن خیالوں" کے لئے کوئی کتاب "ضالہ" (گمراہ کن) نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ ہر کتاب کو پڑھا جائے خواہ وہ "ضالہ" کیوں نہ ہو۔ یہی "ضالہ" کتاب ہے جو "ہدایت کی راہ" کو آشکار کرتی ہے......!

اس بنا پر آیات الٰہی کے منکر لوگ وہ ہیں جو انبیاء اور اس امت یا اس پارٹی ۔۔۔ یا اس کے سوا ۔۔۔ ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو "افراد بشر" کی برابری اور عدل و انصاف کے استقرار کی راہ میں محاذ آرا ہیں! اس بات میں تینوں مشترک ہیں، تینوں کا محاذ ایک ہے، تینوں ...... حزب اللہ یا الٰہی محاذ ۔۔۔ یعنی عوامی محاذ ۔۔۔ کے آگے کھڑے ہیں!

اسی لئے استقرار عدل وقسط ☆ کی راہ میں گروہی جدوجہد، درحقیقت انبیاء کی محاذ آرائی کو جاری رکھنے کا سلسلہ ہے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان کے ہم سنگ ہے اور ان کا قتل انبیاء کے دشمنوں کی راہ کو قائم رکھنا ہے اور الٰہی آیتوں کی نسبت کفر کے ہم سنگ ہے!

۴۔ طبقاتی کیمپ

شیعہ طبقاتی کیمپ، وہی شروع اسلامی تحریک کا طبقاتی کیمپ ہے کہ جو اچھی طرح واضح و روشن ہے۔

پیغمبر اسلامؐ، جونہی "قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" سے اپنی تحریک کا آغاز کرتے ہیں، طبقے کھل کر سامنے آتے ہیں:

قریش، اشراف، طائف کے صاحبان باغ اور سارے کاروان والے ایک قطار میں ان کے آگے مستقر ہوتے ہیں اور غریب غرباء، عبد و غلام، اور بر نعمت و فخر سے

☆ ...... میرا خیال ہے کہ آپ حضرات "عدل" اور "قسط" کے ان دونوں لفظوں کے فرق سے آشنا ہوں گے جنہیں میں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر و بیشتر روشناس کرایا ہے۔

محروم حاکم کے طبقاتی اور اشرافی نظام کے پامال شدہ لوگ دوسری قطار میں رسول خداؐ کے پاس ان کے حامی بن کر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود قرآن بھی کہتا ہے کہ قریش، رسول خداؐ کے حامیوں کی اہانت کرتے تھے، انہیں برا بھلا کہتے تھے، ان کے لئے برے الفاظ استعمال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بے سروپا گرے پڑے پست لوگ ہیں جو انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ اور بنیادی طور پر ان کے گرد کوئی صحیح، درست، محترم، معنوی، اور قاعدہ کا آدمی ۔۔۔ اسی اشرافی مفہوم میں جو آج بھی رائج ہے ۔۔۔ نہیں ہے، بس ایک مٹھی بھر "بے آبرو" ۔۔۔ یعنی "مفلس" اور ہر ناز و شرف سے خالی ۔۔۔ لوگ ہیں کہ جو ان کی باتیں سنتے ہیں، جیسے۔ یونان کے رہنے والے صہیب، بلال حبشی، سلمان فارسی اور ابوذر غفاری وغیرہ......!

پیغمبر اسلامؐ کی تحریک کے آغاز اور جزیرہ نمائے عرب میں پہلی اسلامی طاقت اور پہلے سماجی نطفہ کی تشکیل کے بعد قبائلی طاقتیں اور اشرافی طبقے بھی بحالت مجبوری اسلام کا رخ کرتے ہیں یعنی تسلیم اسلام ہوتے ہیں (نہ کہ مسلمان! اس لئے کہ مسلمان ہونا اور ہے اور اسلام کی طاقت کے آگے مطیع و منقاد ہونا اور) چونکہ وہ اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے لہٰذا "از راہ مصلحت" مسلمان ہو جاتے ہیں ۔۔۔ "سیاسی مسلمان"!☆ ۔۔۔ تا کہ اپنی طبقاتی اور اشرافی قوت کو جدید اشرافی مخالف اور طبقاتی مخالف نظام میں محفوظ کریں۔ ☆☆ مثلاً کسی قبیلے کا سردار خود سارے قبیلہ کی طرف سے اعلان کرتا تھا کہ "جی، ہم مسلمان ہو گئے ہیں"!

☆...... کہ آج اُس زمانے سے زیادہ اس کی فراوانی ہے

☆☆...... ملاحظہ فرمائیں میری نوشتہ کتاب: "قاسطین، مارقین، ناکثین"۔ (یہ کتاب اردو میں "شہسوار عرب کی تیغ لا" کے عنوان سے آئی ہے۔)

لیکن چونکہ رسول اسلام کا ہدف ساری زمین و زمان پر اپنی رسالت کا ابلاغ تھا لہٰذا آغاز تحریک میں ضروری تھا کہ جتنی جلد ہو سکے وہ اسی دنیا یعنی جزیرہ نمائے عرب کے ایک گوشہ میں ایک طاقتور مرکزی کیمپ قائم کریں تاکہ یہاں سے وہ اپنی رسالت کو عالمی اور جاودانی سطح پر مشتہر اور منتشر کریں۔ ایک ایسے کیمپ کے لئے قدرتی بات ہے کہ وہ ''فردسازی'' کے مرحلے پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے اور ایک طاقتور مرکزی حکومت سے منصرف نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ اس عظیم ہدف کو پانے کے لئے یہ بات ناگزیر تھی کہ پہلے، تین سال وہ ''فردسازی'' کے ذریعے کسی گروہ۔۔۔ یا قرآن کی زبان میں، امت۔۔۔ کو کہ جو یہی ہجرت کرنے والے لوگ ہیں، ایک پیکر دیں اور انہیں مسلح کریں تاکہ اس گروہ کے ذریعے وہ ایک طاقت اور ایک حکومت کو وجود میں لا کر اپنی رسالت کا ابلاغ کریں۔

لہٰذا چونکہ ''فردسازی'' کے بعد اسلامی حکومت و طاقت کی تشکیل کا مرحلہ اس عالمی تحریک کے لئے ضروری تھا بہ این سبب بہت سے قبائلی اشراف اپنی اسی طبقاتی اور اشرافی خصوصیات کے ساتھ داخل اسلام ہوئے اور اسلام کی طاقت کا حصہ بنے۔

ان میں ابوسفیان اور قریش وہ افراد تھے کہ جب رسول خدا وارد مکہ ہوئے تو ان لوگوں نے بحالت مجبوری اسلام قبول کیا اور کچھ دن بعد جب رسول خداؐ، ھوازنیوں سے کہ جو بہت خطرناک لوگ تھے عازم جنگ ہوئے تو ان ہی لوگوں نے آپ کے محاذوں کے بازوؤں میں سے ایک بازو کی تشکیل کی۔ یہ وہی لوگ تھے جو چند دن پہلے جبراً مسلمان ہوئے تھے، یعنی جناب رسالتمآبؐ، فتح مکہ کے بعد قریش اور ھوازنیوں کے درمیان تضاد و خصومت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوری طور پر انہیں

ھوازیئیوں سے نبٹنے کے لئے مجتمع کرتے ہیں تا کہ اسلام کے مرکزی مقام کے منہ پر کھڑے دشمنوں کی نابودی کے لئے ان کے زر اور زور سے استفادہ کریں۔ یا پھر وہ اسی امیہ بن خلف سے سو عدد زرہ حاصل کرتے ہیں کہ جو ان کی نئی ابھرنے والی تحریک کے لئے ایک بہت بڑا دھن تھا۔

بنابرایں جناب رسالتمآبؐ اس دوسرے مسئلہ۔۔۔ یعنی ایک طاقتور مرکزی حکومت کی تشکیل۔۔۔ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجبوراً، ساری طاقتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ''اسلام'' کے اس واحد سرپوش تلے اور اس واحد حکومت کے متن میں کہ جس کی بنیاد مدینہ میں رکھی گئی تھی، دو بازوؤں کی موجودگی ہے: ایک، مسلمانوں کا پہلا بازو کہ جو پیغمبر اسلام کی تحریک کے ابتدائی دنوں میں دائرہ وجود میں آیا اور اس کی تشکیل اس محروم جمعیت سے ہوئی کہ جو اشرافی استثمار (استعمار کی ایک قسم) اور دشمن نظام سے چھٹکارا پانے کے لئے پہلے اسلام میں داخل ہوا اور پھر اسے اسلام کی معنویت اور روحانی پرورش سے آگاہی ہوئی۔

دوسرا بازو اشراف کا ہے کہ جس نے اس تحریک اور اسلام کے اس پہلے اشرافی دشمن اور اصیل و اعلیٰ بازو سے جنگ کی اور پھر شکست و زوال کے بعد مجبوراً اسلام کا رخ کیا تا کہ اس انقلاب میں داخل ہونے کے بعد شاید وہ اپنے پچھلے طبقاتی روابط اور مفادات کو نئے عناوین، نئے سانچوں، اور نئے نعروں کے خول میں قائم و دائم رکھ سکیں۔

یہ دونوں دائیں اور بائیں بازو، اس وقت تک جب تک کہ پیغمبر اسلامؐ کے

ہاتھ میں امت کی رہبری رہی، اسلامی معاشرے کے متن میں ایک دوسرے کے ساتھ مشترک اور مخفی صورت میں زندگی گزارتے رہے...... مگر بعد پیغمبرؐ جب انقلاب کی رہبری دوسرے بازو کے ہاتھ میں آئی تو یہ دونوں بازو کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آئے......

یہاں میں اس نکتہ کو بتاتا چلوں کہ...... سقیفہ کے انتخابات، سقیفہ کے بعد کی تقرری، شوراء خلافت، حضرت علیؑ سے متعلق انتخابات اور ان جیسے تمام مسائل کو کہ جو جناب رسالتمآبؐ کے بعد ظہور میں آئے ہیں، طبقاتی تضاد میں جستجو کرنے کی ضرورت ہے مثلاً وہ شوریٰ جسے حضرت عمر نے بعد کے خلیفہ کے لئے معین کیا مکمل طور پر اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے:

اس شوریٰ کے چھ افراد پر مشتمل ارکان میں سے پانچ افراد میں: سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ، زبیر، اور عثمان شامل ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ چھٹے رکن حضرت علیؑ کسی طرح بھی انکا جز نہیں بنتے اور ہم نے دیکھا کہ وہ تنہا رہ گئے ...... یہ پانچوں افراد، دور جاہلیت میں بھی اور اسلامی تحریک کے آغاز کے بعد بھی حاکم طبقے سے وابستہ ہیں، پیغمبر اسلام کے خالص ترین اور قریب ترین اصحاب میں سے کوئی بھی اس شوریٰ میں نہ شریک کیا گیا اور نہ اس نے خود چاہا ہے، اسکی مثال میں ہم سلمانؓ کو لاتے ہیں جو رسول خداؐ کے انتہائی عزیز القدر صحابی اور اہلبیت کے منظور نظر تھے (...... یہاں تک کہ خود رسول خداؐ نے انہیں اپنے اہلبیت کا جزء قرار دیا ہے)☆ یہ وہ ہستی ہے کہ جو شعور و شخصیت اور نیز علمی اعتبار سے بے نظیر ہے لیکن انہیں بھی حق

☆ خلیفہ، از خود انکے نام کو اہلبیت کی فہرست میں لکھتے اور اہلبیت کا واجبی حق انہیں دیتے ہیں......

حاصل نہیں یا وہ نہیں چاہتے کہ سقیفہ، بعد سقیفہ اور شوریٰ خلافت میں ان کا کوئی پارٹ ہو۔ یا پھر ابوذر، جن کی رسول خداؐ نے اتنی تعظیم و تجلیل کی ہے حتیٰ کہ آپ انہیں ایک علمی مرجع اور عظیم ترین عالم کے عنوان سے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ابوذر نے اتنا کسبِ علم کیا ہے کہ ان کا سینہ اس ذخیرہ سے لبریز ہوگیا ہے۔''☆ ان کا بھی خلفاء کے انتخابات میں کوئی دخل نہیں ہے...... بلکہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے بھی ان کو اپنی مشورت میں نہیں لیا گیا ہے۔

اگر میں ایک ایک کرکے ان پانچوں افراد کو طبقاتی نقطہ نظر سے پہچنوانا چاہوں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سب کا تعلق سرمایہ دار اشراف طبقے سے ہے بلکہ اسلام کے بعد کے دور میں بھی یہی صورت رہی ہے۔ مثلاً خود حضرت عمرؓ، عبدالرحمٰن بن عوف کے بارے میں کہ جو خلافت کے لئے ان کے بعد کے کنڈیڈیٹ اور خلافتی شوریٰ کے صدر ہیں اور نیز ویٹو کا ''حق'' (!) بھی انہیں حاصل ہے، کہتے ہیں: ''عبدالرحمٰن بن عوف میں صرف ایک عیب ہے اور وہ یہ کہ وہ قارونِ امت ہیں''!؟..... یعنی قارونِ امت، خلافت کی شوریٰ کمیٹی کا صدر بنتا ہے! (یہ نکتہ بہت سمبولیک ہے۔)

آخر کیوں اور کس طرح ''قارونِ امت'' پیغمبر اسلامؐ کے خلیفہ کا انتخاب کرسکتا ہے؟..... حضرت عمر کی بات میں معاملہ، اتنا سادہ نہیں ہے۔ بہت واضح ہے کہ 'قارون'' کس کا انتخاب کرتا ہے، بلاتردید ''فرعونِ'' امت یعنی عثمان کا کہ جو ان کی

☆ ......اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ علم، ...... فزکس، کیمسٹری، فلسفہ، فقہ، اصول اور تفسیر...... نہیں ہے، وہ آگاہی و بصیرت ۔۔۔ حکمت ۔۔۔ ہے جسے رسولانِ الٰہی، افراد بشر کو دیتے ہیں۔ ایک ایسی حکمت کہ بعض اوقات، ابوعلی سینا جیسے عظیم فلسفی بھی اس سے بے بہرہ ہیں لیکن ابوذر جیسا خراب و خستہ و سرگرداں انسان اس سے لبریز ہوتا ہے!

سالی کا بیٹا بھی ہے!؟ اور بلاشبہ علیؑ کو ایک طرف کر دیگا۔ اور ہم نے دیکھا کہ کیا۔

......سعد بن ابی وقاص بھی عبدالرحمٰن بن عوف کی طرح، بنی زہرہ کے اشراف میں سے ہے۔ زبیر کے ایک ہزار غلام ہیں جو شب و روز کام کرتے اور سختیاں جھیلتے ہیں اور پھر اپنی مزدوری اور محنتانہ کو جناب زبیر کی مٹھی میں رکھتے ہیں۔ ان کی علیؑ سے بھی رشتہ داری ہے (یہ عبدالمطلب کی بنی صفیہ کے بیٹے ہیں) لیکن اس کے باوجود ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ وہ طبقاتی اساس ''طبقاتی وابستگی'' کو حتیٰ اس دور میں بھی جبکہ اس کی اصالت قائم ہے توڑتے ہیں!

لیکن علیؑ کے طرفدار، بہت صاف ہے کہ کون لوگ ہیں۔ (البتہ میرا مطمح نظر یہاں صرف طبقاتی کیمپ ہے نہ کہ دینی، معنوی اور علمی منزلت کی بحث)۔ ان میں سے ایک سلمان ہیں، فارس۔۔۔ ایران۔۔۔ کی ایک بے خانماں ہستی کہ جو ایک یہودی کی غلامی میں تھے اور پھر عربوں نے انہیں خرید لیا تھا۔ آزادی کے بعد انہوں نے محنت مزدوری کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔

دوسرے، ابوذر غفاری ہیں کہ نہ ان کا شمار مہاجرین میں ہوتا ہے اور نہ انصار میں، نہ وہ اشرافِ قریش میں آتے ہیں اور نہ ان کا تعلق مدینہ کے بااصل و نسب قوم و قبیلہ سے ہے۔ ایک تنہا اور بیکس انسان ہیں جن کی آمد صحرا سے ہوئی ہے اور جن کا بسیرا مسجد ہے۔

تیسرے، میثم ہیں، ایک خرما فروش، کہ البتہ ان کی کوئی دکان نہیں ہے بلکہ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر ایک تختہ پر کھجور بیچتے ہیں...... یہ علیؑ کے بہت بڑے صحابی ہیں اور اس سے پہلے خود رسول خداؐ کے اصحاب میں ان کا ایک اعلیٰ مقام رہا ہے۔

جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے بعد انہوں نے (خلفاء کے مقابل) علیؑ سے اپنی وفاداری باقی رکھی۔

چوتھے، ''عمار'' ہیں، اور یہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے علیؑ سے اپنی وفاداری قائم رکھی۔ ان کی والدہ گرامی سُمیہ، حبش کی سیاہ فام خاتون تھیں اور اشراف مکہ سے تعلق رکھنے والے کسی گھرانے میں کنیز کی حیثیت سے رہتی تھی۔ ان کے والد کا تعلق نہ اشراف سے تھا اور نہ اوس وخزرج کی بڑی شخصیتوں سے۔ وہ ایک صحرائی آدمی تھے کہ جو مکہ کے اسی اشرافی گھرانے میں کہ جو اسی کے قوم وقبیلے کے اتحادی تھے، مہمان بنے اور وہیں وہ سمیہ کے عشق میں مبتلا ہوئے اور پھر ان سے شادی کی۔ اور یہی بات واضح کرتی ہے کہ ان کا طبقاتی مقام کیا تھا۔

پانچویں صہیب ہیں جن کا تعلق یونان سے ہے......

اس دوران معدودے چند لوگ ایسے ہیں جن کی وابستگی اشراف اور حاکم طبقے سے ہے۔ جن میں ابن عباس، عقیل اور (جناب رسول خداؐ اور حضرت علیؑ کے چچا) عباس آتے ہیں۔ علیؑ کی نسبت ان کی جانبداری بسا اوقات گھریلو وابستگی کی بنیاد پر عمل میں آتی ہے، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس راہ میں اتنا اصرار اور اتنی جستجو نہیں کرتے جتنی سلمان، ابوذر، عمار اور میثم کرتے ہیں...... یہاں تک کہ زبیر جیسا آدمی جو شروع میں علیؑ کا حامی تھا وقت گزرنے کے ساتھ ایک ایسی راہ پر آجاتا ہے جو حاکم کی اشرافی طاقت کی راہ ہے اور وہ اس راہ پر اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جنگ جمل میں علیؑ کے سامنے آکر ان کے رودررو لڑتا ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے نوظہور انقلاب کی رہبری کے پہلے دور کے بعد

جب وہ محروم طبقہ کہ جو اسلامی عدالت و آزادی کی چاہ میں توحید کے پرچم تلے آیا تھا، یہ دیکھتا ہے کہ اب وہ پھر نئے اشرافی طبقے کے مقابل آ گیا ہے تو جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے فوراً بعد اپنی محاذ آرائی کو معین کر کے علیؑ کے گرد حلقہ ڈال دیتا ہے۔ اور اس طرح ...... علیؑ اسلامی عوامی انقلاب کے رہبر و امام اور نوظہور اسلام کے مظہر کے عنوان سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ☆

دوسری طرف سے بھی وہ قدیم اشرافیت کہ جو رسول خداؐ کی تحریک کی کامیابی کے بعد اسلام کی طبقات دشمن انقلاب کی تابعدار ہو گئی تھی (تا کہ مناسب موقع ملتے ہی سر نکال کر اپنے سابقہ طبقاتی روابط کو، طبقات مخالف اسلام کے سرپوش تلے جاری کرے۔) اور جناب رسالتمآبؐ کی زندگی کے آخری لمحہ تک محروم طبقہ کے دوش بدوش بڑھتی چلی آئی تھی بڑی تیزی سے اپنے طبقاتی مقام کو مشخص کرتی ہے اور پہلی فرصت میں، اسلام کی عدالت خواہی اور طبقات دشمن آواز کو سقیفہ میں گھونٹتی اور اس کے مظہر کو گھر بٹھا دیتی ہے......

اس طرح، بعدِ پیغمبرؐ، اسلام کو اس کی راہ سے منحرف کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر وہ بنی عباس اور خاص کر مغلوں، ایلخانیوں، اور تیموریوں کے دور میں سو فیصد استثماری اور استبدادی نظام کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔۔۔ تسنن!۔۔۔ حاکم طبقہ سے وابستہ ان علماء و فقہا نے کہ جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کی حیاتِ طیبہ کی آخری گھڑیوں میں حکومت کو عوام سے لیکر پھر واپس نہیں کیا، اپنے ڈھالے ہوئے سانچوں کو "اسلام"۔۔۔ سنت پیغمبر؟۔۔۔ کے نام سے مساجد اور دینی مجامع میں پیش کیا۔

☆...... میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہاں میری گفتگو خالصتاً طبقاتی ہے

اس طبقے کے مقابل، محروم طبقہ ہے اور اسی میں علیؑ ہیں۔۔۔ مظہر عدالتِ مظلوم اور "لا" ئے اسلام کی انقلابی روح کی جلوہ گاہ...... وہ "لا" کہ جس سے عوامی اور اشراف مخالف انقلاب کا آغاز ہوا اور پوشیدہ اشرافی اور عوام دشمن استعمار نے اس پر انتخاباتی کوپ (Coup) کیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوا! اس طرح کہ، حضراتِ ابوبکر وعمر اس بیچ صرف "حلالے" تھے تاکہ اسلامی معاشرے کی رہبری کو رسول خداؐ کے ہاتھ سے نکال کر بنی امیہ جیسے مظہرِ اشرافیتِ قریش اور دشمن اسلام و دشمن پیغمبر اسلامؐ کے ہاتھ میں دیں!...... اس لئے کہ ہم نے دیکھا کہ ان کی حکومت بھی ۱۲ سال سے زیادہ نہیں رہی۔ ☆

اس طرح حضرت ابوبکر کے زمانے میں اسلام کا رجحان "سیدھی" سمت رہا۔ حضرت عمر کے زمانے میں اس کی شدت بڑھ گئی، یہاں تک کہ حضرت عثمان کے زمانے میں اس نے ایک زغند لگائی اور...... جب بنی امیہ کی گود میں گرا تو پھر تاریخ پر حاکم نظاموں کی طرح اس نے مکمل طور پر قیصری اور خسروی صورت اختیار کی تاہم سنت پیغمبر نامی لبادہ کے ساتھ: تسنن!

☆...... اس لئے کہ حضرت عثمان کا تعلق بھی بنی امیہ سے ہے بلکہ حقیقت میں یہ ان کے بانی ہیں۔ یہ ناانصافی ہوگی کہ ہم انہیں حضرات ابوبکر اور عمر سے ملائیں۔ ازبسکہ، بیشتر تاریخ نگار حضرات تخمین سے کام لیتے ہیں اسی لئے وہ حضرت عثمان کو صرف اس دلیل پر کہ ان کا انتخاب حضرات ابوبکر وعمر کی انتخابی صورت سے ہوا ہے اور علیؑ ان کے بعد خلیفہ ہوئے ہیں، بنی امیہ سے نہیں جانتے۔ حالانکہ وہ طبقاتی لحاظ سے بھی، طرزِ حکومت کے اعتبار سے بھی، گھریلو نقطہ نظر سے بھی اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے بھی بنی امیہ سے ہیں اور ان کی بنیاد فراہم کرنے والے ہیں۔

معاویہ نے وہ کچھ نہیں کیا جو حضرت عثمان نے کیا!

ہر چند کہ ابوذر کے حملے کی تیز دھار معاویہ کی سمت رہی لیکن اس کے باوجود وہ معاویہ کے ہاتھ سے مارے نہیں گئے بلکہ حضرت عثمان نے انہیں مارا۔

پس جناب رسالتمآبؐ کی حیات کے ان ہی آخری ساعتوں کے بعد اور اس کے اسی ابتدائی دن سے ۔۔۔ سقیفہ کے مقابل☆ ۔۔۔ اہل تشیع کی طبقاتی قرار گاہ معین اور مشخص ہو جاتی ہے۔ علیؑ کے گرد جمع ہونے والوں میں کا ہر فرد، تشیع کی اشرافی مخالف تحریک کی طبقاتی قرار گاہ کا سمبل ہے۔ وہ تحریک جس کے بانی علیؑ ہیں۔ علیؑ اپنے دور حیات میں، مظلوم و محروم طبقے کے مظہر و امام ہیں؟ اور اپنی حیات کے بعد نیز اس طبقے کی ساری آرزوؤں اور سارے دکھ دردوں کی جلوہ گاہ ان کے امام اور ان کے لئے نمونہ عمل ہیں۔ اور صورت یہ ہے کہ جس قدر نو خیز اشرافیت بڑھتی اور فزوں تر ہوتی ہے، حاکم طبقہ ۔۔۔ اہل سنت (نہ کہ تسنن کہ جو ایک نام ہے) ۔۔۔ محروم و مظلوم طبقے کی نظر میں دیو کی صورت اختیار کرتا ہے اور علیؑ خدا کی صورت! اور یہ وہی ڈیالکٹیکی رابطہ ہے جس کی طرف میں نے بارہا اشارہ کیا۔

لیکن جدید اشرافیت کی روز افزوں طاقت کی فزونی کے مقابل، شیعہ طبقات مخالف تحریک، پسپا تر اور پامال تر ہوتی ہے...... یہاں تک کہ اس طرح کی اشرافیت کے وہ عناصر جو جناب رسالتمآبؐ کے خود کے ہاتھ سے نکال باہر کئے گئے تھے۔ ایک بار پھر واپس لوٹ آتے ہیں اور نئے سرے سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ رسول خداؐ کے اپنے ہاتھ سے جلاوطن کئے گئے کعب الاحبار جیسے لوگ، کہ جن کو واپس لانے کی

☆...... سقیفہ کے انتخابات کو رؤساء انصار ۔۔۔ یا مدینہ کے اشراف ۔۔۔ عمل میں لاتے ہیں تا کہ اپنے اندر سے خلیفہ کو منتخب کریں۔ لیکن رؤساء مہاجرین ۔۔۔ یا اشرافِ مکہ ۔۔۔ اس انتخاباتی کوپ (Coup) میں حکومت کو اپنے رقیبوں کے ہاتھ سے اچک لیتے ہیں کہ "خلیفہ کا قریش سے ہونا ضروری ہے" اور وہ رسولؐ کا گھرانہ ہے!؟

علیؑ کہتے ہیں کہ ۔۔۔ آخر اس صورت میں بھی ۔۔۔ میں رسولؐ کے گھرانے سے ہوں یا تم کہ جو پیغمبرؐ کی بیوی کے باپ (یعنی سسر) ہو؟!......

جرأت حضرات ابوبکر و عمر نے بھی نہیں کی تھی جناب رسالتمآبؑ کے ٹھیک ۱۲ سال بعد بنی امیہ کی حکومت میں لوٹ آتے ہیں اور خلیفۂ رسول (؟) کے دست راست بن جاتے ہیں !...... اور پھر کسرائی شان و شوکت اور جاہ و جلال، قیصری بذل و بخشش، طبقاتی تضاد، بردہ خریدی اور بردہ فروشی اور استثمار و استبداد بھی کچھ رونما ہوتا ہے۔ سونے کے بڑے بڑے صاحبان بار، ''صحابی'' (!) ہو جاتے ہیں اور بڑی سہولت سے اس عنوان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں !...... کہ اب کوئی بات نہیں، در پردہ اشرافی طبقہ پھر نئے سرے سے ظفریاب ہو گیا ہے......

......علیؑ کے بعد کہ جو شیعہ عوامی تحریک کے پہلے رہبر ہیں، امام حسنؑ اس تحریک کے مظہر بنتے ہیں۔ یہ اسلامی طاقت کے آخری باضابطہ مرکز ہیں کہ جو داخلی استعمار کے مقابل شکست سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ معاویہ کے ساتھ امامؑ کی صلح کے بعد یہ حرکت و عدالت والے اسلام کا آخری مرکز، قوت و اشرافیت والے اسلام کے ہمہ گیر اور علی الاتصال ہجوم کے مقابل شکست سے دوچار ہوتا ہے اور اس کی جنگ منظم حکومتی جنگ کی صورت سے ''عوامی'' مبارزہ کی صورت میں اتر آتی ہے کہ جو تاریخ میں شیعہ طبقاتی قرارگاہ کا ایک نہایت مشخص باب ہے۔

محروم طبقے۔۔۔شیعہ۔۔۔۔نے کہ جس نے سقیفہ کی تشکیل کے فوراً بعد سے کوپ کے ان بازیگروں کے مقابل اپنے طبقاتی کیمپ کو پورے طور پر مشخص کیا تھا، حکومت کے آخری مورچہ کو کھونے کے سبب اس اشرافی اور عوام دشمن طبقہ کے خلاف کہ جس نے حکومت اور طاقت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، اپنی منظم مخصوص اور آشکار محاذ آرائی کو نامنظم، انڈر گراونڈ اور ''عوامی'' مبارزہ کی صورت دی۔

امام حسینؑ عاشورہ میں اپنے عوامی انقلاب کے ساتھ، اشرافی حاکم نظام کے پیر پر اتنی بڑی، اتنی شاندار اور اتنی خوبصورت ضرب لگاتے ہیں۔ ایک ایسا انقلاب جس کے راہبر اور راہرو ''عوام'' کے بیچ سے، عوام کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ امامؑ جانتے ہیں کہ ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوگی اور جانتے ہیں کہ عوام دشمن حاکم نظام اس قدر فوجی اور تبلیغاتی طاقت کے ساتھ شکست سے ہمکنار نہیں ہوگا، لیکن یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر وہ ابھی فوری طور پر اپنے لہو سے اعتراض نہیں کریں گے تو یہ اسلام دشمن، عوام دشمن، تجملی اور موروثی نظام کہ جو اس وقت برسر اقتدار ہے، برسوں، اسلام اور سنت پیغمبرؐ کے لبادہ میں لوگوں کو اسارت و بدبختی میں مبتلا کرے گا اور وہ بھی اللہ کی رضا اور مقدس ترین اقدار کے نام پر!

امام حسینؑ کے بعد بنی امیہ کی حکومت شام کی سرحدوں سے آگے نکل کر اسلامی سرزمینوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلتی ہے۔ موجودات میں غلیظ ترین عناصر ان متشدد، ستمکار، اور انسان دشمن امپراطوری طاقت کے حامل مسندوں کو اختیار میں لیتے ہیں اور اپنی طاقت کو عائد کرنے اور اس کی حفاظت کی راہ میں ہر کام اور ہر عمل کو جائز اور روا سمجھتے ہیں بلکہ لازم اور ضروری جانتے ہیں! یہ لوگ عوام دشمن ترین افراد کو لوگوں پر مسلط کرتے ہیں۔ اور اس قدر وحشت، گھٹن، اور ہراس پیدا کرتے ہیں کہ صرف یہ نہیں کہ مسلحانہ جنگ کی صورت پیش نہ آئے بلکہ فکری محاذ میں مبارزہ، حق گوئی اور تبصرہ کی جرأت بھی کسی میں پیدا نہ ہو!...... یہاں تک کہ جب جلاد حاکم معاویہ، مسجد میں علیؑ کو لعن کرتا ہے اور حجر بن عدی، اس پر اعتراض کرتے ہیں تو وہیں وہ ان لوگوں سے، اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف فتویٰ صادر کرتے

ہیں کہ "...... یہ لوگ دین سے خارج ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اسلامی امت میں رخنہ ڈالا، اور خلفشار پیدا کیا ہے......!" اور (نام نہاد) مومنین کے اس فتوے کی بنیاد پر وہ ان کا قتل عام کرتا ہے۔ ☆

......صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک جانب سے محروم و مظلوم طبقہ، شیعہ ائمہ کی رہبری میں، اپنے دشوار ترین زیر زمین مبارزات کو مضبوط ترین ارادے کے ساتھ، ممکنہ دشوار ترین صورت حال میں وسعت دیتا ہے...... اور دوسری جانب سے بھی خونی حاکم طبقہ --- تاریخ پر چھائے ہوئے اپنے خونخوار ترین استعماری، استثماری، اور استبدادی طرز عمل کو اسلام کے لبادہ میں، سنت پیغمبرؐ --- تسنن --- کے نام سے جاری رکھتا ہے۔

اس بنا پر ایک طرف سے شیعہ اور ائمہ اہلبیتؑ کا طبقاتی کیمپ، اور دوسری طرف سے ان کے سامنے کی طرف کا طبقاتی کیمپ، طول تاریخ میں، بالکل مشخص اور بہت روشن ہے۔

۵۔ طبقاتی وابستگی

بہت صاف اور بہت واضح ہے کہ "طبقاتی کیمپ (محلِ حرکت)" اور ہے اور "طبقاتی وابستگی" اور اس سے ہٹ کر کہ طبقاتی کیمپ، حزب یا گروہ کی ایک ضرورت ہے، طبقاتی وابستگی بھی حزب کی ایک ذاتی خصوصیت ہے، اور بنیادی طور پر، اسلام میں اور خصوصیت سے تشیع میں حزب، امت اور "قوم" ایک مشخص اور روشن طبقاتی

☆ ......جی ہاں۔ پہلے مومنین سے فتویٰ لیتے ہیں......

وابستگی کو اپنے بطن میں نہفتہ رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اس صورت کے بغیر، اس حزب کی جہانی اور جاودانی ذمہ داری اور اس کا ہدف وہی صورت اختیار کریگا جن کے امثلہ کو میں نے اس سے پہلے حافظوں میں تازہ کیا تھا۔

یہاں مجھے یاددلانا ہوگا کہ ''طبقاتی امنگوں کی برآوردگی'' کہ جو طبقاتی وابستگی کا ہدف ہے، سے میری مراد عوام الناس کی فقط معاشی اور ماڈی فوائد کی برقراری نہیں گو کہ موجودہ نظام اور حاکم کے شرائط میں یہی ''معاشی مفادات'' ہیں کہ جو اصلی، اہم، بڑے اور بنیادی ہیں اور اس طرح کے طبقاتی مسائل☆ کی بنیاد اور اس پر قائم عمارت کی تبدیلی (یعنی اس کے بود و نمود کی تہ و بالائی) کے بغیر ہر طرح کی محاذ آرائی، چونکہ عینی ہدف و غایت سے عاری ہے اور اس کا وجود صرف ''عالم ذہن'' میں ہے اس لئے یہ صرف متکلموں متفلسفوں اور پیشہ ور روشن خیالوں کے کام کا ہے!

بہت سی اصیل اور متمدن تہذیبیں کہ جو حتیٰ اصیل الٰہی اصولوں پر استوار رہی ہیں صرف اس لئے کہ انہوں نے معاشرے کے موجود طبقاتی مسائل کی بنیاد اور اس کے اوپر کی تعمیر (گویا اس کے ''بود'' و ''نمود'') کو اپنی آئیڈیالوجی اور اپنے عمل کے قالب میں ذہنوں اور عین معاشرے کے بیچ رائج نہیں کیا لہٰذا اگر وہ کامیاب بھی ہوئیں تو کامیابی اور کہنہ نظام کی ظاہری تبدیلی کے فوراً بعد انحراف سے بھی دوچار ہوئیں اور ان کے مبارزات اور جہاد کے سارے ثمرات، پھر ان طاقتور طاقتوں کے ہاتھ آئے کہ

☆...... یہ بتانا بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ ''طبقاتی مسائل کی بنیاد'' میں، آئیڈیالوجی کا وہ حصہ تحریک کی اساس ہے کہ جو معاشرے کے معاشی مسائل اور اس کی عینی طبقاتی تعمیر و ترکیب کو پیش کرے تاکہ معاشرے کے وجدان میں ان کو دگرگوں کرکے وہ لوگوں کو اس کی بالائی سطح کی دگرگونی کے لئے مجتمع کرے۔

جو درحقیقت پچھلے طبقاتی نظام کے رسم و رواج کے سلسلے کو جاری رکھنے والے تھے اور اس کی مثال میں ہم ایران کی مشروطہ تحریک کو پیش کرتے ہیں۔

صفویہ تحریک (صفوی حکومت کی تشکیل سے پہلے) ایک شیعی تحریک ہے کہ جو بہت ترقی پسندانہ اور انسانی اقدار و اصول کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے، لیکن چونکہ اس نے بھی اپنے معاشرے کے طبقاتی مسائل کو اپنی تحریک کی آئیڈیالوجیکی نیو، اور اپنے عملی مبارزات کی عمارت میں قرار نہیں دیا اس لئے سابقہ نظام کی ظاہری تبدیلی کے بعد، نئے نظام میں تحریک کی رہبری، اسی سابقہ حاکم نظام کے ہاتھ لگی اور قدیم طبقاتی روابط کہ جو معاشرے کی عمارت تھی۔۔۔ اور اس کی تبدیلی شیعہ گروہ کی تحریک کا سب سے بڑا ہدف تھا۔۔۔ نہ صرف یہ کہ صحیح طور پر تبدیل نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئی! اس دوران جس تنہا چیز میں تبدیلی آئی وہ حاکم طبقہ کا ''مرجعِ محبت'' تھا! اس مفہوم میں کہ سابقہ نظام میں حاکم طبقہ ''خلفاء'' کی محبت کو دل میں سمائے ہوئے تھا لیکن اس کے بعد اس ناقص تحریک نے ''ائمہ اہلبیت'' کی محبت کو دل میں جاگزیں کیا (اور بس)۔ ☆

جی ہاں، طبقاتی روابط اور عوام الناس کی زندگی کی کیفیت صفویوں کی کامیابی سے نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بدتر بھی ہوئی! اگر ہم ''تشیع'' کو شخصی، ذہنی، اور تجربی ''محبتوں'' اور اعتقادوں کا مجموعہ قلمداد نہ کریں اور اس کو خاص سوسائٹی کی زندگی جانیں کہ جو۔۔۔ موجود مسلم متون کی بنا پر۔۔۔ عوام کے

☆......اس علمی مطالعہ کے لئے آپ ''قاسطین، مارقین، ناکثین'' نامی کتاب سے (جس کا اردو ترجمہ ''شہسوارِ عرب کی تیغ لا'' کے نام سے شائع ہوا ہے) رجوع فرما سکتے ہیں۔

مفاد میں، مشخص طبقاتی ارتباط کا حامل ہے تو پھر وہ ساری مجردی، ذہنی ترتیبات جو پچھلے افراد اور پچھلے نظاموں سے ہمارے پاس ہیں بگڑ جائیں گی اور ہم دیکھیں گے کہ مثلاً عمر بن عبدالعزیز، اور شاہ سلطان صفوی میں کسی طرح بھی مماثلت نہیں ہے۔ آج بھی دنیا میں ایسے لوگ ہیں جنہوں نے سرے سے علیؑ کا نام سنا ہی نہیں ہے لیکن علوی تشیع کی منطق کے مطابق ان لوگوں سے زیادہ شیعہ ہیں کہ جو علیؑ اور ان کی اولاد کے مداح ہیں۔ مثلاً افریقہ کے استعمار دشمن ہیرو پیٹرس لومبا کی سماجی اور فکری جہت، میری نظر میں اس فلاں آدمی سے کہ جس نے علیؑ کی شرح زندگی پر کتاب لکھی ہے، تشیع کی سماجی اور فکری جہت کی راہ سے زیادہ قریب تر ہے لیکن ''ترجیح و فوقیت''!؟ ولیکن سر ہتھیلی پر رکھنے والوں'' یا دوسرے لفظوں میں کفن پوشوں کی تحریک وہ تحریک ہے کہ جو اعتقادی اصولوں کے نقطہ نظر سے صفوی تحریک کی طرح تشیع کے اعتقادی اصول پر استوار ہے لیکن اس کے برخلاف، اس نے طبقاتی مسائل کو نظر و عمل کے دونوں محاذوں پر سختی سے رائج کیا ہے۔

جس طرح۔۔۔ حضرت علیؑ سے لے کر بعد تک کی۔۔۔ ساری تحریکیں ہمیشہ اس بات کی درپے رہی ہیں کہ معاشرے کی طبقاتی ترکیب اور اس کی داغ بیل کو دگرگوں کرنے کے لئے، معاشرے کی وجدانی اور اعتقادی فضا کو دگرگوں کریں۔ اس رُو سے سر ہتھیلی پر رکھنے والوں نے بھی ارادہ کیا کہ وہ رسول خداؐ کے گھرانے کی یاد اور علیؑ کے مکتب اور علیؑ کی راہ کو زندہ کرنے کے لئے اس خاص سماجی نظام کا احیاء کریں کہ جس کے علیؑ اور شیعہ ائمہ حامی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس تحریک نے اپنے آغاز ہی سے اس امر کے ساتھ ساتھ کہ اس نے حاکم نظام کی آئیڈیالوجی اور

اعتقادی اساس سے ٹکر لی، اس کی سماجی عمارت سے بھی انتہائی شدید مبارزہ کا آغاز کیا، ☆ ایک طرف سے اس نے اپنے شاندار علمی، فکری اور اعتقادی مبارزہ کے ساتھ آئیڈیالوجیکی نیو کے محاذ کو کھولا اور دوسری طرف سے اپنے مسلحانہ مبارزہ کے ساتھ سماجی عمارت کے محاذ کا افتتاح کیا، ایک سمت سے اس نے اس آئیڈیالوجی نیو کے نگہبانوں۔۔۔یا اہل سنت کے علماء۔۔۔ ☆☆ سے فکری پیکار کا آغاز کیا اور دوسری

☆......اس طرح کی دو محاذوں والی علمی اور عملی (آئیڈیالوجیکی اور پریکٹیکلی ۔۔۔ بنیادی اور بالائی) جنگ اسلام کے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے عین موافق ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے متون میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تین عملداریوں میں: ا۔ ''ذہن'' (یا فکر) ۲۔ بیان (کہ مجموعی طور پر ہم اسے آئیڈیالوجی کہہ سکتے ہیں) اور ۳۔ ''عمل'' ...... میں ذکر کیا ہے۔ اس سے زیادہ ظریف نکتہ یہ کہ، ان ہی اسلامی متون کی بنیاد پر، لفظ ''مومن'' کا اطلاق کہ جسے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس پر ہوتا ہے کہ: ا۔ ''معترف بہ قلب (عقل) ۲۔ مقر بہ لسان اور ۳۔ عامل بہ جوارح'' ہو!

''کنتم خیر امۃ اخرجت للناس''، ''تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر'' و ''تومنون باللہ''!

☆☆......جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے فوراً بعد، ''محمدی تسنن'' نے ''اموی تسنن'' میں تبدیل ہو کر ''سرکاری مذہب'' کی صورت اختیار کی۔ اس کے بعد یہ ''علوی تشیع'' ہے کہ جس نے ''محمدی تسنن'' کی اصل تحریک کو اسی ''عوامی اسلام'' کی شکل میں جاری رکھا...... یہاں تک کہ بالآخر صفوی حکومت کی تشکیل کے بعد اس نے بھی ''صفوی تشیع'' کی ماہیت اختیار کی اور ''عوامی کٹھیا'' سے اکھڑ کر اسی طرح ''قصر شاہی'' سے چپک گئی جس طرح ''اموی تسنن''، ''ایوان خلیفہ'' سے جا چپکی تھی! اس طرح ''اموی تسنن'' اور ''صفوی تشیع'' کی ماہیت ایک ہو گئی: ایک نے ان کی ''خلافت'' اور دوسرے نے ان کی ''سلطنت'' کی توجیہ کی۔ ایک نے خلفاء کے ''محبت'' کی اور دوسرے نے اہلبیت کے ''محبت'' کی ترویج کی۔ ان دونوں میں بس ایک چیز مشترک تھی اور وہ عوام الناس کا استحمار و استبداد و استثمار تھا دو مختلف ناموں سے!...... ''اموی تسنن'' عثمانی حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھی اور ''صفوی تشیع'' صفوی حکومت کے زیر سایہ۔ ان دونوں ہم منصب

سمت سے اس سماجی عمارت کے محافظوں سے۔۔۔ یا ان بڑے پرگنوں، جاگیرداروں اور مغل صاحبان املاک سے کہ جو اس دور کے کسانوں اور محنت کشوں کا وحشیانہ انداز میں استثمار اور استبداد کرتے تھے۔۔۔ خونریز جنگ کی۔

لیکن صفوی تحریک میں چونکہ تحریک کے رہبروں نے ''مالکیت'' کی بات نہیں کی اس رو سے قدیم نظام کے ''حاکم طبقے'' نے ''تشیع''، اور علیؑ اور دیگر اہلبیت کی محبت کو دل و جان سے قبول کیا ☆ تا کہ اس راہ سے وہ نئے نظام میں ''مالکیتوں'' کو اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ ''حاکم طبقہ'' جب یہ دیکھتا ہے کہ جدید تحریک کا بھاری نقطہ، صرف ذہنی اور ''داخلی انقلاب'' ہے نہ کہ عینی اور بیرونی تو فوری طور پر وہ اپنے ''نام'' اور اپنی ''محبت'' کو بدل دیتا ہے اور اس ''اسم'' اور اس محبت سے رشتہ جوڑتا ہے جو تحریک کو مطلوب ہے تا کہ اپنے پہلے کے طبقاتی روابط کے تسلسل کو جاری رکھ سکے۔

☜ افراد نے اس بنا پر کہ کہیں ''محمدی تسنن'' اور ''علوی تشیع'' ۔۔۔ کہ جو ایک ہی امت تھے۔۔۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مغربی استعمار کے محل کو نہ لرزا دیں ''علوی تشیع'' اور ''صفوی تشیع'' کو ایک واحد مذہب اور ''محمدی تسنن'' اور ''اموی تسنن'' کو دوسرا واحد مذہب دکھایا تا کہ ''علوی تشیع'' اور ''محمدی تسنن'' کی واحد امت ایک دوسرے کا خون بہائے ...... اور پھر سروں کے مینار بنانے کے بعد، پہلے تو وہ ان ہی ''اموی سنیوں'' اور ''صفوی شیعوں'' کو بڑے آرام سے استثمار کرے اور اس کے بعد کی منزل میں خونخوار مغرب بڑی آسانی سے، صدیوں ان کا استعمار کرے۔

اب اگر اس ''سازش'' میں لوگ ۔۔۔ علوی شیعہ اور محمدی سنی ۔۔۔ تلف ہو جائیں تو ہو جائیں، بس ''خلیفہ''، ''سلطان'' اور ''امپراطور (بادشاہ) سلامت رہے!

☆ ...... ''حاکم طبقہ کے نقطۂ نظر سے آپ شیعہ، سنی، صوفی، درویش، میٹریالسٹ، مارکسسٹ، اگزسٹینیلسٹ یا جو چاہیں ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے ''کھانے پینے کے ذرائع کو ہاتھ نہ لگائیں!

اس طرح کی کامیابی کے ساتھ یہ شیعی تحریک، ''علوی تشیع'' سے ''صفوی تشیع'' میں داخل ہونے لگی۔

جہاں تشیع لوگوں میں اتنی اثر انداز ہو اور حاکم طبقہ کے طبقاتی مفادات کے تحفظ کا بہترین ذریعہ ہو سکتی ہو اور جہاں نئی تحریک کے خارج رہبر صرف ''حاکم طبقہ کے مرجع محبت'' کی تبدیلی چاہتے ہوں، تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ اس کے بجائے اپنے لئے کوئی دوسرا مذہب اختیار کریں کہ جو دوسروں کے درمیان مردود و مطرود ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ''حاکم طبقہ''، ''عوام کے تشیع'' کو ان کے ہاتھ سے لیکر خود پر چسپاں کرتا ہے تاکہ اس کی برکت سے سابقہ نظام کی طرح خود، ''عوام'' کو بہتر اور بیشتر دوہے۔☆

۶۔ سیاسی وابستگی

☆......روم میں جب سیزروں، سینیٹروں، اور حاکم طبقہ سے وابستہ زورمندوں نے دیکھا کہ بت پرستی، ستارہ پرستی، یا یونان کے اساطیری خداؤں کے مذاہب، ان کے طبقاتی مفادات کو پورا نہیں کر سکتے اور دوسری طرف سے عیسائیت میں ایسے دین کے عنوان سے کہ جو سب کو ایثار اور قربانی پر آمادہ کر رہی ہے، نچ لوگوں کے کھلیان میں آگ کی طرح نفوذ کرتی اور بڑھتی جا رہی ہے اور سب ''یکجا'' عیسائی ہو رہے ہیں! تو جناب ژوستی نین صاحب بھی اعلان کرتے ہیں کہ ''جی......، یہ خاکسار اپنے دوستوں، رفیقوں اور گردوپیش کے لوگوں کے ساتھ عیسائی ہو گیا ہے! اور پھر لوگوں کے پر جوش وخروش نعرے ان کا استقبال کرتے ہیں کہ: عیسائیت کامیاب ہو گئی''! (؟) لیکن یہی عیسائیت اسی کامیابی کے ساتھ ''عوام'' کے درمیان سے اپنی جگہ تبدیل کرتی ہے اور سیدھی ایوان سینٹ اور قصر شاہی میں جا بستی ہے اور پھر ''مسیح'' اور ''قیصر'' ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ان ہی ''عوام'' کے خلاف مصروف عمل ہوتے ہیں! یعنی سینیٹر سے کارڈینال اور پھر ایک ہی جھٹکے میں امپراطور سے پوپ میں منصب کی تبدیلی کے ساتھ دو ہزار سال بعد تک ''مصروف'' ہو جاتے ہیں!

''سیاسی وابستگی'' کسی گروہ کے ایک اور اہم اور ذاتی ارکان میں سے ایک ہے۔ وہ گروہ جس کی کوئی سیاسی وابستگی نہ ہو بنیادی طور پر، گروہ نہیں ہے۔ ''ملت'' بھی اسلامی مفہوم میں اگر سیاسی مفہوم سے عاری ہے تو غیر ممکن ہے کہ اسے ''ملت'' کہا جائے بلکہ اس میں مٹھی بھر ''علمی تھیوریز'' ہیں کہ جو کسی دانش گاہ یا علمی موسسہ...... کے دانشوروں کے درمیان رائج ہیں اور ان ہی کا مبادلہ ہوتا رہتا ہے۔☆

۷۔ محاذ آرائی، ۸۔ اسٹریٹیجی ۹۔ ٹیکنیک اور ۱۰۔ تنظیم، کا عام رائجہ طریق کار...... اب چونکہ زیادہ گفتگو کا موقع نہیں ہے لہٰذا میری یہ کوشش ہوگی کہ میں ان چند موضوعات کے اساسی خطوط کو بطور خلاصہ پیش کروں اور باقی کو خود آپ پر چھوڑ دوں۔ اصل گفتگو سے قبل مناسب ہوگا کہ میں چند جملوں میں ''اسٹریٹیجی اور ٹیکنیک کے فرق'' کو واضح کروں:

اسٹریٹیجی (Strategic) ''اپنے'' اہداف کے بچاؤ اور کسی مقام سے ''دشمن'' کے اہداف کے ضرب لگانے کے لئے کسی گروہ کی فوج کشی سے عبارت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ''حملہ آور۔ مدافع'' گروہ کے ابتدائی مقام سے یورشی اہداف تک کی حرکت کے پلان کو (یا ہماری زبان میں منکرات) اور دفاعی اہداف (یا معروفات)

☆...... البتہ آج، بہت سی ایسی ''غیر ممکن'' باتیں ممکن ہوگئی ہیں...... مشروطہ تحریک میں عوام نے ''عدالت خانہ'' (پارلیمنٹ) کی آرزو میں، ہڑتالیں کیں، محاذ آرائی کی۔ ''قم'' اور ''شاہ عبدالعظیم'' میں ڈیرے ڈالے، جانوں کے نذرانے دیے، قربانیاں دیں،...... مختصر یہ کہ بہت زحمتیں اٹھائیں۔ مظفر الدین شاہ کی طرف سے پیغام آیا کہ ''......جی۔ اعلیٰ حضرت نے منظوری دے دی ہے کہ ''عدالت خانہ'' (پارلیمنٹ) کی تشکیل ہو اور آپ لوگ خود اپنے نمائندے منتخب کریں...... یہ لوگ پارلیمنٹ میں آکر بحث کریں، رائے دیں، فیصلے کریں ......اس شرط کے ساتھ کہ ''صرف'' سیاسی امور میں مداخلت نہ کریں''!؟!

کو اسٹریٹجی کہتے ہیں، اس تعریف کی بنیاد پر، کسی گروہ کی اسٹریٹجی، حرکت میں آنے سے پہلے اس فن کے متخصصین کی طرف سے ''متعین شدہ'' ہوتی ہے۔ مثلاً پہلے سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ یورش یا دفاعی مراکز کی سمت حملہ، منظم طور پر ہوگا یا (گوریلائی صورت میں) غیر منظم طور پر، اس میں لڑنے والے سپاہیوں کی تعداد کتنی ہوگی، اسلحے کس نوعیت کے ہوں گے، پہلے پیادہ فوج حرکت کرے گی یا اسوار، کارروائی کی حکمت عملی زمینی فوج کے ہاتھ میں ہوگی یا ہوائی فوج کے ہاتھ میں، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ٹیکٹیک (Tactique) عبارت ہے ان بہترین اور مناسب ترین، تدبیروں، روشوں اور وسائل کے چناؤ سے کہ جو ایسے موقع پر سامنے آتے ہیں جب ''حملہ آور۔ مدافع'' گروہ کے مقابل کوئی رکاوٹ عین اس وقت راستے میں آتی ہے جب وہ پورے طور پر اسٹریٹجی کے عمل میں ہوتا ہے۔

اس بنا پر اولاً اسٹریٹجی پہلے سے معلوم اور مشخص ہوتی ہے جبکہ ٹیکنیک، اسٹریٹجی کے بروئے کار لانے کے موقع پر عمل کے دوران ظہور میں آتی ہے، ثانیاً اسٹریٹجی کو اپنے اور دشمن کے حالات کو مدنظر رکھ کر قبلی شناخت کی بنیاد پر معین کی جاتی ہے جبکہ ٹیکنیک کو جنگ وجدل کی نوعیت کے مطابق، دشمن کے لگاتار حملوں یا ہر طرح کی ناقابل پیش بینی رکاوٹوں اور حوادثوں کی بنیاد پر بنائی اور عمل میں لائی جاتی ہے، ثالثاً اسٹریٹجی، کہ جسے فوج کا ہائی کمان مرتب کرتا ہے عمل کے آخری مرحلہ تک پورے دستہ کے لئے ایک غیر قابل تغیر، کلی پلان ہوتا ہے جبکہ وہ ٹیکنیک جو خود فوجی دستوں کے کمانڈروں اور بعض اوقات لڑنے والے یونٹوں کے افراد کی جنگی ضرورتوں کے تحت معرض وجود میں آتے ہیں اور ان پر عمل ہوتا ہے، ایک وقتی اور فرعی عمل ہوتا

ہے اس طرح کہ گا ہے ایک اسٹریٹجی کے اندر، دو مختلف صورتوں میں دو متضاد ٹیکنیک کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ☆

لیکن اس گروہ کی اسٹریٹجی:

اس سے پہلے بھی میں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ امام حسینؑ کے بعد سے شیعہ ائمہ کی مبارزہ آرائی گوناگوں صورتیں اختیار کرتی ہے۔ اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس کا سبب، اموی اسلام کے مقابل محمدی اسلام یا علوی تشیع کی منظم اور آراستہ طاقت کی شکست ہے، اس مفہوم میں کہ وہ حکامِ جور کی قدرت مطلقہ کے مقابل، رسول خداؐ اور علیؑ و حسنؑ کی طرح منظم اور آشکارا جنگ نہیں کر سکے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی جنگ کی اسٹریٹجی کو بدلتے حالات کے مطابق بدلا۔ ۔۔۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں ۔۔۔ جنگ کی یہ بدلتی ہوئی صورتیں، اسماعیلی شیعہ اسٹریٹجی اور زیدی شیعہ اسٹریٹجی کے مقابل بارہ امامی شیعہ اسٹریٹجی کے مسئلہ کو پیش کرتی ہے۔

شیعہ اسماعیلیوں نے اپنی اسٹریٹجی کو اس بنا پر قرار دیا کہ خلافتِ جور سے مبارز آرا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ امام اور رہبر ہر حال میں یکساں طور پر صرف مسلحانہ مبارزہ کا انتخاب کریں۔

زیدی شیعوں نے بھی ایک طرف سے حضرات ابوبکر و عمر سے (اساس قائم کئے بغیر) برائت اختیار کی اور مسئلہ کو مبہم کر دیا اور اس کے نتیجہ میں عوام الناس کی طبقاتی وابستگی گم اور نابود ہوگئی ☆☆ اور دوسری طرف سے انہوں نے ایک واحد اسٹریٹجی کو اپنایا

☆.....ملحقات نمبر ۷ سے رجوع فرمائیے۔

☆☆.....یہ مسائل بہت نازک اور بہت حساس ہیں اور افسوس ہے کہ اس وقت پوری طرح ان کا جائزہ مقدور نہیں ہے.....

اور اس کے مطابق علیؑ کے گھرانے سے امام اور رہبری کو (کسی معین اصل کے بغیر) برحق جانا تاکہ خلافتِ جور کے مقابل مسلحانہ قیام ۔۔۔ قیام بالسیف ۔۔۔ کر سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نظریہ کے ساتھ انہوں نے جنگ کے استمرار اور مداومت ۔۔۔ یا امت کی رہبری ۔۔۔ کو عملاً، بیچ سے اٹھا دیا۔

لیکن امامی شیعہ معتقد تھے کہ رہبری کی بقا اور اس کا استمرار اصل ''وصایت'' کی بنیاد پر ہے۔ اس مفہوم میں کہ پیغمبر اسلام کی امامت ☆ کے عمل کی بقا اور محاربات ☆☆ کی رہبری کی مسئولیت بارہ نسلوں، بارہ اماموں کے ذمہ ہے کہ جو اوپر سے، اسلامی انقلاب کے کمانڈر اور تحریک کے پہلے آئیڈیالوج کی طرف سے اصلِ ''وصایت'' کی بنیاد پر معین ہوا ہے اور جو حضرت مہدیؑ پر آکر ختم ہوتا ہے۔

☆...... یہ جو میں نے ''پیغمبر اسلام کی امامت کے عمل'' کی بات کی ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے دو کردار اور دو ذمہ داریاں رہی ہیں، ایک ''نبوت'' کی ذمہ داری اور اس کا عمل اور دوسرے ''امامت'' کی ذمہ داری اور اس کا عمل۔ آپ نے پہلی ذمہ داری کو کہ جو ''نبوت'' ۔۔۔ یا آئیڈیالوجی لانے ۔۔۔ کی ذمہ داری ہے، اپنے دور حیات میں اختتام تک پہنچایا اس لئے کہ آپ ''خاتم النبیین'' ہیں

لیکن آپ کی دوسری ذمہ داری یعنی ''امامت'' ۔۔۔ یا امت سازی ۔۔۔ کی ذمہ داری ان کے زمانے میں اختتام تک نہیں پہنچی، اس لئے کہ ''امت سازی'' کی ذمہ داری نبوت کے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کام کے لئے مسلسل اور مستمر طور پر کئی نسلوں کی ضرورت تھی کہ جو تحریک کے رہبر کی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر عملی جامہ پہنے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی امامت کی ذمہ داری ان کے زمانے میں اختتام پذیر نہیں ہوئی اور دیگر بارہ نسلوں تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔

☆☆...... حکومت جور کے خلاف محروم طبقہ کی جنگ میں بنیادی طور پر تینوں فرقے متفق القول ہیں۔ تاہم اس بارے میں ان کا تنہا اختلاف، اس طرح کی جنگ کے اسٹرٹیجی میں ہے۔

بہر حال ...... ظاہری اعتبار سے یہ تینوں اسٹریٹجیز آج کے روشن خیال افراد کی نظر میں اس طرح دکھائی دیتے ہیں کہ اسماعیلی اور خاص کر زیدی سیاسی اسلوب کی اسٹریٹجی، شیعہ امامی اسٹریٹجی کی نسبت انقلابی سیاسی اسالیب سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے ان کی نظر میں شیعہ امامی اسٹریٹجی ان دونوں کی نسبت، موروثی قدامت پسندانہ سیاسی اسالیب کی اسٹرٹیجیز سے قریب تر ہے!

لیکن بظاہر انقلابی ہونے کے بعد بھی تاریخ ان کے بارے میں بالکل الٹا فیصلہ کرتی ہے! اس لئے کہ آج کے روشن خیال لوگ زیادہ تر تاریخی مسائل کو فقط ایک خاص دور میں بصورت گزشتہ، اپنے زمانے کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ جبکہ ...... جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے کہ تاریخی مسائل کیلئے ضروری ہے کہ انہیں انضمامی، عینی اور ڈیالیکٹیکی نگاہ سے دیکھا اور فیصلہ کیا جائے اس لئے کہ دوسری صورت میں ان کے بارے میں فیصلہ نادرست ہوگا۔

اس بناء پر ضروری ہے کہ اسٹریٹجی کی اہمیت اور موزونیت کو بھی اس کے نتیجہ اور ماحصل سے پہچانا جائے☆......

یہ ٹھیک ہے کہ اسماعیلیہ نے پانچویں، چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں ہجری میں ایک ایسی زورمند طاقت کو ابھارا کہ جس نے خلافت کے نظام کو تہ و بالا کر دیا، ٹھیک ہے کہ اس موقع پر ان کے گڑھ، الموت، طبس، اور بیرجند کے اہل قریہ کے درمیان ان کا اثر و رسوخ اتنا عمیق تھا کہ انہوں نے مذکورہ علاقوں میں ۔۔۔ جن کے آثار اب بھی باقی ہیں ۔۔۔ ایک وسیع انقلابی تحریک برپا کی اور ۔۔۔ سلجوقیوں کی ۔۔۔ خلافت کے

☆...... بقول حضرت مسیح کے: ''...... درخت کو اس کے پھل سے پہچاننا چاہئے۔

نظام کو ناکارہ کیا، اور ٹھیک ہے کہ حسن صباح نے ایک ایسی طاقتور ٹیررزم کی بنیاد رکھی جس کی نظیر آج بھی چشم روزگار نے بہت کم دیکھی ہے، لیکن اتنے تداوم اور اتنے استمرار کے باوجود اس کی رہبری، تاریخ میں ایک ایسی صورت اختیار کرتی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے چند نسلوں بعد☆ اچانک پرنس کریم آغا خان کے وجود سے سر اٹھاتی ہے! وہ کہ جو آج اپنی بیوی، ملکہ ''بری نائی وف'' کے ہموزن، خمس لیتا ہے!...... جو حسین آباد نیشاپور کے اس بدنصیب مسکین دیہاتی کے ان پانچ انڈوں میں سے جو اس کی پوری زندگی کا سامان اور اس کے ''قند'' و چائے کا واحد ذریعہ ہے، ایک انڈا اپنے لئے مختص کرتا ہے...... اس لئے کہ بالآخر پیرس کے بہت اخراجات ہیں! کم از کم سارے خالص و مخلص ایرانی شیعوں کو چاہئے کہ وہ پورے سال عرق ریزی کریں اور جان کھوئیں تاکہ ان کی آمدنی کا خمس، لیڈو میں جناب ''امام'' کی اتوار کے ایک شب کا خرچ پورا کرے!!

ولیکن زیدی شیعہ:

زیدیوں کے رہبر، جناب زید وہ شخصیت ہیں کہ تاریخ شہداً اور دنیا کے عظیم آزادی بخش انقلابات کی سرگزشت نے کم ہی کسی کو ان کی طرح یاد کیا ہے۔ یہ وہ ہستی ہیں کہ جب میں ان کے مقدس اور جنگی احساسات سے بھرپور جوشیلے چہرہ کو اپنی نگاہوں کے سامنے لاتا ہوں تو تھرا جاتا ہوں۔ یہ وہ انسان ہے کہ جس کے چودہ سالہ بیٹے یحییٰ نے، اس کے خونی پکار اور اس کی مردانہ وار شہادت کے بعد خراسان میں

☆...... جناب امیرؑ سے امام جعفر صادق علیہ السلام تک، ہمارے اور اسماعیلیوں کے درمیان مشترک رہبر اور مشترک ائمہ کا وجود رہا ہے، لیکن چھٹے امام کے بعد سے ان کے رہبر اسمٰعیل اور چند ایک انقلابی رہبر رہے ہیں کہ جو بعد میں بالآخر......!

ایسی یلغار کی کہ حکومت کی عظیم مشنری کو ہلا کر رکھ دیا...... یہ تاریخ کا وہ درخشاں چہرہ ہے کہ جس کے اور جس کے فرزندوں کے وجود کی دہشت سے...... بنی امیہ نے اپنے پروپیگنڈہ کی ساری مشنری کو یکجا کیا تا کہ ان کے مقدس چہرے کو ستم کش عوام کے اذہان میں بھونڈا اور نا قابل قبول بنائے۔۔۔ کہ گویا جناب زید، ائمہ برحق کی رہبری کے مخالف تھے اور اسی لئے امام صادق علیہ السلام اور دیگر شیعہ ائمہ بھی ان کے اور ان کے قیام کے مخالف تھے !!...... یہاں تک کہ انہوں نے ان ہی شیعہ ائمہ سے اس بارے میں جھوٹی حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔☆ اور لوگوں میں اسے عام بھی کیا ہے افسوس کہ بنی امیہ کا یہ مواد انتہائی معتبر شیعہ متون میں بھی سرایت کر گیا ہے☆☆

بہر حال...... ایک ایسی تحریک کے ایسے انقلابی رہبر، کئی نسلوں کے بعد ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ اچانک ''امام البدر'' ۔۔۔ موجودہ زیدی شیعہ رہبر۔۔۔ سے اپنا سر نکالتے ہیں!☆☆☆

......تاریخ کے تکامل (تدریجی کمال) کو ملاحظہ فرمائیے:

اُس طرف سے، حسن صباح، اتنی جانبازی، اتنی کشمکش اور خلافتِ جور کے خلاف اتنی سرکشی اور دیہاتی رضا کاروں کی اتنی بھرتی کے بعد...... بالآخر ''پرنس کریم آغا خان'' تک پہنچتے ہیں!

☆...... حالانکہ ایسی بہت روایات ہمارے پاس ہیں کہ امام فرماتے ہیں: ''زید، بنیادی طور پر ہمارے گھرانے کی آبرو ہیں۔ وہ ہمارے گھرانے کی امید تھے اور انہوں نے اپنی زندگی ہماری راہ میں وار دی۔''

☆☆......ملحقات نمبر ۸ سے رجوع فرمائیے

☆☆☆......ملحقات نمبر ۹ سے رجوع فرمائیے

اس طرف سے زید شہید، اتنی سخاوت مندانہ جانبازی اور جوانسال یحیٰی کے اتنے پرُجوش قیام کے بعد...... بالآخر اس منزل پر آتے ہیں کہ اب یہ قیادت، دنیا میں شراب کے سب سے بڑے کلکشنر (Collectioner) ''امام البدرُ'' کے ہاتھ لگتی ہے!......☆

لیکن امامی شیعوں نے اپنی دائی اسٹریٹجی کو ان میں سے کسی میں نہیں رکھا:

نہ انہوں نے قیام بالسیف کو دائی اسٹریٹجی کے عنوان سے تسلیم کیا، نہ فکری مبارزہ کو، نہ گھر بیٹھ جانے کو، اور نہ ہی اسلامی اصول کی تدریس کو، بلکہ ''جابر حکمران کے نظام سے مسلسل جنگ کو اپنی دائمی اسٹریٹجی قرار دی، کہ جو دو مکمل جنگی محاذ سے صورت پذیر ہوتی ہے:

ایک محاذ، آئیڈیالوجی --- استحمار --- کا ہے کہ جسے حاکم نظام...... فلسفے، ادبیات، سائنس، تفسیر، فقہ، اصول، اور شعر وعر...... کے زیرِ غلاف ''سنت پیغمبرؐ'' کے نام سے بنا بنو کے لوگوں کے ذہنوں میں اتارتا ہے۔ اور دوسرا محاذ سیاسی --- معاشی --- استبدادی اور استثماری ہے، کہ یہ بھی محکوم عوام کے خلاف، حاکم نظام کے ہاتھ کا تانا بانا ہے۔

شیعہ امامی رہنما کی توجہ حاکم نظام کے ان دونوں محاذوں --- یا تینوں ابعاد --- پر ہے اس مفہوم میں کہ اہل تشیع کے بارہ اماموں کی اسٹریٹجی اس مسلسل اور لگاتار مبارزہ سے عبارت ہے کہ جو مذکورہ دونوں محاذوں پر جاری رہتا ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں شیعہ امامیہ مبارزہ کی اسٹریٹجی، جنگ کی ایک ایسی روش

☆...... ملحقات نمبر ۱۰ سے رجوع فرمایئے

ہے کہ جس میں ضروری ہے کہ ہم ہر زمان و مکان میں اپنے اور دشمن کے شرائط و مقدورات و امکانات کو اچھی طرح سمجھ کر اور پرکھ کر پھر اسے اپنائیں اور عملی اقدام کریں۔ اس عنوان سے شیعہ امامی اسٹریٹجی کوئی ایک ثابت اور مشخص اسٹریٹجی نہیں ہے کہ جو نامساعد حالات میں اپنی جنگ جاری نہ رکھ سکے بلکہ اس کے بالکل الٹ، یہ روش اتنی ترقی پسندانہ اور قابل انعطاف ہے کہ جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں اپنے اور دشمن کے تغیر پذیر شرائط کے مطابق مسلسل اور لگاتار صورت میں جاری رہ سکتی ہے، یہ روش اتنی گسترده اور لچکدار ہے کہ جو تاریخی، فکری، سماجی، طبقاتی اور فوجی گوناگوں تغیر پذیر شرائط کے سارے نشیب و فراز میں، اپنی راہ ڈھونڈ کر سیدھی اپنے اہداف کی سمت بڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اسٹریٹجی کی جتنی قسمیں شیعہ ائمہ نے اختیار کی ہیں وہ اس پیشرو اور بے نظیر مبحث کی بہترین اور گویا ترین سند ہے۔

بعض حالات میں ایک منظم اور رُو در رُو مسلحانہ مبارزہ کو منتخب کرتے ہیں۔ ان دیگر حالات میں کہ جہاں داخلی نیم اسلامی طاقت، بیرونی اسلام دشمن طاقتوں کے مقابل تخویف و ترہیب کا شکار ہوتی ہیں ۔۔۔ خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے زمانے میں ۔۔۔ وہاں خاموشی کی اسٹریٹجی کا انتخاب ہوتا ہے، دیگر خصوصی حالات میں خاموشی کی اسٹریٹجی کو اس لئے اپنایا جاتا ہے کہ پہلے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طاقتور مسند تک پہنچا جائے اور پھر مسلحانہ اور دیگر مبارزات کے طریقوں کو اختیار کیا جائے۔ خود جناب امیرؑ کو شروع میں ایسے حالات کا سامنا ہوتا ہے کہ ایسے وقت میں وہ نامطلوب شرائط کو تہ و بالا نہیں کر سکتے، لہٰذا خاموشی اختیار کرتے ہیں تا کہ ان ہی نامساعد حالات

میں حکومت کو حاصل کر سکیں اور اس کے بعد وہ مبارزہ کے دیگر مناسب طریقوں کا آغاز کرتے ہیں۔

امام حسنؑ بھی اسی اعلان ''بیعت'' کی بنیاد پر جس پر کہ حضرت امیرؑ نے ''خلافت'' تک رسائی کی طاقت کو ہاتھ میں لیا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنی رُو در رُو مسلحانہ مبارزہ کی اسٹریٹجی کی بنیاد پر جنگ کی ...... پھر جب اس طریقے کو جاری رکھنے کا امکان باقی نہیں رہا تو پھر آپ نے اپنی اسٹریٹجی بدل دی اور خفیہ مبارزہ کا انتخاب کیا، اس طرح کہ حتیٰ شروع میں سلمان بن سرو اور حجر بن عدی بھی اس معاہدہ سے سخت ناراض ہوئے لیکن پھر امام سے ملاقات کے بعد قانع اور خوشحال واپس لوٹے کہ اب سابقہ اور رُو در رُو لڑائی امکان پذیر نہیں اور اس طرز کو جاری رکھنے کی صورت میں مسلمہ طور پر موجود تمام فورسز نابود ہو جائیں گی اور ساری چھاؤنیوں پر دشمن کا قبضہ ہو جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ امام حسن علیہ السلام نے اپنی ''موجودہ مختصر طاقت'' کو بچا لیا اور اپنے مبارزہ کی اسٹریٹجی کو بدل کر اسے انڈر گراونڈ کر دیا۔ یہی معاہدہ، ان کی تاریخِ مبارزات میں، شیعہ خفیہ مبارزات کا پہلا نطفہ (یا پہلا بیج) ہے۔

امام حسینؑ ناچارگی کے دور میں دشمن پر برتری حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اسے رسوا کرنے کے لئے ''خونی انقلاب'' کی اسٹریٹجی کو منتخب کرتے ہیں اس لئے کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے ان کے پاس ایسی فوجی طاقت نہیں تھی ...... اور ہم نے دیکھا کہ انہوں نے حاکم کی غلیظ مشنری کو اس طرح رسوا کیا کہ برسہا برس تک علماء اہلسنت بھی خلفاء اہلسنت کا ساتھ نہ دے سکے اور ان کے ساتھ تعاون

برقرار نہ رکھ سکے۔☆

امام زین العابدینؑ کو ایسے دشوار حالات کا سامنا ہوتا ہے کہ حتیٰ وہ ''شہادت'' کا بھی انتخاب نہیں کر سکتے!...... اس لئے کہ ''شہادت'' وہ انتخاب نہیں ہے جس میں کوئی مفت میں مرے، یہ ایک ایسی آزادانہ اور آگاہانہ موت کا انتخاب ہے کہ جس میں شہید ایک اسلحہ کی طرح دشمن کے سر پر کاری ضرب لگا کر اس کو رسوا اور لوگوں کو آگاہ کرتا

☆...... احمد بن حنبل (حنبلی فرقہ کے سربراہ) کے بیٹے ''صالح'' نے ایک سال تک خلیفہ کے نظام حکومت میں قضاوت کا عہدہ سنبھالا اور ایک سال تک قضاوت کی۔ اس پورے عرصے فرط زہد و پارسائی سے وہ راتوں کو دروازے کے قریب سوتے تھے تاکہ اگر آدھی رات، کسی کو اس کی قضاوت کی ضرورت پیش آئی تو وہ فوری طور پر اس کی داوری کرے۔ مدتوں بعد، خلیفہ کے نظام حکومت میں اسی ایک سال کی قضاوت کی خاطر، ایک دن جب (ان کے والد) احمد بن حنبل کے گھر آٹا گوندھنے کی نوبت آئی تو اس کے لئے اس کا خمیر (Yest) خلیفہ کے سابقہ قاضی صالح بن احمد کے گھر سے لایا گیا...... احمد بن حنبل نے وہ روٹی نہیں کھائی اور نہ ہی گھر والوں کو کھانے دی۔ روٹی ایک طرف رکھ دی گئی۔ احمد نے کہا، کوئی سائل آئے تو اسے دے دو، لیکن اس سے کہو کہ اس کا خمیر صالح بن احمد کے گھر سے آیا ہے۔۔۔ آٹے میں حکومت کے قاضی کے پیسے کی شمولیت کے سبب۔۔۔ وہ روٹی چالیس دن احمد کے گھر پڑی رہی اور کوئی سائل اسے لینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس روٹی کو پھپھوند لگ گئی اور اسے دجلہ میں ڈال دیا گیا۔ احمد نے پوچھا وہ روٹی کیا ہوئی۔ کہا اسے دجلہ میں پھینک دیا گیا ہے۔ احمد نے عمر کے آخری حصہ تک دجلہ کی مچھلی نہیں کھائی......!

کیوں!؟ اتنی نفرت کہاں سے پیدا ہوئی؟ یہ سارے عالم و عامی اور غنی و فقیر کیوں خلیفہ کے قاضی سے بیزار ہیں؟ یہ سب امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے سبب ہے۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حسینؑ پر صرف شیعوں میں گفتگو کی جاتی ہے اور ان کی منزلت کو صرف وہی سمجھتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ حسینؑ اور ان کی شہادت کو طول زماں اور عرض زمیں میں ہر طرف پیش کرنے کی ضرورت ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے......

ہے۔ ایسی موت کا انتخاب جس سے اس طرح کا سماجی نتیجہ حاصل نہ ہو، شہادت نہیں، ایک عقیم اور بے نتیجہ موت کا انتخاب ہے۔

جب امام حسینؑ، ان کے رفقاء اور دیگر شہداء کی باوقار شہادت کو جناب زینب جیسی پیامی، گوشِ فلک میں اتارتی ہے تو اس کی آواز اس طرح گونجتی ہے کہ، اس واقعہ کے مہینوں بعد مصری عوام کے دلوں میں اہلبیت کی نسبت ایسی محبت پیدا ہوتی ہے کہ آج اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے...... ☆

لیکن امام زین العابدینؑ، امام حسینؑ کے برخلاف ایسے حالات میں ہوتے ہیں کہ جن کا نہ جناب عباسؑ جیسا یاور ہوتا ہے اور نہ جناب زینب جیسی پیام آور وہ دیکھتے ہیں کہ ''شہادت'' ان کے لئے طولِ زماں اور عرضِ زمیں کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ ایک خاموش موت کو دعوت دیتی ہے لہٰذا وہ گفتار سے کام لیتے ہیں اور لوگوں سے کلام کرتے ہیں۔ (ایک عظیم، اعلیٰ اور ارفع انسان کے لئے یہ بات کتنی سخت اور کتنی اذیت

☆......اب بھی مصر میں ''راس الحسین'' اور اس کے سامنے ''زینبیہ'' دو نہایت پرشکوہ عمارتیں ان ہی اہلبیت کی محبت کے سبب، عجیب شان اور عجیب عظمت کی حامل ہیں۔ گو کہ یہ ''زینبیہ''، ''زینب'' نام کی ایک علوی خاتون کا مدفن ہے کہ جسے یہ لوگ ''حضرت زینب'' کے عنوان سے دائرہ فہم میں لاتے ہیں۔ مصر میں اہلبیت کے نام سے بہت سی زیارت گاہیں موجود ہیں جو ان تمام زیارت گاہوں سے کہیں زیادہ عالیشان ہیں جو اس وقت ایران میں ہیں اور وہاں کے عوام کے درمیان ناقابل بیان حد تک محبت و احترام کے حامل ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہاں کے لوگ (جن میں شیعہ، سنی دونوں شامل ہیں) اپنے مُردوں کو پہلے ---اپنے--- حضرت زینب کی ضریح کے گرد طواف دیتے ہیں اور پھر انہیں دفن کرتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اہلبیت کی یہ محبت یونہی ایک بے بنیاد محبت تھی۔ یہ وہ محبت تھی کہ جس سے، استبداد گر، استثمار گر، اور استحمار گر طاقتیں ڈرتی تھیں۔ وہی محبت کہ جو اب شعر و درود و بے ہوشی و مداحی میں بدل گئی ہے......!

ناک ہے کہ حتیٰ ''اچھی موت'' بھی اس کے امکان میں نہ ہو......)

وہ دیکھتے ہیں کہ اب حاکم نظام کے ساتھ مسلحانہ جنگ، سارے اقدار اور سارے سرمایوں کی نابودی کا باعث ہوگی۔ ان سرمایوں کا جن کی نابودی سے رسول خداؐ کے گھرانے کی ساری میراث (کہ جو سچے اسلام کی بقا ہے) بشری معاشرے سے ختم ہوجائے گی، وہ اقدار جن کی نابودی سے، یا تشیع اور رسولؐ کے گھرانے کی بات ختم ہوجائے گی یا اگر نہ بھی ہوئی تو، کریم آغا خان اور امام البدر جیسے لوگوں کے حلقوم کی ہوگی جو پیرس کے کیبروں کے سب سے بڑے گاہک اور دنیا میں شراب کے سب سے بڑے کلکشنز ہیں......☆

امام اپنے مختصر شیعوں اور مختصر وسائل کی یکجائی کے بجائے کہ جو حاکم نظام کے معمولی گروہ کے ہاتھوں بڑی آسانی سے مغلوب اور منتشر ہوجاتے (اور تشیع بھی سارے اسلامی مذاہب کی طرح تاریخ سے محو ہوجاتا) ان خاص شرائط کے ساتھ جو اس دور کے حکومت کی تھی، اپنی محاذ آرائی کی اسٹریٹجی کو بدلتے ہیں، خاص طور پر اس وقت جب اسلام کی فکری اساس، دشمن کے تیز حملوں کی زد پر تھی۔

یہی سبب ہے کہ باقرین ـــ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام ـــ نے بھی اپنی محاذ آرائی کی اسٹریٹجی کو ایک عمیق فکری مبارزہ کی بنیاد پر قائم کیا تاکہ ''فردسازی'' اور ''انسان سازی'' کی راہ سے پھر ایک امت کی تربیت کریں اور سچے اسلام کی بنیاد پر کہ جو اصیل اسلامی اقدار و اصول کی احیاء کے بعد کہ جس کا مرکز بجز مدینہ اور مسجد النبی کے اور کہیں نہیں تھا اور جو تاریخ کے طاق فراموشی

☆......خاص طور پر اس وقت جب امام کا تعین پہلے سے نہ ہوا ہو۔

میں بیٹھتا چلا جا رہا تھا نئے سرے سے مناسب اسٹریٹجی کو آنے والے حالات کے مقابل اختیار کریں۔ حالات ایسے چھائے ہوئے تھے کہ ایران، عراق، شام اور اسپین جیسے عظیم سیاسی مراکز خلافتِ جور کے قبضے میں تھے اور سارے مساجد، سارے دینی مراکز اور سارے اسلامی اقالیم بجز مدینہ کے، امامت و عدالت والے اسلام کے مقابل ''خلافتی اسلام'' کو ترویج دے رہے تھے۔ مدینہ کے اس چھوٹے سے مرکز میں رہبر و امام کے لئے جو واحد کام ممکن تھا یہ تھا کہ ان ہی معدودِ چند مومن، مسئول، آگاہ، اور صاحبانِ فکر و نظر افراد کی تربیت کریں تا کہ وہ پہلے وحی کے نکھرے سرچشمہ کو نئے سرے سے پہچانیں اور پہچنوائیں اور پھر ان لوگوں کی اساس پر خلافت سے مبارزہ کے لئے ایک نئی اسٹریٹجی تیار کریں ☆

یہ وہ وقت ہے کہ جب ایک طرف سے بنی امیہ زوال پذیر ہو رہے ہیں اور دوسری طرف سے بنی عباس بڑی تیزی سے منظر پر آ رہے ہیں۔ ان دونوں ہیبت ناک دیوؤں کے درمیان واقع تضاد نے جو بڑی شدت سے ایک دوسرے کی جان کو آگئے ہیں، مدینہ میں دم مارنے کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر واپس لوٹ کر نہیں آئے گا اور اسلام کی اس واحد ''تنفس گاہ'' کے دروازے کو بھی کھلا نہیں رہنے دیا جائے گا۔

پس ضروری تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور ان دونوں ائمہ نے بھی

☆...... آج کی زبان میں انقلاب کی اساسی آئیڈیالوجی کو رجعت پسند اور قدامت پسند عناصر کے ''تانے بانوں'' سے الگ کر کے شروع کی اصیل آئیڈیالوجی سے مسلح گوریلوں کے ساتھ مختلف جنگ آزما طاقتوں کی صفوں کو ایک متناسب اسٹریٹجی کی بنیاد پر نئے سرے سے تشکیل دیں۔

کیا۔ لیکن بہت جلد اس فرصت کو بھی ان سے لے لیا گیا۔ اس لئے کہ ہارون رشید، بنی عباس کی سب سے بڑی طاقت ہو گئے اور انہوں نے سارے رقیبوں کو میداں بدر کر کے بنی عباس کی عظیم خلافت کو عروج پر پہنچایا!

امام موسیٰ کاظمؑ تمام عمر اسلام کے خلیفہ! ہارون رشید کی قید میں رہے اور اس عمل سے محروم رہے جسے وہ انجام دے سکتے تھے......

......اب امام رضاؑ کی اسٹریجی کا آغاز ہوتا ہے کہ جو ایک بالکل نئی، بہت حساس اور سخت قابل تأمل اسٹریجی ہے۔

امام کیوں اس طرح کی حساس اسٹریجی کو اختیار کرتے ہیں؟

میری نظر میں اس کی دلیل اس طرح ہے:

عاشورہ کے واقعہ اور پاکیزہ ہستیوں کے خون میں نہانے کے بعد، تشیع کی فریاد خاموشی میں ڈوبنے لگتی ہے۔ اب کسی میں یہ دم نہیں رہتا کہ وہ اہلبیت کی یاد منائے مگر گھروں کے کونے کھانچوں میں چھپ کر یہ ذکر جاری رہتا ہے۔ حاکم کی ساری تبلیغاتی مشنری اس کام پر مامور ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد کی انحرافی تاریخ کو عام سی بات ظاہر کرے اور لوگوں کے کان میں ڈالے کہ عاشورہ میں کچھ بھی نہیں ہوا، کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ تشیع کی کوئی فریاد بلند نہیں ہوئی۔ ابوبکر وعمر کی خلافت سے، اس موجودہ خلیفہ کی خلافت تک سارے امور رسول خداؐ کے حکم کے مطابق ہوئے اور بنیادی طور پر اس سات آٹھ نسل کے تاریخی فاصلہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا ہے!!

حکومتی مشنری کے یہ مبلغین جو کہتے تھے عوام بھی دل وجان سے اسے سنتے

تھے۔ وہ کوئی تاریخ داں تو نہیں تھے کہ تاریخ سے واقف ہوتے اور عاشورہ کو سمجھتے۔ وہ سیدھے سادھے لوگ تھے جو خلیفہ کے استحمار گرلاؤڈ اسپیکر کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے تھے۔

صرف مدینہ اور حجاز کے علاقے ایسے تھے کہ جہاں دلوں میں ابھی تک رسول خداؐ اور ان کے گھرانے کی یاد باقی تھی اور فقہا اور دانشوروں ۔۔۔ انٹلکچولز ۔۔۔ کا ایک محدود طبقہ تھا کہ جہاں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی۔ باقی سارے لوگ عمومی سطح پر، بلخ سے لیکر اندلس تک خلیفہ کی تبلیغاتی مشنری کی حیلہ سازیوں کی بدولت مطلق بے علم تھے کہ رسول خداؐ کے گھرانے پر کیا گزری ہے۔ خاص طور پر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے زمانے سے کہ جن کی زندگی گوشۂ زندان میں گزری ہے، رسول خدا کے خاندان کے نمائندہ اور علمبردار تشیع کا رابطہ عوام سے مطلقاً منقطع ہوگیا تھا اور اب تشیع، علیؑ کی تحریک، اہلبیت، عصمت، مظلومیت اور لوگوں کی بدنصیبی جیسے مسائل کی بات نہیں ہوتی تھی۔ ان پے بہ پے علمی اور فکری جہادوں اور رہنماؤں کی یاد دلوں سے محو ہوگئی تھی ...... کہ ایسے میں امام رضا علیہ السلام کی امامت قائم ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ ماموں اپنے اس پلان سے، امام رضا علیہ السلام کو اپنے اسلام دشمن، سیاسی اور سماجی نظام کی توجیہ کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا، اور درست ہے کہ وہ امام رضا علیہ السلام سے توسل کے ذریعے بنی عباس کی مخالفت کے سامنے اور خراسان کی تحریکوں کے مقابل بند باندھنا چاہتا تھا (یا یہ چاہتا تھا کہ اشراف عرب سے اپنی خلافت کے نقطۂ اعتماد کو اپنی نئی تحریکوں میں بدل دے اس لئے کہ ان کی والدہ ماجدہ

ایرانی تھیں اور اشراف عرب ان کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے) لیکن اس کے باوجود، امام رضا بھی چاہتے ہیں کہ ٹھیک اسی مناسب موقع سے کہ جسے دشمن نے ان کے لئے فراہم کیا ہے خود اس کے خلاف استفادہ کریں اور اس گزرگاہ سے شیعی امامت، شیعی تحریک اور ان ساری شہادتوں کو جو سارے شیعی انقلابات کی اساس ہے اور جو طاق فراموشی کی نذر ہوتی جارہی ہے، نئے سرے سے زندہ کریں۔ لیکن مامون کی ولایت عہدی سے متعلق پیشکش شیعہ رہبروں اور نیز ان کے اعتقادی مکتب کے خلاف ہے۔☆

یہی وہ مقام ہے کہ جہاں امام کے طرز عمل کا پیچیدہ نکتہ، پوری طرح واضح ہوتا ہے۔

☆......ان ہی امام اور ان کی تشیع کا حامل ''دفاعی'' مومن، امام کے اس عمل کی توجیہ اس طرح کرتا ہے کہ ''نہیں جناب، امام علیہ السلام پر دباؤ ڈالا گیا اور ان کے ساتھ سختی کی گئی...... ان سے کہا گیا کہ اگر ولایت عہدی سے انکار کرو گے تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا...... لہٰذا امام علیہ السلام نے بھی ---اسی طرح--- بحالت مجبوری ولایت عہدی قبول کی۔

اس توجیہ کو ہم کس طرح ''تشیع اور شیعیت کا دفاع'' کہہ سکتے ہیں؟ جہاں اس گھرانے کے حقیر ترین پیروکار کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر بھی عظیم ترین طاقتوں کے سامنے جھکایا نہ جاسکا ہو، ایسی فکر اور ایسی تحریک کا رہبر بھلا کس طرح ''اپنے جان کی سلامتی'' کو ''مصلحت'' جان کر مامون جیسے ظالم خلیفہ کا شریک کار بن سکتا ہے؟

اور پھر ہمیں نصیحت بھی کرتے ہیں کہ ''...... کیوں تم اپنی تنقید کو علمی اور علمائی تحقیقات کی طرح مودبانہ انداز میں نہیں کرتے''!؟

آخر اس بات میں ''علمی'' مسئلہ کہاں ہے کہ میں اس طرح اپنا نظریہ پیش کروں، اور وہ بھی اس طرح؟ کیا یہ ''علمی اشکال'' ہے کہ کوئی اس طرح اظہار نظر کرے اور دوسرا کہے ''امام علیہ السلام اپنے بیوی بچوں اور ''عزت و آبرو'' کی حفاظت کی خاطر، لوگوں کے خلاف لوگوں کے دشمن کے شریک کار ہوئے ہیں''؟!

بڑی عجیب بات ہے!

امام ایک طرف تو کام کی اساس کو اس بات پر رکھتے ہیں کہ اس مقام پر وہ کسی طرح کی لفظی یا عملی امر ونہی کو انجام نہیں دیں گے اور دوسری طرف سے وہ عازم خراسان ہوتے ہیں! اس میں شک نہیں کہ نہ صرف خود امام اپنے ''علم امامت'' سے بلکہ دیگر حضرات بھی اپنے شعور اور اپنی آگاہی سے جانتے ہیں کہ امام رضا علیہ السلام خلافت کے لئے ہرگز اچھا وسیلہ نہیں ہوں گے اور بالآخر شہید ہو جائیں گے۔ مگر یہ کہ وہ العیاذ اباللہ مکمل طور پر دائرہ امامت سے باہر آئیں اور ذوالیمینین اور سلف سیاہ کی طرح خلیفہ کے شریکِ کار ہو جائیں (کہ جو یہ بھی محال ہے)۔

دوسری طرف سے اگر وہ خلیفہ کی بات نہیں مانتے اور مدینہ میں گمنام اور نامعلوم رہتے (کہ جواب صرف ایک زیارت گاہ کی حد تک باقی رہ گیا ہے) تو اس صورت میں کسی کو بھی رسول اسلام کے فرزندوں اور ان کے حی وحاضر وارث کے بارے میں کوئی اطلاع حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ ساری خبریں بغداد کے دارالخلافہ اور نیز رے، روم، اور قرطبہ میں تھیں۔

آپ کے والد گرامی جناب موسیٰ کاظم علیہ السلام اور آپ کے دادا امام جعفر صادق علیہ السلام اسی مدینہ میں رہے لیکن خونی اور جلاد خلافت کی تبلیغاتی مشنری کی ''برکت'' سے اس وقت ایشیا، یورپ، اور افریقہ کے ان مسلمانوں پر حقیقت آشکار ہوگئی جو بنیادی طور پر ان ہی خلفاء کے ہاتھ کے بنائے ہوئے مسلمان تھے اور انہیں کسی بات کی خبر نہیں تھی اور وہ مطلق طور پر نہیں جانتے تھے کہ اس ''تعظیم شعائر'' اور ''ترویج علوم وفرہنگ'' کے پس پردہ جناب سیدہ کی آہ وزاری، علیؑ کے حق کے

غصب، حسینؑ کے پاکیزہ لہو، ابوذر کی جلاوطنی اور حجر وعمار...... جیسے پاکباز شہداء کی بات بھلائی جارہی ہے......! انہوں نے خلیفہ کے ڈھنڈورچیوں سے صرف یہی سن رکھا تھا کہ پیغمبرؐ کے مقدس خاندان کے کچھ لوگ مدینہ نام کے ایک گاؤں میں☆ اکٹھے ہوگئے ہیں اور بعد میں یہ نوبت آئی کہ انہوں نے دین میں ''رخنہ'' ڈالا اور امت میں ''خلفشار'' پیدا کیا...... اور قصہ ختم ہوگیا!

امام مدینہ میں امامت کو بھی مصلحت نہیں جانتے اور خلیفہ کی پیشکش کو قبول کر کے رخت سفر باندھتے ہیں...... وہ چاہتے ہیں کہ حکومت کی احتیاج کو ان شرائط کے ساتھ، وسیلہ قرار دیں تاکہ اس سے فریادی برجی کے عنوان سے تشیع کے شعار اور تشیع کی راہ کو، علیؑ کے حق کے غصب اور خلافت کے دین سے انحراف کو، اور شہداء کے پاکیزہ لہو اور ستمکش محروموں کے حق کو...... ایک بار پھر سارے عالم کی سماعت تک پہنچائیں۔

نیشاپور میں بارہ ہزار صاحبان قلم کے سامنے، ان سے کہ جن کا تعلق خاندان وحی اور خانوادہ امامت سے ہے، درخواست کی جاتی ہے کہ وہ قرآن اور اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی ایسی حدیث پیش کریں جو اس سے پہلے پیش نہیں کی گئی ہے۔ سب لوگ بڑی بے چینی سے اس تازہ حدیث کے منتظر ہوتے ہیں۔ سب کی نگاہیں محمل پر لگی ہوئی ہیں کہ آپ عمیق ترین فکری، کلامی اور فلسفی مسائل میں سے کسی مسئلہ کو پیش کریں، کہ اچانک امام کے لب ہلتے ہیں اور ہوا میں ایک گونج پیدا ہوتی ہے:

......''میں نے اپنے پدر بزرگوار سے، انہوں نے میرے جد سے اور میرے

☆...... کہ اب ایک ہزار چار سو سال بعد جا کر اس کی آبادی ۳۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

جد نے اپنے جد سے سنا...... کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:''

اس دور کے سارے بلند پایہ علماء، فقہا، محدثین، اور مفسرین، پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے دو صدیوں بعد منتظر ہوتے ہیں کہ ان کے فرزند کی زبان سے کوئی نئی حیدث سنیں۔

--- ''...... لاالٰہ الااللہ......!

تم سب فقہا، علماء اور فلاسفہ وغیرہ کے پاس فقہ و علم و فلسفہ سے لیکر شعر و ادب تک ہر چیز موجود ہے بجز حق بات توحید کے: لا الٰہ الا اللہ۔ جبکہ یہ ایک بنیادی بات ہے...... تم لوگ جو بہت سے مسائل و مباحث سے واقف ہو☆ توحید کو جو دین اصل اور میرے جد، رسول اللہ کا شعار ہے مجھ سے جو مدینہ رسول سے آرہا ہے ایک نئی حدیث کے عنوان سے سنو...... ''لیکن'' صرف یہی کافی نہیں --- کہ یہ ایک فلسفی، کلامی، اور ذہنی بات ہوگی بلکہ اس کی قبولیت:

--- ''...... مجھے ماننے --- یعنی'' امامت'' کی شرط پر ہے......''☆☆

☆......اور آپ جانتے ہیں کہ'' بیت الخلاء'' کے بارے میں ۲۷ ٹیکنیکی اور میتھیڈک مسائل ہیں کہ اگر انسان ان پر عمل کرنا چاہے تو اس میں اس کی ساری عمر صرف ہو جائے گی۔

☆☆......جن امام زادوں کو آج ہم کوہستانوں کے دشوار گزار ترین اور دور پرے کے علاقوں میں دیکھتے ہیں، ان علوی اور شیعی شہداء کے مدفن ہیں کہ جو اس مار دھاڑ اور قتل عام کے بعد بیابانوں اور کوہستانوں میں پناہ لیتے ہیں تا کہ خلافت کے عملے اور ان کے داروغوں کی نظروں سے دور، عدالت کے پیاسے دور ترین دیہاتوں کے رہنے والوں کے بیچ نفوذ پیدا کر کے ان کو خوفناک ترین بیابانوں اور کوہستانوں میں حکومت جور کے خلاف ابھاریں اور شیعہ ائمہ کے مقدس مبارزہ کے بیج کو ان کے آرزومند اور رنجیدہ دلوں کی گہرائی میں بو کر انہیں نسل در نسل بارآور ترین کریں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر ٹیلے کے پیچھے، ہر چٹان کے قریب اور ہر دیوار کے سایہ میں ایک شہید سو رہا ہے اور ایک امام زادہ ہوشیار۔

جی ہاں، شرطِ توحید کی برقراری، اصل امامت ہے:

۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اور مجھ جیسے لوگ اس توحید کی درستی کی شرط ہیں......!

امام اس ۱۲ ہزار افراد کے جمع غفیر میں اپنی اس مختصر بات سے ''امامت'' والے اسلام کے مقابل ''خلافت'' والے اسلام کی نفی کرتے ہیں، ''عدالت'' والے اسلام کے مقابل ''طاقت'' والے اسلام کی نفی کرتے ہیں، اور بالآخر اصل امامت پر اعتقاد کی شرط کے ساتھ اصل توحید کا اثبات کرتے ہیں۔

ان چند جملوں کے فوراً بعد ظاہر ہے امام کی سرنوشت کیا ہوگی......

ایران میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک علویوں کا قتل عام ہونے لگتا ہے، اس سرزمین میں دور و دراز علاقوں تک شیعوں کو پہلی فرصت میں تہ تیغ کیا جاتا ہے لیکن...... یہی ایک بڑی کامیابی ہے!

امام رضا علیہ السلام اس اسٹریجی کو منتخب کرکے، اپنے بعد، امام حسینؑ کے خونریز عاشورہ کی طرح ایک عظیم عاشورہ کو برپا کرتے ہیں۔ اس لمحہ کے بعد، ہر علوی، ہر شیعہ لوگوں کی بیداری اور خلافتِ جور سے ٹکرانے کے لئے ہر چٹان، ہر ٹیلے، اور ہر پہاڑ پر پھیل جاتا ہے اور دشوار گزار کوہستانوں کو اپنا مورچہ بناتا ہے۔ ☆

☆...... یہ حدیث، ''حدیث ذہبی'' کے نام سے مشہور ہے جسے اس دور کے علماء وفقہاء نے سونے کے پانی سے لکھا۔

پوری حدیث اس طرح ہے کہ امام نے محمل کا پردہ اٹھا کر فرمایا: لا الہ الا اللہ حصنی، فمن دخل حصنی امن من عذابی'' اور پھر ناقہ آگے بڑھا اور چند قدم آگے بڑھ کر امام نے پھر محمل کا پردہ بلند کیا اور کہا: ''بل بشرطھا و شروطھا و انا من شروطھا''

یعنی ''لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو اس میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے بچ گیا'' اور آگے کے جملے میں فرمایا: ''لیکن اس کے کچھ شرائط بھی ہیں اور ان میں سے ایک شرط میں ہوں۔'' (اردو مترجم)

یہاں تک کہ مسئلہ انتظار تک پہنچتا ہے۔

اس بنا پر، یہ شیعی رہبری، وہ دوڑ دھوپ والی رہبری نہیں کہ جو ''حکومت'' تک پہنچے اور خاموش بیٹھ جائے۔ ایک ایسی ہمیشہ جاری رہنے والی تحریک ہے کہ جو بنیادی طور پر بارہ نسلوں کی تاریخ میں، حکومت مخالف رہی ہے! (آگے کی دو سطریں چھپائی میں ادھوری رہنے کے سبب دائرہ فہم سے باہر ہے۔)

اب غیبت صغریٰ کا دور آتا ہے......

امام غیبت کے اس مختصر دور میں اپنی پناہ گاہ سے، قاصدوں کی روانگی اور بجٹ، اور آلات حرب وضرب کے ارسال کے ساتھ اسلامی ممالک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، خاص طور پر بلخ اور بخارا سے لے کر نیشاپور تک عالم اسلام کے مشرقی حصے میں جنگی تحریکوں کی رہبری کرتے ہیں۔ حاکم نظام اپنی پوری کوشش اور پوری تلاش کے باوجود ''تقیہ'' کی انتہائی سخت اور حد درجہ مخفی تکنیک کے مقابل اس بارھویں رہبر کو نہ گرفتار کر سکی اور نہ منظر سے ہٹا سکی۔

اور اس کے بعد غیبت کبریٰ کا آغاز ہوتا ہے......

رہبری اور ''ہدایت'' کے اس دور میں ''امت'' کو خود ''امت'' پر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ تشیع کے اسی ترقی یافتہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر اپنے درمیان سے عالم ترین اور عادل ترین راہبر کا انتخاب کرے اور یہ راہبر، امام معصوم کی نیابت میں ان ہی کی طرح اور شیعہ ائمہ کی اسٹریجی کی بنیاد پر ان کے ڈھائی سو سالہ مبارزہ کی روایت کو جاری رکھے اور تاریخ کے مستمر نظام کے خلاف ان کے ہمیشہ رہنے والے مبارزہ کی راہ میں اسلام کی امت اور بشری سماج کی رہبری کرے۔

(امر بالمعروف اور نہی عن المنکر)

غیبت کا دور وہ دور ہے کہ جس میں امت کے مبارزہ کی رہبری کی بقا اور اس کا استمرار کہ جو از قبل او پر سے بارہ نسلوں تک اور انقلاب کے کمانڈر کی جانب سے متعین ہوا تھا، اسی آئیڈیالوجی، اسی شعار، ان ہی اہداف اور اسی اسٹرٹیجی اور وابستگی کے ساتھ خود ان ہی آگاہ شیعہ عوام میں منتقل ہوتا ہے تا کہ وہ کامل ترین اور عادل ترین رہبری کو امام کی نیابت میں منتخب کریں، تا کہ وہ بشریت اور امتِ اسلام کی رہبری کے امر میں رہبری کی ہمیشہ رہنے والی روایت کو جاری رکھ کر "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے باب میں مستقل طور پر ان کے مبارزہ کی رہبری کریں، تا کہ وہ اس راہ سے لوگوں کو تاریخ کے حاکم اور مستمر نظام کے مقابل کہ جو دن بہ دن، زورمند تر اور زرمند تر ہو رہا ہے اس طرح بیدار، ہوشیار، آگاہ، اور مبارزہ کے لئے آمادہ کریں کہ پھر دنیا میں کوئی بھی زور کو تسلیم، غربت کو تمکین، اور ناآگاہی کو منظور نہ کرے اور ان کے خلاف قیام کرے یہاں تک کہ "قائم" کا ظہور ہو۔

والسلام

⌘ ❖ ♎ ❖ ⌘

دفتر دوم

ڈاکٹر علی شریعتی

تاریخ میں ذکر اور ذاکرین کا انقلابی کردار

ترجمہ: سید محمد موسیٰ رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

دیباچہ

ساری تعریف اس خدائے بزرگ وبرتر کیلئے کہ جس نے "ادع الی سبیل ربک بالحکمة و الموعظة الحسنتة و جادلهم بالتی هی احسن ......" کے ذریعے ہمیں دعوت کا ڈھنگ سکھایا، بحث و مباحثہ کا طریقہ بتایا، اپنے راستے پر بلانے کا اصول سمجھایا اور دعوت کا فرمان بھی صادر فرمایا۔

اور درود و سلام ہو نبوت کے اس گھرانے پر کہ جس نے ہدایت میں یہی اصول سامنے رکھے اور علم و عقل کے جوہر دکھائے اور دلوں پر اپنی عظمت و توقیر کے سکے بٹھائے اور شجر اسلام کی وہ آبیاری کی کہ آج اس کی ہر شاخ اور ہر پتا نہال ہے، اور ہر پھول اور ہر کلی میں نکھار ہے۔ علم ان ہی کو دیکھ کر روزن کھولتا ہے۔ ان ہی کو دیکھ کر مسکراتا ہے، ان ہی سے اس کے چہرے پر شادابیت آتی، اور اس کا سر فخر سے بلند ہوتا ہے، یہی اس کی روح حیات ہیں، یہی اس کے وجود کی عینیت ہیں، جہاں یہ نہیں وہاں علم نہیں، جہاں یہ نہیں وہاں عقل نہیں، جہاں یہ نہیں وہاں عدل نہیں، جہاں یہ نہیں وہاں شرافت نہیں، جہاں یہ نہیں وہاں صحت نسب نہیں، جہاں یہ نہیں وہاں روشنی نہیں، اجالا نہیں، تہذیب نہیں بلکہ رسول نہیں، خدا نہیں قیامت نہیں۔

ذرا سنئے تو علم کے دروازے سے کیا آواز آ رہی ہے:

"خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے حکمت کا کوئی کلمہ سنا تو اسے گرہ میں باندھ لیا، ہدایت کی طرف بلایا تو دوڑ کر قریب ہوا......"

تو آیئے ذرا اہلِ شریعتی کی حکمت کی باتوں کو بھی سنئے اور اس کے درد کو سمجھئے، اس کی بے قرار کو پرکھئے، اس کے شب و روز کی فریاد پر توجہ دیجئے، اس کے پیغام پر غور کیجئے، اس کی تاریخی مثالوں پر گہری نظر ڈالئے، اندازِ بیان اور واقعیتوں سے سرسری نہ گزریئے، موضوعات پر اس کی گرفت کو ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ اس نے اہلِ تشیع کے سارے عقائد و شعائر کے انقلابی کردار کو کس طرح پیش کیا ہے، اور اگر اس میں آپ کو حکمت کی باتیں ملیں اور ہدایت کا راستہ دکھائی دے تو اپنے آپ کو بابِ مدینۃ العلم کی مذکورہ دعا سے محروم نہ فرمایئے۔

بس اس سے زیادہ اس کتاب کے بارے میں کہنا سعی لاحاصل ہوگا، اس لئے کہ آغازِ کتاب ہی میں اس باطن بیں مردِ مجاہد نے سب کچھ کہہ دیا ہے اور اب مزید کچھ کہنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔

میری دعا ہے کہ اس دلیر، شجاع اور بیباک و بے بدل انسان کو خدا اس ہمہ صفت انسان کے ساتھ محشور کرے جسے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت ذرا نہ سکی جو فاتح بدر و خیبر و خندق و حنین ہے، جو اپنے وجود کی لامتناہی فضیلتوں میں اپنے خاندان کی تمام بلند پایہ خصوصیتوں میں، اپنے دوستوں کے روح کی عظمت میں ان کے خلوص کی پاکیزگی اور ان کی شخصیت کے کمال میں، فضیلت کی تمامیت کے نقطہ نظر سے بھی اور نوعِ انسان کی ہر ممکن "کمالِ فضیلت" کے اعتبار سے بھی یکتا اور بے نظیر ہے۔

الحمد اللہ الذی جعلنا من المتمسکین بولایت امیر المومنین و اولاد الطاہرین۔

حلقہ بگوش خاندانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ

سید محمد موسیٰ رضوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم○

”ذکر“ اور ”ذاکرین“ کا انقلابی کردار

دردمند سننے والوں کے لئے ایک صحت بخش پیغام

مطالعہ کرنا، سوچنا، تحقیق کرنا، جستجو کرنا، پوچھنا اور حقیقت تک پہنچنا میرا ہمیشہ کا معمول ہے۔ حاصل شدہ باتوں کا بیان میرے پڑھنے لکھنے اور سوچنے پر دلیل ہیں۔

اگر میں پڑھتا ہوں، جستجو کرتا ہوں، پاتا ہوں اور بولتا ہوں تو اس کا محرک وہ درد ہے کہ جس نے میری روح میں اپنی جڑیں گاڑ رکھی ہیں، اور اگر میں ان سب سے منہ موڑلوں تو درد و روح مل کر میرا خاتمہ کردیں گے۔ یہ وہ موت سے ہمکنار کرنے والی بیماری ہے کہ جس نے ہماری تاریخ، ہماری ثقافت، ہمارے مذہب اور ہمارے لوگوں پر یورش کی ہے اور ایک لمحہ کی غفلت، سب کچھ ختم کردے گی۔

یہی وجہ ہے کہ میں چین سے نہیں بیٹھتا، اس لئے کہ درد اتنا شدید ہے کہ آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا اور بیمار لوگ موت سے اتنے قریب ہیں کہ اب ان کے پاس دوسروں کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں وہ بے درد طبیب نہیں ہوں کہ بڑے آرام و سکون کے ساتھ معائنہ کروں اور نسخہ لکھوں۔ بلکہ دردمندوں کے جم غفیر میں ایک دردمند ہوں اور شاید دوسروں سے کچھ زیادہ ہی درد کا احساس کرتا ہوں اور مسؤلیت کو بعض باضابطہ مسؤلین سے زیادہ شدید تر اور زیادہ عمیق تر محسوس کرتا ہوں۔ اور شاید ایسا

نہ بھی ہو اور صرف اس بات کی بے قراری ہو کہ کہیں مجھے مصلحت اندیش نہ بنا پڑے اور کہیں میں احتیاط کی عقلی توجیہ نہ کر بیٹھوں اور صرف اس بات کو پیش نظر رکھوں کہ کچھ کہوں اور اس طرح کہوں کہ نہ سیخ جلے اور نہ کباب۔ پس میں نہ پیشہ ور لکھنے والا ہوں اور نہ پیشہ ور بولنے والا، اور نہ ہی میرے سننے والوں کو بھی پیشہ ور سننے والا ہونا چاہئے۔

یہ میرے معمول کے کاموں میں نہیں ہے کہ میں لکھوں اور بولوں، اور نہ ہی میں نے لکھنے اور بولنے کو کسی پیشہ کے عنوان سے اختیار کیا ہے بلکہ یہ میرے شب و روز کی فریاد اور میری صدائے تنفس ہے۔

یہی وجہ ہے میرے لکھنے اور بولنے کیلئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے۔ (بھلا سانس لینے کے لئے کسی وقت کا تعین ہو سکتا ہے ؟!) میں درد سہنے اور فریاد کرنے کے لئے کسی ترتیب وآداب کے درپے نہیں ہوتا۔ میری نظر میں اور کوئی اہم کام ایسا نہیں کہ جس کے لئے میں چند لمحے بھی اپنی سانس کی ڈور کو اس کی طرف پھیر دوں !!

اور فطری طور پر میرے پڑھنے والوں اور سننے والوں کو بھی چاہئے کہ وہ مجھے اس طرح پڑھیں اور سنیں جیسے کوئی فکر سانس لے رہی ہو، اور جس طرح میں سانس لے رہا ہوں اور زندہ ہوں۔

پس بولنے والے اور سننے والے کے درمیان ایک ایسا رابطہ ہے کہ جو اس رابطے کے ساتھ ایک نہیں ہو سکتا کہ جو ایک عام، معقول، منطقی اور پیشہ ور بولنے والے، سننے والے، لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

ایک دفعہ، غیر معمولی کیفیت کے ساتھ (اور اس احساس کے ساتھ کہ میں سننے والوں میں کا ایک فرد ہوں، اس طرح کی کیفیت وجود میں آتی ہے) میں یہ مسئلہ بیان کر رہا تھا کہ اگر ہم 'صفوی تشیع" کو ایک طرف رکھ دیں اور 'علوی تشیع" سے بالستقیم رابطہ قائم کریں تاکہ اس کی تابش براہ راست (صفوی فلٹروں سے گزرے بغیر) ہمارے قلب پر منعکس ہو تو آج کی تیسری دنیا اور اس صدی کی منحرف نسل اور مسلمانوں کا مسئول و آگاہ وجدان (ساری دنیا میں) شیعوں کی امامت، عدالت، ایمان اور وحدت پر مبنی آواز کو تسلیم کرے گا، اس لئے کہ آج کی دنیا کا اصلی نعرہ: "ایمان"، مغرب کا، "عدالت اور طبقہ بندی کے خلاف جنگ" تیسری دنیا کا، اور "ایمان اور طبقاتی انتشار (استحصال کی ایک قسم) کے ساتھ جنگ' اور خاص طور پر "امپریالزم اور صہیونیزم کے مقابل اتحاد اور یکجہتی" دنیائے اسلام کا نعرہ ہے اور یہ سب باتیں علوی تشیع کا نصب العین ہیں...... لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ سننے والے کہ جو ایک پیشہ ور مستمع ہیں اور ان کا تعلق ان لوگوں سے ہے کہ جو اپنی فرصت کے اوقات کو اپنے کام، اپنے گھرانے، اپنی تفریح اور اپنے معقول اور منطقی احتیاجات کے درمیان تقسیم کرتے ہیں اور اس میں سے کچھ وقت وہ اچھے کاموں اور دینی امور کے لئے بھی نکال لیتے ہیں، چیخ اٹھتے ہیں کہ: بیوی سے میرا وعدہ تھا کہ ہم ساڑھے دس بجے چکن تکہ کھانے چلیں گے لیکن اب گیارہ بج رہے ہیں اور ہم دونوں انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں اور ہمارا سارا پروگرام تہس نہس ہو گیا ہے!! آپ دیکھ رہے ہیں کہ نہ یہ ہمارے درد کی فریاد کے سننے والے ہو سکتے ہیں اور نہ ہم ان جیسے بے درد سننے والوں کے مقرر ہو سکتے ہیں کہ جو اپنے دین اور اپنے اعتقادات کی جلا کے لئے بھی، پروگرام کے

ساتھ آتے ہیں جو کبھی چکن تکہ سے پہلے اور کبھی بعد میں ہوتا ہے......

☆......☆......☆

شیعہ تاریخ میں "ذکر اور ذاکرین" کے انقلابی عنوان کے تحت میری کوشش ہے کہ میں شیعوں کے سارے عقائد و شعائر کے انقلابی کردار کو منظر عام پر لاؤں۔ ان عقائد و شعائر کو کہ جو آج کی دنیا کے ایک بیدار مغز اور سماج کا دکھ رکھنے والے انسان کی نظر میں (کہ جو ایک ترقی پسندانہ اور علمی ذہنیت کا حامل ہے) موہوم، بے بنیاد، نشہ آور اور رجعت پسندانہ ہے۔ وہ خواہ کوئی مذہبی شخصیت ہو یا غیر مذہبی، خالص اور معتقد شیعہ ہو یا غیر شیعہ ان عقائد و شعائر پر ضرب لگانے سے گریز نہیں کرتا اور ہم خود بھی کہ جو شیعہ عقائد کے حامل ہیں اور اس مذہب کو (حتیٰ آج کے انسان کے لئے بھی) انتہائی ترقی پسندانہ، نجات دہندہ اور آگاہی و بیداری بخشنے والا مذہب سمجھتے ہیں ان مسائل کو شدت سے ہجو کرتے تھے اور اس بات کے حق میں تھے کہ ان کے خلاف اقدام کر کے انہیں دور کریں تاکہ معاشرے کے ذہن کی تطہیر ہو سکے اور وہ تشیع کے اصلی اور اساسی عقائد و شعائر کو ماننے پر آمادہ ہو۔

اس بناء پر میری گفتگو کا موضوع وہ بگڑے ہوئے اعتقادات، عادات، عبادات اور وہ روایات و اعمال اور خود نمائیاں ہیں کہ جو ترقی پسند، روشن خیال لوگوں کی نظر میں (حتیٰ ان کے نزدیک بھی کہ جو انتہائی سخت شیعہ ہیں) عامیانہ، پست، اور قابل مذمت دکھائی دیتے ہیں۔

اس منزل پر میں چاہتا ہوں کہ ان احکامات اور اعتقادات کو اجاگر کروں کہ جن پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہے، اور اس بات کو واضح کروں کہ آخر کیوں مختلف

لوگوں کی طرف سے (جن میں، میں بھی شامل ہوں) ان اعتقادات پر تنقید ہوتی رہی ہے اور کیوں اسے ابتدائی دور کے تشیع سے (یعنی علیؑ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے گھرانے کے تشیع سے کہ جو سچا اور حقیقی اسلام ہے) متغایر اور متناقص سمجھا جاتا رہا ہے۔

واقعیتوں کو انکے زمان و مکان کی خصوصیتوں کیساتھ پرکھنا

عمرانیات یا سوشیالوجی کے اعتبار سے بہت سے اعمال و مفاہیم کے معنی، ان کے پیغام اور ان کے کردار، معاشرے کے انقلابات کی درازی وقت اور تاریخ و زمانے کے تغیر کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہ تغیر و تبدیلی "مثبت" سے "منفی" اور انقلابی ترین کردار سے ارتجاعی ترین کردار تک کا ایک فاصلہ ہے۔

سماجی تاریخ و انقلاب اور معاشرتی نظاموں کے درمیان اختلاف بعض اوقات کسی مفہوم اور کسی نئی بات کو اس طرح بدل دیتا ہے کہ "خیر"، "شر"، "ارتجاعی"، "انقلابی"، اور "انقلابی"، "ارتجاعی" ہو جاتا ہے اور "منطقی بات"، "غیر منطقی" اور "غیر منطقی بات"، "منطقی" دکھائی دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حقائق اور اصول مطلق کے علاوہ (میرا مقصد ان حقائق و اصول سے ہیں کہ جو ماورائے طبقات ہیں اور جنہیں علمی اصطلاح میں ماوراء تاریخ کہتے ہیں اور وہ ہر سماجی نظام اور بدلتی تاریخ کے ہر دور میں ایک مستقل اور مستحکم معاشرہ بن گئے ہیں) بہت سے اعمال و افکار و احکام ایسے ہیں جو اپنے وقت کے اعتبار سے صحیح مفہوم کے حامل ہیں مگر جب ان کا وقت گزر جاتا ہے (یعنی جب معاشرے میں تبدیلی آجاتی

ہے) تو ان کی صورت بھی بدل جاتی ہے اور ان کے مفہوم میں بھی فرق آجاتا ہے۔

پس ہمیں چاہئے کہ ہم ان کو ایک بڑی حقیقت کے عنوان سے تسلیم کریں اور اس نگاہ سے دیکھیں جس سے کہ وہ اپنی پیدائش کے دور میں رہے ہیں، اس نگاہ سے نہیں جو آج کی بیسویں صدی کی نگاہ ہے (اور جو صنعتی انقلاب اور فرانس کے انقلاب کبیر کے دو سو سال بعد اور دنیا کے دیگر انقلابات اور پیداواری نظام سمیت تمام اخلاقی، خاندانی، اقتصادی، اور اجتماعی روابط کی تبدیلیوں کے بعد وجود میں آئی ہے) بلکہ انہیں اپنے زمانے کی نگاہ سے دیکھیں جس میں ان کا خاص کردار رہا ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے اور آج کی نگاہ سے ان کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں تو ہمارا یہ فیصلہ منطقی تو ہوگا (اس لئے کہ ہم نے آج کی منطق کی رو سے اسے پرکھا ہے) مگر بے جا اور بے اہمیت ہوگا۔ اس لئے کہ جس بات کی ہم مذمت کر رہے ہیں وہ آج موجود نہیں ہے کسی اور دور میں رہی ہے اور اس کا کوئی اور مفہوم رہا ہے۔ پس بقول پروفیسر "ترک": "ہر معاشرتی واقعیت کو اس کے اپنے زمان و مکان کے احاطے میں پرکھنا چاہئے" مثلاً جب ہم اسلام اور جناب رسالتمآب ﷺ کی زندگی میں ایک سے زیادہ ازواج کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہم زمان و مکان اور اجتماعی رابطے کے عمل کو بھی اپنے معیار اور فیصلے میں شامل کریں اور پھر تشخیص کے لئے بیٹھیں اس لئے کہ ایک اجتماعی نوظہور شے (ایک قانون اور ایک عمل) کو تاریخی اور اجتماعی پس منظر سے ہٹا کر مطلق اور مجرد انداز میں فیصلہ کرنا ایک عامیانہ عمل ہے۔ اس لئے کہ ہر نوظہور شے سماجی نظاموں کی تبدیلی کے دوران انتہائی پست ترین درجے سے انتہائی بلند ترین درجے تک اور انتہائی بلند ترین درجے سے انتہائی پست ترین درجے تک پہنچتی ہے۔

یہاں میں پھر اس بات کی تکرار کو ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے پیش نظر وہ عقائد و احکام نہیں ہیں کہ جو مطلق ہیں اور جو اجتماع، اقتصاد، طبقات اور تاریخ سے ماوراء ہیں، جیسے "قوانین فطرت" (نہ کہ فطرت کہ جو ہمیشہ تغیر کے عالم میں ہے)

اس تغیر و تبدیلی کی دریافت میرے لئے بڑی لرزہ خیز اور ہیجان انگیز تھی اسلئے کہ اس سے پہلے میں بہت سے ایسے اعتقادی اور عملی مسائل کو کہ جو اس وقت شیعہ معاشرے میں موجود ہیں اور لوگ انہیں منفی پہلو میں لیتے ہیں کچلتا رہا ہوں اور انہیں تنقید کی زد پر لاتا رہا ہوں اور شدت سے چاہتا رہا ہوں کہ یہ سب کچھ ختم ہو جائے اور شروع دور کے شیعہ عقائد اس کی جگہ آجائیں، مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہی سب وہ مسائل واعتقادات واعمال رہے ہیں کہ جو شیعی تاریخ کی خصوصی سرنوشت میں ایک منطقی اور انقلابی کردار کے حامل ہیں اور اس کے لئے ایک نجات دہندہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس وقت میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے سیکھا ہے اسے ایک درس کی طرح خود اپنے اور دوسروں کے سامنے پیش کروں اور بتاؤں کہ: جب کبھی ہم اپنے مذہب اور معاشرے میں کسی اضافی شے کو پائیں اور اس کے بارے میں تحقیق کریں اور اسے منطقی نقطہ نظر سے پرکھیں اور آج کی موجودہ مسئولیت کے ساتھ اس کا موزانہ کریں اور اسے غیر منطقی اور مذموم پائیں تو ضروری ہے کہ اس کے لئے زمانے کے علمی ضابطے اور تاریخ کے معیار کو (یعنی تاریخی تقدیر میں اس کی سرنوشت کو) بھی زیر نظر لائیں اور اسے اس کے خاص زمان و مکان میں لاکر اس کا جائزہ لیں۔

پس اپنے مذہب کی اجتماعی، عملی، اور اعتقادی انوکھی باتوں کی گہری اور علمی

شناخت اور اس خاص ذمہ داری سے آگاہی کے لئے کہ جو تاریخ اسلام میں (مذہبی اعتبار سے بھی اور اجتماعی نقطہ نظر سے بھی) اہل تشیع پر لاگو ہے ہمیں چاہئے کہ ہم ان مسائل کو جن سے اس وقت ہمیں سروکار ہے انہیں ان کے خاص زبان و مکان کے ظرف میں جانچیں، یعنی پہلے اس بات کو واضح کریں کہ تشیع کا خاص تاریخی ظرف کیا ہے اور پھر ان مسائل کو اس ظرف میں ڈال کر انہیں پرکھیں، جانچیں، فیصلہ کریں اور اختیار کریں۔

یہاں پھر ایک وضاحت کی ضروری ہے کہ اسلامی اور شیعی حقائق ایک محکم، پایدار، ثابت اور لایتغیر حقائق ہیں اور جس چیز کو تغیر ہے وہ عقیدہ کی نوعیت، زمانے کی کیفیت، مادی اور معنوی وسائل اور اس کی صورت اور اس کوشش کے انداز سے عبارت ہے کہ جو ان ثابت حقائق کی نشر و اشاعت اور ان کے تحفظ و احیاء کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ اسلام کے اعتقادی یا عملی اصولوں میں بھی تبدیلی آنی چاہئے تو اپنے دین پر اس کے ایمان کی ضمانت نہیں ہو سکتی لیکن ہو سکتا ہے شاید ایک اجتماعی رہبر، ایک مفکر یا اپنے معاشرے کے لئے ایک نیک نیت شخص کی حیثیت سے اسے تسلیم کر لیا جائے۔

تمام فرقے، تمام پارٹیاں اور تمام شیعی اور اسلامی نظریات اس عقیدہ میں مشترک ہیں کہ جو اصول قرآن اور سنت سے برآمد ہوتے ہیں وہ ایک لایتغیر (اعتقادی اور عملی) اصول ہیں۔ لیکن ان اصولوں کی حفاظت اور انہیں پیش کرنے اور بیان کرنے کے سلسلے میں یہ بات اٹل ہے کہ مختلف نظریات میں (اہل تشیع اور اہل سنت کے بیچ) اختلاف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ (ہم جیسی) ایک جماعت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اسلام کے مستحکم احکام اور تشیع کے لایتغیر اقدار و اصول کو زمانے کے تغیر پذیر افہام کی تجلی میں واگزار کرنا چاہئے اور زمانے کی مشکلات، اس کے غم و درد، اس کی ضرورتوں، اس کے علمی زبان اور معاشرتی فکر و نظر کے مطابق اور ان مسائل اور عینی واقعیات کے اعتبار سے انہیں پیش کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اسلام عین فطرت ہے اور اس کے اصول ثابت ہیں۔ لیکن یہ علم ہے (یعنی بیرونی واقعیت سے ہمارا رابطہ) کہ جو تغیر و تحول و تکامل کے عالم میں ہے اور اسی کے تحول و تکامل سے وہ ثابت اصول واضح ہوتے ہیں جو فطرت کی تعبیر کرتے ہیں اور جنہیں ہم علمی قوانین کا نام دیتے ہیں۔

وحی (وہ تمام باتیں جو نازل ہوئی ہیں) ایک محکم و ثابت واقعیت اور ناقابل تغیر علم ہے لیکن اس واقعیت (قرآن) پر یہ ہمارا علم اور ہماری تبلیغ و تفسیر و تفہیم اور اتخاذ فکر کا طریقہ ہے کہ جسے برحسب تکامل و تغیر بشر کے اور مختلف نظاموں کے بدلے ہوئے حالات اور ان کے دکھ دردوں، ضرورتوں اور تغیر و تکامل کے مطابق ہونا چاہئے۔

یہی وہ باتیں ہیں جنہیں میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور یہ وہی باتیں ہیں جنہیں میرے ہم خیال اور ہم عقیدہ ساتھی نے کہیں اور، کسی دوسرے مجمع میں پیش کیا ہے اور اسے چاہئے کہ وہ مجھے بھی اس بات کی اجازت دے کہ چونکہ میں ایک دوسرے مجمع سے مخاطب ہوں (جو فکری، ثقافتی اور روایتی اعتبار سے اس کے مخاطبین سے مختلف ہیں) اس لئے دوسرے الفاظ اور دوسری اصطلاحات کو بروئے کار لاؤں اور میرا استدلال، میری اتخاذ فکر اور انداز نظر اس سے مختلف ہو۔

تاثرات اور نظریات کے باب میں زبان کا یہ تفاوت و تحول ضروری ہے، اس لئے کہ اگر مذہب کو فروغ حاصل نہیں ہو رہا ہے تو اس کا سبب زبان و فکر و ضروری استدلال کا فقدان ہے، ورنہ معنویت کی طلب اور حقیقت یابی کی گدگداہٹ جتنی آج کے دور میں ہے پچھلے کسی دور میں نہیں رہی ہے۔ آج کا تعلیم یافتہ نوجوان جس پر دین سے برگشتگی کا الزام ہے پچھلی نسل اور اس سے پچھلی نسل سے (کہ جس پر دینی تعصب اور حقیقت پرستی کا الزام ہے) زیادہ بات کی تہ تک پہنچنے کا درپے ہے اور حقیقت فہمی سے اس کی رغبت اور دلچسپی ختم نہیں ہوئی ہے۔ جہاں کہیں بھی ہم نے اس کی زبان میں گفتگو کی ہے اس نے اپنی تقدیر ساز ہستیوں کو چھوڑ کر ہماری طرف توجہ کی ہے اور بڑی تن دہی سے اسے سنا ہے۔ ہمارے طالب علموں نے ان مذہبی کتابوں کو جنہیں ان کی زبان میں لکھا گیا ہے اپنی درسی کتابوں پر (حتیٰ امتحان کی رات میں) ترجیح دی ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے اپنے کلاسوں سے بھاگ کر ان مقامات تک پہنچے ہیں جہاں وہ مذہب کو اپنے استدلال، اپنی اصطلاحات اور اپنی زبان میں سنتے رہے ہیں۔ یونہی بلا سبب نہیں کہ اس نسل کی زبان میں لکھی گئی مذہبی کتابوں کی اشاعت کی تعداد اوسطاً ۲۰ ہزار ہے جبکہ فنون لطیفہ، شعر و ادب اور ان جیسی کتابوں کی تعداد باوجود اس کے کہ انہیں رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اب یہ فیشن میں آگئی ہیں، اوسطاً دو ہزار ہے۔

ایسی چاہت، ایسا شوق و ذوق اور ایسا ولولہ کب اور کہاں رہا ہے؟ پر اب ہے، اگر ہم ان کی زبان سے آشنا ہوں اور وہ ہماری زبان کو سمجھیں اور پسند کریں۔

ہمارا اختلاف بھی وہ غلط فہمیاں ہیں جو دو زبانوں کے نتیجہ میں ابھری ہیں اس

لئے کہ ہماری زبان ان کی زبان سے الگ ہے۔ ہم نے اختلاف زبان کو اختلاف عقیدہ سمجھ لیا ہے۔ مثلاً جب میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام کے اصولوں میں ایک اصل اللہ سے انسان کا براہ راست رابطہ ہے تو مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ پھر مذہبی علماء اور اسلامی اور شیعی روحانی پیشواؤں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اور میں نے اپنی "اسلام شناسی" کی کتاب میں اس سوال کا جواب دیا ہے کہ:

"اجتماعی روابط کے پھیلاؤ، علوم و افکار کی فراخی، اور انسان کی مادی اور معنوی ضرورتوں کے سبب مذہبی مسائل کی گسترش نے رفتہ رفتہ تخصص (ماہریت) کے مسئلہ کو تاریخ اسلام میں رونما کیا بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہم یونانی فلسفے کی سرگزشت میں دیکھتے ہیں۔ بہ این سبب، فطری طور پر ایسے لوگوں کا ظہور عمل میں آیا جنہوں نے اپنی تمامتر کوششوں کو مذہبی علوم کی تعلیم و تعلم کیلئے وقف کر دیا، اس لئے کہ صدر اسلام کے برخلاف، ہر کوئی اپنی ضرورت کے مذہبی مسئلہ کو زندگی کے دیگر امور کے ضمن میں سیکھنے اور سمجھنے سے قاصر تھا، یہی وجہ تھی کہ ضرورت نے مذہبی علما کے نام سے کچھ لوگ پیدا کیے۔ لیکن قانونی، عمرانی، اور سیاسی نقطہ نظر سے "ضرورت" اور "رسمیت" (قانونی شکل) کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ علماء علم طب اور طبیعیات کا وجود ضروری ہے لیکن ان کا باضابطہ خصوصی اجارہ دارانہ منصب نہیں ہے۔ اس بناء پر طب یا فزکس میں، استبداد، گھٹن، جمود اور توقف کو نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن اگر انہیں رسمیت حاصل ہوتی تو یہ قوت ان کے ہاتھ میں بھی آجاتی۔

ضروری مناصب کے لوگوں کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، اور وہ سماج کی ضرورت، سارے لوگوں کے شعور و آگہی اور سب کے ارادے سے انتخاب ہوتے

ہیں، سب لوگوں کا ان پر اعتماد ہوتا ہے اور وہ سب کے مرجع اور تکیہ گاہ ہوتے ہیں اور ظلم و زیادتی نہیں کر سکتے اور نہ ہی نادرست اور آلودہ ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنے اچھے انسانی صفات کی بنیاد پر منتخب ہوئے ہیں لیکن جن کو سرکار نے چنا ہے ان صفات کے بغیر بھی اس کی رسمیت باقی ہے۔

مثال میں عرض کروں کہ ایک چوکیدار جسے لوگوں نے منتخب کیا ہے چور کا مددگار نہیں ہو سکتا اور ظلم و زیادتی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ تعلیم یافتہ شخص جو مدرسے سے خالی محلہ میں لوگوں کے ذریعے درس و تدریس کے لئے منتخب ہوا ہے کبھی ان پڑھ، گمراہ اور بد عمل نہیں ہو سکتا لیکن ایک سرکاری سطح پر آنے والے چوکیدار یا مدرس نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے منوالیا ہے، اب کون اس کے مقابل کھڑا ہو سکتا ہے؟

اور پھر ڈھیر ساری مثالوں اور جانے کتنی توضیحات کے ساتھ ایک ایسا شخص کہ جو تعلیم یافتہ بھی ہے! بیٹھ کر کہتا ہے کہ: فلاں شخص (یعنی میں) اسلام میں علمی اور روحانی پیشوائیت کی رسمیت کو نہیں مانتا، اور سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے "نہیں ماننے" سے علماء کی توہین کی ہے۔ حالانکہ اگر وہ میری زبان کو سمجھ لے تو اس بات کو پالے گا کہ رسمیت یا حکومتی بنیاد پر ماننا توہین ہے۔ اور میں نے ان علماء کی تائید و تعظیم کی ہے کہ جنہیں لوگوں نے ان کے تقویٰ، ان کے علم اور ان کے سینے کی کشادگی کی بنیاد پر منتخب کیا ہے۔

میرا مسلمان بھائی کہ جس نے صدر اسلام میں ماہ و سال کام کیا اور بقیہ وقت بیکاری میں گزارا آپ خود براہ راست اپنے مذہب اور اپنے اصول اعتقادات کا علم

حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن بعد میں جب ہمارا سامنا ایک ایسے اسلام سے ہوا کہ جس میں دوسری ثقافتوں کے مظاہر اور فلسفوں کی آمیزش ہوئی اور کام کاج نے تحقیق و تتبع کا موقع نہیں دیا اور اسلامی ثقافت میں بھی روز بروز وسعت آتی گئی اور اس میں تحریفات، دم جھانسے اور دیگر مختلف عناصر کی شمولیت ہوئی تو ایسے افراد کی ضرورت پیش آئی کہ جو اسلامی علوم و تاریخ و ثقافت پر دسترس رکھتے ہوں۔ پس یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کا وجود اسلامی معاشرے میں، معاشرتی، ثقافتی، اور مدنی حالات کی تبدیلی اور تکامل کے زیر اثر ایک علمی اور اسلامی ضرورت بن گیا اور بالطبع یہ لوگ گم کردہ راہ اور جاہل نہیں ہوسکتے، جس طرح کہ عیسائیت کی باضابطہ روحانیت میں ہے۔

اگر میں اس طرح کے مسائل کے بیان میں مورد الزام ٹھہرتا ہوں تو اس کا سبب غلط فہمی اور زبان کی دوگانگیت ہے۔ زبان کے اختلاف کی نشانیوں میں ایک اور بات وہ مطلب ہے جو "شیعہ ہونے کی ذمہ داری" سے لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: کیا "شیعہ ہونا" جرم ہے کہ جس کی ذمہ داری ہو؟ اور انھیں حق پہنچتا ہے، اس لئے کہ جب وہ اپنے ادارے میں کوئی غیر قانونی کام چاہتے ہیں اور سنتے ہیں کہ نہیں ہوسکتا، ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو سمجھتے ہیں کہ ذمہ داری عائد ہونا، یعنی ناجائز کام انجام دینا!

آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات صرف زبان کے نہ سمجھنے کی ہے، وگرنہ میں بھی کہتا ہوں "عدل"، وہ بھی کہتے ہیں "عدل" مگر میں اپنے ہم خیال اور ہم زبان کو سمجھانے کے لئے تاکہ وہ اسلامی عدل سے اس عدالت کا دھوکہ نہ کھائے جسے "ایلن ڈیلسن" نے پیش کیا، کہتا ہوں، "وہ عدل جس پر شیعوں کا تکیہ ہے، اساسی ترین جہتوں میں اس کا مفہوم طبقاتی نظام کے خلاف جنگ ہے"۔ اور وہ جو نہیں سمجھتا کہ میں کیا کہہ رہا

ہوں، سمجھتا ہے کہ میں کسی اور عدل کی بات کر رہا ہوں۔

سماجی ضرورت اور مشیت الٰہی

تنقید کرنے والے تنقید کرتے ہیں کہ میں بعض اوقات شیعی اور اسلامی مسائل کی توجیہ کو سماجی اور طبقاتی توجیہ سے کرتا ہوں، حالانکہ اس کی صرف اور صرف الٰہی توجیہ ہے یعنی زمانے کو اس کی ضرورت تھی اور ساتویں صدی کے ایرانی، رومی، اور عرب ہمیشہ سے زیادہ طبقاتی امتیاز، حکومت و حاکمیت کے استبداد اور نسلی امتیاز سے فریاد بہ لب تھے اور یہ گراؤنڈ اس بات کا سبب بنا کہ اسلام اس زمانے کے ایک بڑے متمدن معاشرے میں (شروع کی نصف صدی کے اندر) بڑی تیزی اور شدت کے ساتھ وسعت پائے......"

کہا گیا ہے کہ: اسلام کو ایک سماجی اور تاریخی واقعہ سمجھنا ایک مادی توجیہ ہے۔ حالانکہ اسلام کا وجود وحی سے عمل میں آیا ہے اور اس کا نزول آسمان سے ہوا ہے اور اس کی گسترش اور کامیابی بھی خدا کے ارادے سے ہے۔ میں اس مقام پر کہنا چاہوں گا کہ "سماجی واقعہ"، "تاریخی ضرورت" اور سماجی قانون۔ مشیت الٰہی سے مختلف نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظریہ، وحدت کی دعوت دیتا ہے، اور وہ نظریہ کہ جو، ہر اس شے کو کہ جو اجتماعی، قانونی، مادی اور معاشی ہے خدا کی سلطنت سے باہر سمجھتا ہے اور ہر اس چیز کو کہ جو صرف غیر معقول، غیبی، قانون سے ہٹ کر اور سائنسی اصول کے خلاف ہے خدا سے منسوب کرتا ہے، اسلامی نظریہ کا حامل نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ ایک غیر اسلامی نظریہ ہے، اس لئے کہ توحید کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ عالم وجود میں

(غیب و شہادت میں، مادیت اور تجرد میں اور فطرت وماوراء فطرت میں) گزر رہا ہے۔
اسی مفہوم میں کہ وہ علمی قوانین کی پیداوار ہے ایک ایسی تخلیق بھی ہے جو مشیت الٰہی سے پھوٹی ہے، اور "جبر تاریخ اس بات کی مقتضی ہے" کے جملے کو اس طرح کام میں لیتے ہیں کہ: "مشیت الٰہی اس بات کا تقاضا کرتی ہے" جس قدر غیبی تخلیق میں خدا سامنے آتا ہے اسی قدر بھوکے کے ہاتھ میں گرم روٹی کے ٹکڑے سے خدا کا احساس ہوتا ہے۔

پھر کیوں ہم صرف ان چیزوں کو کہ جو جبر تاریخ، اقتصاد، منطق اور علمی قوانین سے ہٹی ہوئی ہیں خدا کی ملکیت سمجھیں اور صرف اس وقت جب کوئی مر جاتا ہے، کہیں کہ وہ خدا کی مملکت میں داخل ہوا ہے، بھلا موت سے پہلے وہ کس کے قلمرو قدرت میں تھا، مگر کیا خداوند عالم دنیا سے زیادہ آخرت میں ہوتا ہے؟ اور اسی انداز سے زمین میں آسمان سے کمتر، روح میں جسم سے بیشتر اور روٹی میں نماز سے کمتر ہوتا ہے؟

سچ بتاؤ، تم توحید کو کس طرح سمجھتے ہو؟

پس جب میں یہ کہتا ہوں کہ، پیغمبر اسلام عظیم بشری اور سماجی رسالت کے حامل ہیں تو وہی کچھ کہتا ہوں جو آپ کہہ رہے ہیں، یعنی رسالت، خداوند عالم کی طرف سے ان کو پیش ہوئی ہے۔

اور یہ بات کہ قرآن وہ حقیقت ہے کہ جو براہ راست وحی سے نازل ہوئی ہے یعنی یہ وہ حقیقت ہے کہ جو براہ راست سماجی ضرورت پر منطبق ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب بتدریج واقعیتوں، ضرورتوں، ظہور پذیر ہونے والی باتوں اور پیغمبر اسلام ﷺ کے معاشرے کی تبدیلیوں کے مطابق نازل ہوئی ہے۔

دائیں بازو اور بائیں بازو

ہم "دائیں بازو" اور "بائیں بازو" کے دو لفظوں کو نہ اردو کے مفہوم میں لیتے ہیں اور نہ اس مفہوم میں کہ جس میں عام طور پر روشن خیال لوگ استعمال کرتے ہیں بلکہ اس مفہوم سے استفادہ کرتے ہیں کہ جو فرانس کے عظیم انقلاب میں اس کا رہا ہے۔

فرانس کے قومی پارلیمنٹ میں دو نمائندہ جماعتوں کا وجود رہا ہے۔ ایک سرمایہ داروں، جاگیرداروں، اور وڈیروں کی منتخب جماعت تھی اور دوسری عوامی نمائندوں کی۔ اشراف اور حاکم طبقے کے نمائندے پارلیمینٹ میں داہنی جانب بیٹھتے تھے اور عوامی نمائندے بائیں جانب۔ پس دائیں بازو سے ہماری مراد حاکم طبقے کا نمائندہ اور بائیں بازو سے غریب عوام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ بایاں بازو ان اعمال و حرکات، ان کوششوں، ان اعتقادات، ان ادبیات اور اس آرٹ کا مجموعہ ہوتا ہے کہ جس کا تعلق عوام سے ہو اور بائیں بازو میں یہی چیزیں بہرہ مند طبقے کے لئے ہوتی ہیں کہ جو ہر دور میں ایک خاص طبقہ بن جاتا ہے، کبھی "بورژوا"، کبھی "فیوڈل" اور کبھی سرمایہ دار.........

توحید کا طبقاتی موقف

پیغمبر اسلام نے اعلان توحید اور ضدیت پرستی کے خلاف جنگ سے توحید کے اس طبقاتی موقف کو آشکار کیا کہ جو غریب عوام کا طبقاتی موقف تھا اور طائف کے صاحبان باغ، قریش کے صاحبان کاروان، اور عرب کے بردہ داروں نے سمجھ لیا کہ

"لا الہ"، یعنی تم، تمہارا دین اور تمہاری قدریں سب ہیچ ہیں، اور یہ وہ نعرہ ہے جو تمہارے خلاف، تمہارے بہرہ مند طبقے کے خلاف اور غریب عوام کی حمایت میں ہے، جناب رسالتمآب ﷺ اور حضرت علیؑ نے "لات" و "عزیٰ" پر جو پہلی ضرب لگائی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ ضرب براہ راست زراندوزوں بردہ داروں اور زمین کے خداؤں پر لگا رہے ہیں اور ان دونوں طبقوں نے بہت صاف توحید کے مفہوم کو سمجھ لیا (ہمارے برخلاف کہ ہم اسے صرف ایک فلسفی، میٹافزیکی، اور ذہنی مسئلہ سمجھتے ہیں) اشراف و سرمایہ دار طبقے نے خطرے کو بھانپتے ہوئے مزاحمت کی راہ اختیار کی جبکہ جاہلی اور اشرافی قدروں سے فاقد افراد نے اپنے نجات دہندہ کے نعرے کو سنا اور اس کی تہ تک پہنچ گئے۔

اس منزل پر میں اس بات کی بھی وضاحت کردوں کہ طبقاتی مزاحمت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس میں مخالف طبقہ کا ہر دولتمند اور موافق طبقے کا ہر غریب شامل ہو۔ اس لئے کہ بہت سے صاحبان ثروت ایسے ہیں کہ جو اجتماعی مزاحمت میں بائیں طبقے کا ساتھ دیتے ہیں اور بہت سے غریب وہ ہیں کہ جو دائیں بازو میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن اجتماعی طبقہ ایسا نہیں ہے اور فرد اور اجتماعی طبقہ کے درمیان فرق ہے)۔

پیغمبر اسلام، جس قدر اسلام کو انسانی، اخلاقی، اور اعتقادی قدروں میں پیش کرتے ہیں اسی قدر اپنی سماجی رسالت کو بھی اپنے زمانے کے اشرافی طبقہ (کارواں داروں، بردہ داروں، اور طائف کے باغ داروں) کے خلاف جنگ میں وسعت دیتے ہیں اور عوام کی انسانی شخصیت کو بھی ابھارتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ "بلال" جیسا حبشی

غلام، اسلامی تحریک میں ایک ایسا محبوب، شریف اور برجستہ شخصیت بن گیا کہ اشراف قریش بھی اپنے آپ کو اس کے سامنے حقیر سمجھنے لگے۔

یہ بات بتاتی ہے کہ طبقاتی اور سماجی جماعت کے اعتبار سے اس تحریک کا موقف اور تکیہ کدھر ہے اور اللہ کی مہربانی کی نگاہ، اس کا احسان اور اس کی نعمت کس طبقے کی طرف ہے۔

اس اعتبار سے اسلام کا پیغام (ایک الٰہی آئیڈیالوجی کے عنوان سے) محروم و محکوم طبقے کی نجات اور ان وضعی قوانین اور فنی اور اخلاقی قدروں سے جنگ ہے کہ جس کا تعلق حکمران طبقے سے ہے اور ایسا ہی ہوا کہ "لات" و "عزیٰ" کے گرنے اور اشرافی بتوں کے ٹوٹنے سے ان جاہلی اشعار کا بھی خاتمہ ہو گیا جو بد خوبصورت اور منفعت بخش ہنر اور اشراف کی تفریح کا سامان تھا اور ساتھ ہی اشرافیت کا سارا شان و شکوہ، ان کا جاہ و جلال و دبدبہ اور سارے آرائشات اور پہناوے ختم ہو گئے، اس کے بعد پھر کوئی اپنے اجداد کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکا اور فلاں خان اور فلاں خانوادہ کی مداحی میں نہ بیٹھ سکا اس لئے کہ "الحمد اللہ رب العالمین" ساری تعریف صرف اس اللہ کے لئے ہے کہ جو عالمین کا رب ہے۔

ایک ہاتھ میں "پیام" اور دوسرے میں اسلحہ

پیغمبر اسلام کی دو ذمہ داریاں تھیں: ایک پیغمبری، نبوت اور ابلاغ کی ذمہ داری جو دوسرے انبیاء کو بھی سونپی گئی تھی، آپ کو ایک پیام ملا تھا اور اس پیام کو لوگوں تک پہنچانا تھا اور آپ نے پہنچایا۔

اور دوسری ذمہ داری اس پیام کو عملی صورت میں لانا اور امامت، معاشرے کی رہبری اور انسانی معاشرے میں ایک مثالی امت کی تشکیل کے لئے کچھ لوگوں کی تربیت تھی۔ یہ وہ منزل ہے کہ جس میں سیاسی اور سماجی رہبری، ذمہ داری، ثابت قدمی، جنگ وجدل اور جہاد کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسالتمآب ﷺ کے ایک ہاتھ میں "پیام" اور دوسرے میں "شمشیر" تھی، ایک نمائندہ مکتب و نبوت اور دوسرا نمائندہ رسالت و رہبری، امامت۔

آئیڈیالوجی اور مکتب و پیام ۲۳ سال کے عرصے میں خاتمیت تک پہنچ سکتا ہے لیکن سماجی رسالت کا اختتام (بہ معنائے تعمیر امت اور ایک ایسے معاشرے کا قیام کہ جو طبقہ بندی، اشرافی پن، جاہلی آثار، اور قدیم انسان دشمن ثقافت سے پاک ہو اور نئے انقلابی قدروں اور مکتب کے اساس پر ایک تربیت یافتہ خود آگاہ نسل کا قیام) ایک یا دو نسل کے اندر ممکن نہیں۔

اسی لئے جناب رسالتمآب ﷺ صرف "خاتم النبین" ہیں اور "الیوم اکملت لکم دینکم" کی منزل میں ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی ہے لیکن سماجی تعمیر کی ذمہ داری، نسل سازی، مثالی بننے کا عمل، اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جو اشرافیت اور طبقاتیت کے خلاف ہو اور جس میں بیدار، آگاہ مسئول، ثابت قدم اور انسانی رائے سے آگاہی رکھنے والے افراد ہوں، ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور اسے ایک دائمی انقلابی رہبری کے ساتھ خاتمیت تک پہنچنا ہے۔

پس (پیغام رسانی اور انقلابی رہبر کے عنوان سے) پیغمبر اسلام کی پہلی ذمہ داری

اختتام کو پہنچا ہے اور اس پر خاتمیت کی مہر لگ گئی ہے، لیکن (معاشرے کی رہبری اور امت کی تعمیر سے متعلق) دوسری ذمہ داری نسل در نسل جاری رہے گی اور تکامل کی منزل تک پہنچے گی اور اس کے بعد خاتمیت کے پیامبر اور رہبران وصی کے آخری رہبر، نظام وصایت وامامت میں، خاتم امامت ہو جائیں گے۔ یعنی پیغمبر کی سماجی عمارت کے تکمیل کنندہ یا ختم کنندہ ہو جائیں گے۔ جناب رسالتمآب کے بعد ان کا عقیدہ باقی رہا لیکن ان کی اجتماعی رسالت نہیں۔ اصحاب رسول ﷺ سے تعلق رکھنے والے لوگوں تک نے اسلام کو ایک الٰہی اور دینی آئیڈیالوجی کے عنوان سے قبول کیا لیکن طبقاتی سوچ کے خلاف جدوجہد اور رسالتمآب ﷺ کی خاص سماجی رسالت کا گلا گھونٹ دیا۔

"سقیفہ" میں اسلام ایک دینی تحریک کے عنوان سے باقی رہا، لیکن ایک سماجی رسالت کے عنوان سے اسے شکست ہوئی۔

"سقیفہ" میں عرب کے طبقاتی معاشرے کے نظریے نے اسلامی انقلاب اور رسالت کے اس نظریہ پر کامیابی حاصل کی جو طبقات کی مخالف تھی۔

"سقیفہ" میں وہ انقلابی قدریں جو ابوذر، بلال، اور میثم صفت لوگوں کے چہروں کے گرد گھوم رہی تھیں ڈھل گئیں اور وہ قدریں باقی رہیں جو جاہلی اشراف کے چہروں کے گرد محو گردش تھیں۔

لہٰذا پیغمبر اسلام کے بعد سماج کے بائیں بازو کو کہ جس کے مظہر و محور علی تھے (وہ علی کہ جو تجسم روح ضد اشرافی اور رسالت اسلام میں طبقاتی سوچ کے مخالف تھے) شکست ہوئی۔ اور اصحاب کبار کو (ان معتقد مسلمانوں کے مفہوم میں کہ جواز روئے ایمان معتقد بہ مکتب، لیکن طبقاتی رجحانات کے اعتبار سے جاہلی معاشرے کی طرح

دائیں بازو کی طرف متمایل تھے) کامیابی ہوئی۔

پس جناب رسالتمآب ﷺ کے بعد اسلام، عوام اور حاکم، اور انقلاب فرانس کے مفہوم میں دائیں بازو اور بائیں بازو، اور عدالت و حاکمیت کے دو دھڑوں میں بٹ گیا۔ یہ انشعاب اور یہ دائیں بازو اور بائیں بازو کا رجحان طول تاریخ میں گہرا ہوتا گیا اور ایک ایسا اسلام رونما ہوا جو حاکم طبقہ (حتیٰ کہ اسلوب سیاست) کی توجیہ کا سامان بنا۔ (حاکم طبقہ سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو معاشرے میں عام لوگوں سے بہ لحاظ دولت اور بہ اعتبار مادی وسائل و اختیارات بلند و بلند تر ہیں اور دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگر سیاست میں حصہ نہ لیں تب بھی حاکم طبقہ کہلاتے ہیں اور وہ گروہ کہ جو سیاسی ہے اور اس طبقہ کی حمایت کرتی ہے اسے "حکمران طبقہ" کہتے ہیں) اور اس نے ایک حکومتی آئیڈیالوجی کی صورت اختیار کی اور خلافت و سلطنت کی قوتوں میں سما گیا اور "تسنن" کہلایا اور دوسرے (علیؑ والے) اسلام نے عقل و ہوش، قوت و توانائی اور عزم و ارادے کی ناقابل تسخیر حقیقت بن کر طبقاتی نظام کے خلاف موقف اختیار کیا اور ایک نجات بخش اور امید دہندہ ایمان کے عنوان سے استحصال کی زنجیر میں بندھے ہوئے محروم طبقوں اور ان لوگوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا کہ جن کی، حکومتی اسلام (اموی تسنن اور طبقاتی اسلام) تحقیر کرتا تھا اور وہ محروم رہ جاتے تھے۔ ۲۱۳

پس ایک دقیق منطقی قانون کے مطابق، جس قدر تسنن نے، حاکم طبقے کی دینی محاذ آرائی میں حصہ لیا، اور حاکم طبقہ کی توجیہ کنندہ اور عوام کے خلاف حکام کا آلہ کار بنی، اسی قدر تشیع ان عرب اور غیر عرب لوگوں کے درمیان ابھری اور پھلتی پھولتی گئی کہ جن کا تعلق غریب اور محروم عوام سے تھا اور سرکاری اسلام ان کو ان کے انسانی حقوق دینے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔

حضرت عمر کی حکومت میں ہم پہلی بار اس طبقاتی طلیعہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ کہ جو میرے عقیدے کے مطابق مسلمان ہے لیکن اسلام سے پہلے کے سماجی نظریہ کا حامل ہے کہتا ہے:

اے اہل اسلام! عجمیوں کی ایک وافر تعداد غلام کی صورت میں تمہارے اختیار میں ہے لہذا شرافتِ عرب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے عرب غلاموں کو آزاد کردو۔

اور مدتوں بعد علیؑ کی حکومت میں ایک ایرانی عورت کا عرب خاتون سے جھگڑا ہوتا ہے اور علیؑ ایرانی عورت کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں، اور عرب خاتون جو حضرت عثمان کے دور سے گزر کر آئی ہے کہتی ہے:

تم نے میرے اور ایک عجمی عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا؟

علیؑ اس کے جواب میں دو مٹھی، مٹی اٹھا کر اس عرب عورت کے سامنے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں:

ان دو مٹھی خاک کے درمیان کیا فرق ہے؟

ان دونوں رہبروں کے موقف اور ان کے نظریوں کو ملاحظہ فرمایئے،

ان میں ایک (حضرت عمر) مکمل طبقاتی سوچ سے بول رہے ہیں اور دوسرے (علیؑ) طبقات کی ضد پر، ایک کا انداز فکر اسلام سے قبل کا ہے، اور دوسرے کا عین اسلامی، ایک مظہر تسنن ہے اور ایک مظہر تشیع۔

ہم اس طبقاتی موقف کو صرف پیغمبر اسلام کے بعد نہیں بلکہ ان کی زندگی اور صدر اسلام میں ملاحظہ کرتے ہیں اور تشیع کو ایک ایسا مذہب پاتے ہیں کہ جس کا مصمم،

روشن اور طبقاتی اونچ نیچ سے متنفر چہرہ پیغمبر ﷺ کے زمانے میں بھی جگمگاتا رہا ہے۔

جنگ بدر میں (کہ جس کی کمانڈ خود جناب رسالتمآب ﷺ کے ہاتھ میں تھی) "بلال" اور "عبدالرحمن بن عوف" کے درمیان جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ بلال کہتے ہیں کہ "امیہ بن خلف" (کہ جس کا شمار اونچی سطح کے اشراف مکہ میں ہوتا تھا) کفر و پلیدی میں سرفہرست ہے اور اس کا قتل ضروری ہے۔ لیکن "عبدالرحمن بن عوف" (باوجود اس کے کہ مہاجر ہے) طبقاتی اعتبار سے "امیہ بن خلف" سے (مشرک ہونے کے باوجود) وابستہ ہے اور اس کی حمایت کرتا ہے، اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ "امیہ بن خلف" ایک محترم، باعزت اور نامور شخصیت ہے! اور ان لوگوں میں سے ہے کہ جس نے ایک عمر مکہ میں آقائی کی زندگی بسر کی ہے، اور خاص طور پر بلال اس کے غلام رہے ہیں اور انہوں نے اس کے تشدد اور سختیوں کو دیکھا ہے۔

یہ طبقاتی پیوستگی ہے اور ایمانی اور اعتقادی پیوستگی سے اس کی طاقت زیادہ ہے اور اس کی روشن دلیل جناب رسالتمآب ﷺ کا چچا (ابولہب) ہے کہ جو بنی ہاشم کے خلاف بنی امیہ کی صف میں آتا ہے اور بنی امیہ کے عام آدمی گھیرے میں آجاتے ہیں اور مسلمانوں کے ہمراہ شعب ابی طالب میں مقید ہو جاتے ہیں۔

عبدالرحمن کی ساری فکر...... "امیہ بن خلف" کو بچانے میں ہے اور "بلال" کی اس کو مارنے میں۔ عبدالرحمن نے "امیہ بن خلف" اور اس کے لڑکے "علی بن امیہ" کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے یہ دونوں میری قیدی ہیں، اور "بلال" ان دونوں کے دوسرے ہاتھ کو پکڑ کر کہہ رہے ہیں انہیں قتل ہونا چاہئے۔ وہ اس مسئلہ میں اس قدر

اڑ جاتے ہیں کہ بالآخر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔

"بلال" وہ شیعہ ہیں کہ جن کا طبقاتی موقف معلوم ہے اور وہ امیہ سے در گزر نہیں کر سکتے۔ اور "عبدالرحمن" وہ غیر شیعہ ہے جو اپنے طبقے کی (ہر چند کہ وہ اس کا ہم عقیدہ نہ ہو) حمایت کرتا ہے۔ حالانکہ جناب رسالتمآب ﷺ اس واقعے سے پہلے، قبل اس کے کہ بدر کی لڑائی شروع ہو یہ حکم جاری کرتے ہیں کہ "مکہ کے غریب عوام سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے، صرف ان لوگوں پر حملہ کرو جو سرغنے اور جگر گوشگان ہیں۔ اور اشراف قریش پر ہاتھ ڈالو"۔

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ بلال کا طبقاتی موقف روشن ہے اور وہ اپنے انقلابی اور طبقات ناپسند پیغمبر کی پیروی میں اموی لوگوں کی اشرافیت پر دل جلا نہیں سکتے۔

اور پھر ہم "بلال" کو مدینہ میں حضرت عثمان کے ساتھ دیکھتے ہیں یہ وہ وقت ہے جب ان دونوں کا شمار صحابیوں میں ہوتا ہے اور ابھی "شورا" "وصایت" اور بعد کے اختلافات رونما نہیں ہوئے ہیں اور پیغمبر ﷺ موجود ہیں لیکن تشیع اس مفہوم میں جس کو میں پیش کر رہا ہوں اپنے آپ کو اجاگر کر رہی ہے۔ مدینہ امپریالسٹوں، صہیونیوں، یہودیوں اور عرب اشرافیت کے گھیرے میں ہے اور مسلمان مدینہ کے گرد خندق کھود رہے ہیں۔ خود رسالتمآب ﷺ سمبولیک اور اعزازی صورت میں نہیں بلکہ حقیقی طور پر دامن میں پتھر بھر بھر کر باہر پھینک رہے ہیں اور ساتھ میں ان لوگوں کی مدد بھی کر رہے ہیں کہ جو بیمار یا ضعیف ہیں۔ ایک ایسی صورتحال میں حضرت عثمان جنہوں نے گویا بیلچے، کدال، اور خندق کھودنے کے سامان کی خریداری کے لئے روپیہ خرچ کیا ہے اپنی شخصیت کو اس سے برتر سمجھتے ہیں کہ پتھر ڈھوئیں اور

مزدوروں والا کام کریں، اپنی عصا پر ٹیک لگائے محنت کشوں یا مزدوروں کو (جن میں خود جناب رسالتمآب ﷺ بھی شامل ہیں) ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں! اس منظر کو دیکھ کر عمار سے رہا نہیں جاتا اور وہ ایک شعر پڑھتے ہیں:

راہ خدا میں مٹی کھانے والوں اور ان لوگوں میں کتنا فرق ہے جو عصا سے ٹیک لگائے کھڑے ہیں؟!

اور پھر یہ شعر ایک سے دوسرے تک پہنچتا ہے اور سب ایک شعار کے طور پر اسے گنگناتے ہیں۔ سلمانؓ پڑھ کر علیؑ کو سناتے ہیں، علیؑ صہیب کو، صہیب "بلال" کو اور بلال کسی اور شیعہ کو، اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔

بہت صاف ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے زمانے ہی سے اسلام میں دو گروہ اور دو بازو ہیں اور دونوں ہی مسلمان، لیکن ان کا طبقاتی موقف مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم کہیں کہ "حضرت عثمان" ...... مثلاً ...... خلافت یا خلیفہ ہونے کے لئے مسلمان ہوئے تو یہ ایک بے اطلاع دلیل ہے۔ وہ مسلمان تھے اور مسلمان ہوئے لیکن صرف اعتقادی نقطہ نظر سے طبقاتی موقف کو تبدیل کئے بغیر۔

بہر صورت خلفائے راشدین کے دور میں دائیں بازو کی طرف رجحان خفیف ہے۔ حضرت ابوبکر دائیں جانب مڑتے ہیں، حضرت عمر ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور جب حضرت عثمان کی باری آتی ہے تو خلافت اچھل کر دائیں بازو کو جاتی ہے اور "بنی امیہ" کی گود میں اتر آتی ہے۔

"بنی امیہ" کی کامیابی اور "علیؑ" کی شکست، سماجی نقطہ نظر سے صحیح معنی میں اسلام کی تاریخی سرنوشت کا تعین ہے۔

بنی امیہ نہفتہ رموز کے ایک مجموعے، تمام جاہلی اشرافیت کی قدروں کے مظہر اور تاریخ کے دھارے پر دائیں بازو کے حاکم طبقے کے عنوان سے کامیاب ہوتے ہیں اور تحریک کی لیڈر شپ کو باضابطہ طور پر ہاتھ میں لیتے ہیں اور انقلاب دشمن عناصر (انقلاب سے پہلے کے عناصر) انقلابی بن کر علی کے خلاف جنگ میں (اس آخری شخص کے عنوان سے کہ جو باضابطہ طور پر اس گروہ سے لڑتا ہے اور اس کی جنگ اس لڑائی کے سلسلے سے متصل ہے کہ جسے رسول خدا نے خندق، بدر، اور مکہ میں بنی امیہ کے خلاف لڑی تھی) کامیاب ہو جاتے ہیں۔ "بنی امیہ" کی عملداری سے دائیں بازو کو مکمل حکومت مل جاتی ہے اور تمام انقلابی قدریں اور انقلابی رجحانات برباد ہو جاتے ہیں۔

شیعہ، بنی امیہ کی کامیابی کے بعد

"بنی امیہ" کی کامیابی کے بعد، شیعہ زیر زمین جنگ کا آغاز کرتے ہیں۔ اور یہ جنگ امام حسن علیہ السلام (آخری قانونی خلیفہ جنہیں حکومت اور ساری امت کی رہبری کی باگ سنبھالنے میں کامیابی نہیں ہوئی) سے شروع ہوتی ہے۔

یہاں سے اسلامی انقلاب کی حقیقی قدروں پر مکمل طور پر حاکم طبقے کے ساتھ (سماجی نقطہ نظر سے) محکوم طبقے کی جنگ شروع ہوتی ہے۔

مشکل مسئلہ یہ ہے کہ یہ حاکم طبقہ جناب رسالتمآب ﷺ کے زمانے میں اپنی تمام اشرافی قدروں کے ساتھ، عریاں، میدان میں آیا تھا اور اب بعد پیغمبر ﷺ انقلاب کا لبادہ اوڑھ کر آیا ہے۔ اور یہ تمام انقلابوں کی سرنوشت ہے کہ وہ بڑی آسانی

سے بیرونی محاذ میں کامیاب ہو جاتے ہیں (اس لئے کہ دوست اور دشمن کی صفیں آشکار ہوتی ہیں) مگر داخلی محاذ میں انہیں شکست ہوتی ہے۔

بعد رسالتمآب ﷺ دھتکاری ہوئی اشرافیت، پھر سے لوٹ آئی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب وہ اپنی جاہلی قدروں کو قرآن، سنت اور اسلامی شعائر کے نام سے توجیہ کرتی ہے اور اب یہ اشرافیت "بتوں" کے گرد نہیں، کعبہ کے گرد گھومتی ہے، اور میدان میں "لات" و "عزیٰ" کو لانے کے بجائے، قرآن کو نیزوں پر چڑھاتی ہے اور اپنے حق میں "اساطیر الاولین" سے نہیں بلکہ وحی و توحید و کعبہ اور روزہ و نماز و مسجد سے گفتگو کرتی ہے۔

قرآن، سنت، توحید، کعبہ، ماہ رمضان، جماعت کی نماز، امام اور امام جماعت اور وہ تمام احکام و عقائد و حقائق کہ جن کو (بلال صفت اور ابوذر صفت) محکوم طبقہ تمام خواہشوں، انسانی قدروں اور آرزوؤں کا محور اور پناہ گاہ سمجھتا تھا اور ان ہی سے تقویت حاصل کرتا تھا اور اشرافیت کے خلاف جہاد میں یہی اس کا اسلحہ تھا اب غیر مسلح ہو گیا تھا اور یہ سب دشمن کے ہاتھ لگ گئے تھے اور محروم طبقہ خالی ہاتھ کے ساتھ ان دشمنوں کے سامنے آگیا تھا کہ جن کے ہاتھوں میں دوستوں کا ہتھیار تھا۔ نوبت یہاں تک آتی ہے کہ (محروم طبقے کے مظہر اور طبقات کے خلاف جنگ لڑنے والے) علیؑ، اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ محراب مسجد کے اندر اپنے خون میں لوٹتے ہیں، اور حسینؑ ایک اسلامی دینی فتوے کے ساتھ شہید ہو جاتے ہیں اور جاہلیت کے تمام ورثاء، اسلام کے عظیم فاتحین کے عنوان سے (تاریخ اور سرزمین عالم میں) متعارف ہوتے ہیں، جہاں گیری کرتے ہیں اور قوموں کو گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں لاتے ہیں، مگر

اس اسلام کے دائرے میں جواب اسلام نہیں رہابلکہ ایک ایسی جاہلیت ہے جسے اسلام سے ڈھانک دیا گیا ہے، اور جو اسلام دشمن ہے اور جس نے انقلاب میں کامیابی حاصل کی ہے۔

شیعہ کون ہے؟

شیعہ، وہی مظلوم ایرانی، رومی، اور عرب ہیں کہ جنہوں نے عدالت، نسلی اور طبقاتی امتیازات کی نفی اور صحیح انسانی رہبری کو پانے کے لئے اسلام کے دامن میں پناہ لی ہے مگر اب وہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام تو وہی ہے اور نعرے بھی وہی ہیں لیکن اس کی عنان ان قیصروں، ان زرتشتی پیشواؤں اور ان پادریوں اور پوپوں کے ہاتھ میں ہے کہ جنہوں نے اپنا نام بدل دیا ہے۔

اب یہ اسلام کی پناہ میں آنے والے، مسلمان ہیں اور قرآن کو اپنی وحی کی کتاب سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کی قرأت پہ تکیہ کریں (جس طرح کہ ابوسفیان اور ابوجہل، لات وعزیٰ پر تکیہ کرتے تھے اور قرآن پر تلوار پھیرتے تھے) لیکن وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کا قرآن (ان کی پناہ گاہ اور ان کا مرجع) ابوسفیانوں اور ابوجہلوں کے ہاتھ میں ہے اور یہی لوگ اسے کثرت سے چھاپ کر تقسیم کر رہے ہیں اور یہ وہ ہاتھ اور وہ انگلیاں ہیں کہ جو علیؑ اور حق مانگنے والوں، غلاموں، محروموں اور عجمیوں کے خون سے رنگین ہیں۔

اور وہی آدمی کہ جس نے اپنے محل کے نیچے واقع زندانوں میں، شیعہ ائمہ اور ذریت رسول ﷺ کو پابہ زنجیر کیا ہے اب مکہ جاتا ہے تاکہ حج کے مراسم کو زیادہ

عظمت اور زیادہ شان و شوکت کے ساتھ برپا کرے۔ یہ جہاد کرنے والا سورما خلیفہ وہی ہے کہ جو علوی سادات کا قتل عام کرتا ہے اور ان لوگوں کو مٹانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ جن کے دل میں علی کی محبت کی ہلکی سی نشانی بھی باقی ہو۔ یہ وہی ہے کہ جس نے کافرستان کو مسلمانستان اور کنشت وکلیسا کو مسجد بنایا ہے۔

اب یہ محروم لوگوں کی جماعت چاہتی ہے کہ آواز بلند کرے، چیخے، چلائے کہ یہ سب جھوٹ ہے، یہ اسلام نہیں ہے، یہ لوگ مسلمان نہیں ہوسکتے لیکن کس طرح فریاد کرے۔ کس کے لئے، کن کے لئے اور کہاں بولے؟ جب سارے ابلاغ کے ذرائع حکومت کے ہاتھ میں ہوں، ساری مسجدیں، خلیفہ کی تبلیغات کے اڈے ہوں، سارے منبر ان کی مسند ہوں، سارے ائمہ جماعت ان کے نمائندے ہوں اور سارے شعراء خلیفہ کے ٹرانزسٹر ریڈیو ہوں تو پھر بولنے کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔

وہ چاہتے ہیں کہ چیخ، چیخ کر دنیا کو بتائیں کہ یہ سب کے سب ہمارے رہبروں کے قاتل ہیں۔ انہوں نے حروں کو، ابوذروں کو اور عماروں کو چن چن کر مارا ہے۔ کربلا، توابین اور مسلمان قوموں کا قتل عام ان کے ہاتھوں سے ہوا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے جزیہ لینے کے لئے قوموں کے اسلام کا انکار کیا ہے تاکہ اپنی حرص وہوس کے لمبے تھیلوں کو اوپر تک بھر لیں۔

یہ سب باتیں وہ کہنا چاہتے ہیں اور دنیا کے لوگوں میں اس کا اعلان کرنا چاہتے ہیں، مگر کس طرح؟ کس ذریعے سے؟ اس زمانے کے تبلیغی اور اجتماعی ارتباط کے وسائل شعراء اور خطباء ہوا کرتے تھے لیکن وہ بھی دربار خلافت سے وابستہ تھے یا ان سلاطین سے ان کا رابطہ تھا جو خلافت سے وابستہ تھے۔ پس یہ تشدد اور کوڑوں کے

عذاب سے گزرنے والے کریں تو کیا کریں۔ وہ اسلام سے پہلے علاقائی حکومتوں کے جور میں جکڑے ہوئے تھے اور اب وہی حکومتیں خلافت بغداد کی عظیم طاقت بن کر انہیں نوچ رہی تھیں۔ اب پھر سے ساسانی اور ہخامنشی واپس لوٹ آئے ہیں اور انہوں نے سلطنت کی بساط بچھائی ہے لیکن غزنویوں، سلجوقیوں، اور مغلوں کے نام سے اور عربی خلافت کی رژیم بھی اس میں شامل ہو گئی ہے اور ان سب کا نام اسلام، قرآن اور سنت ہو گیا ہے۔ محمود جیسے جلاد غازی کی، ۴۵ ہزار شاعر شب و روز مدح کر رہے ہیں اور ایک بت شکن اور پارسیوں اور سومنات و کفر کو مٹانے والے کے عنوان سے اس کے قصیدے، پڑھ رہے ہیں اور اسے پیغمبروں کے زمرے میں لا رہے ہیں۔ ہر شے حکومت کے ساتھ ہے اور خلافت کی طاقت کے آگے سب کی پیشانی خم ہے۔ سارے شعائر اور مذہبی مراسم حکومت کی مجرمانہ کارروائیوں کو چھپانے، نظام بردگی کی توجیہ، طبقاتی استحصال، اور سیٹھوں، چودھریوں اور پایتخت کے خاقان کی تقدیس کے لئے کوشاں ہیں! مجاہد کے چہرے میں جلاد کا تعارف!

پس شیعہ کدھر کا رخ کرے؟

صحرائے کربلا کی طرف گریز

عرفات میں، پر شکوہ ترین اور ہیجان انگیز ترین مراسم کے آغاز میں شیعہ "سنگ" کو چھوڑ کر کربلا کا رخ کرتا ہے اور طواف "سنگ" سے طواف عشق کو جاتا ہے اور جو کچھ اس نے حج میں انجام دیا ہے کربلا کے پرتو میں اسے بے رنگ دیکھتا ہے اور جائے مشعر و منیٰ ...... اور بعد از عرفات کے مراسم پر سوچنے کے کربلا اور عاشورہ کے

بارے میں سوچتا ہے، اور کہتا ہے ہم "سنگ کو چھوڑ کر طواف عشق میں آگئے ہیں اس لئے کہ یہ جگہ ایک گوسفند کی قربان گاہ ہے اور وہ جگہ ایک فرزند کی۔ یہاں اسماعیل قربان ہوا اور وہاں تمہارا اسماعیل زیر تیغ آیا۔ یہاں گفتگو سنگ کی ہے اور وہاں آگ اور خون کی...... (۱)

آخر کیوں شیعہ کربلا کو بڑھا کر حج کے مرتبے کو کم کرتا ہے اور اوج مراسم حج میں کربلا اور عاشورہ کی گفتگو کرتا ہے۔

آخر کیوں وہ اس الزام کو اپنے لئے پسند کرتا ہے کہ:

"شیعہ اسلامی روایات کے معتقد نہیں ہیں اور اپنے فرقے کے اعتقادات کے زیر سایہ اسلامی روایات کی تحقیر کرتے ہیں"۔

آخر کیوں شیعہ جب حج سے واپس لوٹتا ہے تو اس کا موضوع خریداری، بازار اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ ہوتا ہے اور جب کربلا سے لوٹتا ہے تو اس کی گفتگو زیارت اور وہ احساسات ہوتے ہیں جو اس کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں"۔

جب امام حسینؑ نے شہادت اختیار کی تا کہ یہ اصول اپنے مفہوم کو باقی رکھے، اور وہ خود اس بات کے لئے تیار نہیں کہ ان کا مقبرہ، کعبہ کی جگہ لے اور وہ، ان کے والدین، اور بھائی بہن سبھی اسی عرفات میں آتے رہے ہیں اور خدا کے حضور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ روتے رہے ہیں اور یہاں آکر ان مراسم کو اہمیت دی ہے، پھر

۱۔ اس شعر کے مفہوم کی نقل جسے میرے محبوب و عزیز دوست جناب "حسین صبح دل" نے عرفات میں پڑھا اور میں نے وہاں اس کی تاریخی بنیاد پر غور کے بغیر اس پر سخت اعتراض کیا!

کیوں حسینؑ کے شیعہ کربلا کا رخ کرتے ہیں اور ان کی اور ان کے مدفن کی عظمت بڑھا کر یہاں کی تحقیر کرتے ہیں؟

ان سوالات کے جوابات اس وقت آپ کو ملیں گے جب آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ کس طرح خلیفہ اس سال "حج" میں ہے اور اس سے قبل کے سال میں "جہاد" میں اور بعد کے سال میں کسی اور کام میں! اور کس طرح حج کی تجلیل و تعظیم کے درپے ہے اور کس طرح اس کی شان و شوکت کو بڑھانے میں اس کا اصرار ہے! اس لئے کہ یہ بات اس کی حکومت اور اس کی طاقت کے فائدے میں ہے۔

سادہ اور بھولے بھالے لوگ جو حج کو آتے ہیں اور لوگوں کی اس کثیر جمعیت اور حج کے جاہ و جلال کو دیکھتے ہیں تو ان کی توجہ اس بات کی طرف جاتی ہے کہ ان کے والدین اور دادا پردادا کے زمانے میں یہ حج کتنی بے رونق ہوا کرتی تھی اور کتنی سادگی سے یہ مراسم انجام پاتے تھے لیکن اب خلیفہ کے جہاد اور نئی سرزمینوں کے تصرف میں اس کی کوششوں نے حج کو کتنا شاندار بنا دیا ہے۔

اور پروپیگنڈے کے اس دھوم میں کوئی نہیں سمجھ سکے گا کہ انہوں نے کس طرح رسول خدا کے گھر کو اجاڑا ہے اور کس طرح تمام داد خواہوں اور نیک لوگوں کا قتل عام کیا ہے۔ کوئی نہیں سمجھے گا کہ اس خلیفہ کا ہاتھ کتنے پاکیزہ لوگوں کے لہو سے آلودہ ہے اور پھر کس طرح وہ حج و جہاد کی اس شان و شوکت سے اپنے فائدے میں (اور اپنی تیغ کو تمام لوگوں، تمام محروم طبقوں اور عام انسانوں کی جان کے لئے تیز تر کرنے کے حق میں) استفادہ کر رہا ہے۔

شیعہ کے لئے (ایسے حالات میں جب وہ اپنے مذہبی رہبروں کو شہید یا خلیفہ

کے طوق و سلاسل کا اسیر دیکھتا ہے) تجلیل حج ایک ایسا عمل ہے جو براہ راست خلیفہ کے فائدے میں جاتا ہے، اور وہ کہ جو خانوادہ رسالت کا چاہنے والا اور دوستدار حج ہے ایک ایسے حج کی تجلیل نہیں کر سکتا کہ جو دشمن کی تائید کی ایک علامت ہو گئی ہو۔

شیعہ جب دیکھتا ہے کہ خلیفہ حج کی اتنی تعظیم کر رہا ہے، لیکن اگر اسے خبر مل جائے کہ کسی نے اپنی گزرگاہ میں کسی شیعہ کی قبر کے کنارے کچھ زیادہ توقف کیا ہے تو وہ اسے تشدد کے عذاب سے گزار کر مار دیتا ہے، تو یہ بات اس کے سامنے آتی ہے کہ تعظیم حج خلیفہ کے اسلام میں حکمران طبقہ کا سمبل ہے اور یہ سمبل حج نہیں (کہ جس کی خلیفہ تجلیل کرتا ہے) بلکہ "قبر" ہے، شہید کی وہ قبر کہ جس نے خلیفہ کو اتنا خوف زدہ کر دیا ہے۔

اس مقام پر عرض کروں کہ انسان کو سبق سکھانے والی اور ہدایت دینے والی سب سے بڑی شے (اس انسان کی کہ جس کے پاس صبر ہے اور جو جہاد کو سمجھتا ہے) ایک "رنج" ہے اور ایک "دشمن"۔ دشمن، سخت مزاحمت کا عامل ہے اس لئے کہ ہر فکر جس قدر دشمن کو تکلیف میں مبتلا کرتی ہے اور نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کے لئے اس دن کا سبق ہوتا ہے اور ہر وہ حق کہ جو دشمن کی زبان سے نکلتا ہے، پھر حق نہیں رہتا۔

شیعہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ: کعبہ اور اس کا طواف، اعلیٰ اختیارات کی حامل خلافت کا عظیم تبلیغاتی مرکز ہو گیا ہے (وہ خلافت کہ جو اب مظہر ظلم و جور ہے) اور ہر سال افریقہ اور ایشیا کے گوشہ و کنارے (حتیٰ کہ یورپ تک سے) لوگوں کو یہاں کھینچ لاتا ہے، تاکہ تمام مدح خواں لوگ، تمام خطباء، تمام مسجدوں کے امام، اور تمام مسئلہ گو حضرات خلیفہ کے دعاگو بن جائیں اور جلاد خلیفہ کے مناقب و کرامات کو

لوگوں کی سماعت تک پہنچائیں، اور مسجد الحرام میں (کعبے کے کنارے) شرک اور باطل کے بڑے مجسموں کو تقویٰ و جہاد کے عظیم مجسموں کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

پس یہ مراسم، اور روایات و علامات، خارج از معنی ہیں بلکہ مکمل طور پر اسلام اور حق طلب لوگوں اور عوام الناس کی عدالت و آگاہی کے خلاف ہیں۔

"کربلا" یا "کعبہ"

پس اب جبکہ "حج" دشمن کی شناخت کا نشان یا سمبل ہو گیا ہو تو پھر کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ جہت واضح ہے، طواف خاک حسینؑ حقیقی کعبہ کا طواف ہے، شہید کا کعبہ، خون کا کعبہ، اس کا کعبہ کہ جو اسی سبز پوش جلاد کا قتیل ہے، یہی وجہ ہے کہ (تاریخ میں) شیعہ اپنے کعبے کی لگن میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور راستے کے خطرات کی پرواہ کئے بغیر ایران سے کربلا تک، پیادہ پا جاتا ہے اور جب حسینؑ کی تربت تک پہنچتا ہے تو اللہ اور رسول اللہ کے خلیفہ کے کارندے اسے عقوبت خانوں میں پہنچا دیتے ہیں اور کوڑے اور تشدد اس کی جان لے لیتے ہیں۔

یہی وہ منزل ہے کہ جہاں (تاریخ میں) حج کی زیارت اور خدا کا عزم، کعبہ جانے میں نہیں، حسینؑ کی سمت جانے میں ہے۔ اس لئے کہ خاک اپنا مفہوم بدل لیتی ہے اور شفاعت دوسرے اثر و مفہوم میں آجاتی ہے۔

حسینؑ کی زیارت ایک عظیم ترین جہاد ہو جاتی ہے، اس لئے کہ سخت ترین دشمن اسی سے ڈرتا ہے ورنہ کیوں وہ حسینؑ کی قبر اطہر کو ڈھانے اور اس کے آثار کو ختم کرنے

کے لئے اتنی جتن کرتا ہے، روضہ اقدس کی سمت دریا کے پانی کا رخ پھیر دیتا ہے کہ سیلاب اسے بہالے جائے۔ قبروں کو ویران کرتا ہے۔ حسینؑ کے زائرین کا قتل عام کرتا ہے اور جب عام پولیس سے بات نہیں بنتی تو اپنی مخفی پولیس کو چوروں اور ڈاکوؤں کی صورت میں زائرین پر چھوڑ دیتا ہے اور ان کا خاتمہ کرا دیتا ہے؟

کیا اس سے یہ بات سامنے نہیں آتی کہ حکومت کو خوف لاحق ہے اور وہ اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ اس فکر کو مٹادے اور اس واقعے کا بار بار ذکر نہ ہو تا کہ یہ فراموشی کا شکار ہو جائے؟

اس خاک کی زیارت ہی ہے کہ جو لوگوں کو اس بات کی طرف راغب کرتی ہے کہ وہ حسین کے انقلاب اور ظلم کے خلاف ان کے جہاد اور ان کی جنگ کے بارے میں سوچیں اور ظالم حکومت کو رسوا کرنے کی ٹھانیں۔

یہی وہ منزل ہے کہ جب یہ خاک (خاک کربلا) سمبل یا شعار بن جاتی ہے اور (تاریخ میں) امام حسینؑ کی آرام گاہ کا طواف، کعبے کے سو طوافوں کے مقابل آجاتا ہے بلکہ ان پر ارجحیت پاتا ہے۔

(یہاں ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ یہ عام سطح کے لوگوں کی رسم تھی کہ وہ کربلا کو جاتے تھے اور میں جانتا ہوں مگر میں اس مذہب کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں جو ہر کس و ناکس کے قلب و ذہن میں جاری ہے اور مجھے ان حقائق سے سروکار ہے کہ جن کا ذکر عام سادہ ترین محافل میں بھی ہوتا ہے)

وہیں (عرفات میں) مجھ پر یہ بات کھلی کہ ان لوگوں کی طرح میں کیوں اپنے رخ کو کعبہ سے کربلا کی طرف نہیں پھیر سکتا، اسماعیل اور ابراہیم کی سنت کی تحقیر

نہیں کر سکتا، طواف، سعی اور ان جیسی رسومات کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور "حج" کے موقع پر کربلا نہیں جا سکتا؟

مگر ان دنوں جب مکہ، عرفات اور کعبہ حاکم طبقے اور جلاد صفت انسانوں کے عظیم ترین تبلیغاتی ذرائع ہو گئے تھے کربلا کی طرف گریز ایک فطری امر تھا۔ اس وقت کے شیعوں کا کربلا کی طرف رجحان اور ان مراسم سے ان کی روگردانی کہ جن کے پیشاپیش خلیفہ (یا خلیفہ کا نمائندہ) ایستادہ ہے، کس مفہوم میں رہی ہے؟ یہ عمل کس بات کی طرف اشارہ ہے؟ یہ اعتراض اور ڈمانسٹریشن کا کتنا جدید اور انقلابی انداز ہے؟

وہ ایک لاکھ، دو لاکھ، پانچ لاکھ افراد کہ جو خلافت سے وابستہ دینی تبلیغاتی اداروں کے ذریعے استحمار (استحصال کی ایک قسم) کی زد میں آئے انہوں نے حج بھی کیا، احرام بھی باندھا، سارے مسلمانوں والے کام بھی کیے، لیکن عرفات میں ان کی زبان کچھ اور کہہ رہی تھی، وہ اور ہی واقعہ کی بات کر رہے تھے، کسی اور کے بارے میں کہہ رہے تھے، کوئی اور قربانی، کوئی اور طواف، کوئی اور کعبہ اور شیطانوں میں بھی دوسرے شیاطین کہ جن کو رمی کرتا تھا۔

ذرا تصور کیجیے کہ خلیفہ کے دعاگویوں کے انبوہ میں شیعوں کا اس طرح اٹھ کھڑا ہونا (ہر چند کہ ان کی تعداد کم ہو) کس قدر زبردست اور خطرناک قوت ہو سکتی ہے، کس قدر بیداری لانے والی اور انقلابی ہو سکتی ہے اور پھر یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ آخر کیوں کارگاہ خلافت اپنی پوری قوت کو اس بات پر صرف کرتی تھی کہ آل علی کے زائرین کی صف کو توڑے اور انقلاب کو آگے بڑھنے سے روکے۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ کعبہ سے کربلا کی طرف تبدیلی راہ کو اگر ہم اس کی

شرائط اور اس کے زمانے سے الگ کریں تو وہ نا قابل قبول، انحرافی اور قدامت پسندانہ ہوگی (جیسا کہ عرفات میں، میں خود اس انحراف کو غیر اسلامی حتیٰ کہ اسلام دشمن سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر حسینؑ ہوتے تو وہ اس کی نہی کرتے) لیکن اگر ہم ان حالات اور ان شرائط میں اس کے مفہوم کو لیں تو وہ اعتراض کی صورت میں ایک انتہائی انقلابی عمل ہوگا۔

"کعبہ" سے "کربلا" کی طرف انحراف حکومتی استحمار شدہ لوگوں کی خاموشی میں ایک فریاد اعتراض کی صورت رکھتی ہے اور اس فریاد کو اس کے زمانے اور اس کی شرائط میں سننا چاہئے تاکہ اس کی اسلامی اور انسانی اصلیت سامنے آسکے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ اس سال کے "اولمپک" کو موجودہ زمانے اور موجودہ شرائط میں دیکھنا چاہئے تاکہ صحیح فیصلہ ہوسکے اور مشرق و مغرب کی باتوں پر توجہ نہ جائے کہ جنھوں نے بہ یک زبان اس کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔

وہاں شیعہ، خلافت کے استحمار شدگان کے بیچ اٹھ کھڑا ہوتا تھا تاکہ اس پر کئے جانے والے ظلم کے بارے میں فریاد کرے اور جھوٹی دوستی کے لباس کو دشمن کے بدن پر پارہ پارہ کردے۔

دو متناقض شناخت

"سقیفہ" کے بعد دو متناقض شناخت کا وجود عمل میں آتا ہے۔ علیؑ: شائستہ امام، حضرت ابوبکر، الیکشن میں خلافت کے تاجدار لیکن ہم جس قدر صدر اسلام سے دور تر ہوتے جائیں گے خلافت کا خم دائیں بازو کی طرف جھکتا جائے گا اور بنی امیہ، بنی

عباس، اور مغلوں کی سلطنت میں تو حاکم آہستہ آہستہ پورے طور پر مظہر شر ہو جاتا ہے اور "شیطان" کی صورت اختیار کرتا ہے اور علیؑ اس کے مقابل، مظہر خیر مطلق اور وجہ اللہ یا اللہ کا چہرہ ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی گزرگاہ میں غاصب خلیفہ باضابطہ طور پر اہریمن کا روپ دھار لیتا ہے اور دوسری طرف علیؑ، تاریخ کے محروم انسانوں کے وجدان و ذہن میں الٰہی تجلی بن جاتے ہیں۔

ایک طبقہ میں علیؑ مطلقاً محکوم تھے اور دوسرے میں حاکم۔ ایک طرف علیؑ کے سارے انسانی اقدار کا انکار کیا گیا اور دوسری طرف علیؑ کے لئے الٰہی قدریں مانی گئیں، جب ایک ڈایا لکٹیک اصل اور ایک نسبی امر اپنی ضد کے مقابل مطلق کی سمت جاتا ہے تو ایک امر مطلق بن جاتا ہے۔

تاریخ میں، اسلام جس قدر دائیں بازو کی طرف پھرتا ہے اسی قدر بائیں بازو کی طرف بھی اس کا جھکاؤ ہوتا ہے۔ ایک طرف تشیع، مسئول و مظلوم انسانوں کی آرزوؤں، ان کے عقیدوں اور آئیڈیلز کی تجلی گاہ بن جاتا ہے۔ تسنن کا جبری اور ڈایالکٹیکی رد عمل، کہ جو حاکم ستمگاروں کا مرکز، قوموں کے طبقاتی استثمار (استحصال کی ایک قسم) اور اشرافیت کی تکیہ گاہ بن گیا تھا۔

اور دوسری طرف سے تسنن، برگشتہ ترین قانونی حکومتی مذہب، جرم و جنایت کا توجیہ کنندہ اور جلاد حکومت کا مظہر۔

لیکن (اپنے پسماندہ ترین، غیر مہذب ترین، عوام دشمن ترین، طبقاتی ترین، اشرافی ترین اور جاہلی ترین نظام واقتدار میں) اس کے سمبل کیا ہیں؟:

قرآن، سنت، حج، جہاد، مسجد، جماعت،...... تو پھر محکوم و محروم طبقے کے سمبل کیا ہو سکتے ہیں؟ یہ طبقہ جب اسلام کے اصلی سمبلز کو دشمن کے ہاتھ میں دیکھتا ہے تو دوسرے سمبلز، دوسرے سہارے اور دوسرے ہتھیاروں کی جستجو میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو باخبر اور بیدار کرنے کے ضمن میں اس پیام کو بھی ان تک پہنچائے کہ جسے جناب رسالتمآب ﷺ قرآن، سنت، حج، اور مسجد کے سمبلز میں عوام کو پہنچاتے تھے (اور اب بالکل اس پیام کی ضد پر کام ہو رہا ہے)

لہٰذا وہ عترت پر تکیہ کرتا ہے۔ اس لئے کہ حکومت یہ چاہتی ہے کہ "سنت" کے ذریعے عترت کو مٹائے اور اس کی نفی کرے، کیونکہ اگر عترت نہیں ہوگی تو حکومت سے وابستہ مبلغین اور علماء و فقہا بڑی آسانی سے جس طرح چاہیں گے "سنت" کو حکومت کے مفاد میں تفسیر کریں گے۔

شیعوں نے "ولایت" کو اپنا سمبل بنایا ہے اس لئے کہ نبوت دشمن، رسالت دشمن، علی دشمن، قرآن دشمن، بشر دشمن اور جلاد صفت حکمران نے اپنے آپ کو رسول ﷺ کا خلیفہ قرار دیا ہے اور نبوت کو اپنا سمبل بنایا ہے اور رات دن لاؤڈ اسپیکر اور اس سے وابستہ گلے، نبوت، نبوت، نبوت کی آواز بلند کر رہے ہیں، اور اس عالم میں "شیعہ" اس طبقے کی بھینٹ چڑھنے والے لوگ ولایت پر تکیہ کرتے ہیں اور اس سمبل کو اپناتے ہیں جو ان حکمرانوں کی نفی کرنے والی ہوتی ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے جھوٹے تقویٰ اور جھوٹی تقدس کا لباس پہن رکھا ہو۔ اس لئے کہ "ولایت" یعنی علی یا علی جیسی حکومت کی پذیرفتگی اور سوا اس کے، حتیٰ عمر بن عبدالعزیز کی حکومت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، ہر چند کہ اس نے ایک مصلح، متقی، معتمد، زاہد اور انقلابی ہونے کا

بہت اچھا اثر قائم کیا تھا اور "عمومی افکار" کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ صرف شیعہ ہی وہ قوم تھی جس کا ایک "معیار" تھا اور وہ ولایت و امامت پر (ایک صحیح طرز حکومت کے عنوان سے) تکیہ کرتی تھی اور جانتی تھی کہ ایک غلط طرز حکومت میں صحیح اور شائستہ حاکم ایک بے معنی بات ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر جب بے خبر عوام حتیٰ نیم روشن خیال لوگ بھی عمر بن عبدالعزیز کی زہد نمائیوں کے شیفتہ و فریفتہ ہوئے اور اس کے پلید اسلاف کے مقابل اس کی انفرادی شخصیت کے زیر اثر اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا شیعہ، امام محمد باقر علیہ السلام کی خوبصورت اور عمیق تعبیر میں اسے ایک ایسا شخص دیکھتے تھے کہ: "جس کی زمین پر تحسین اور آسمان پر ملامت ہوتی تھی!" اس لئے کہ بات حکومت کے عملے کی ہے فرد کی نہیں۔

سادات

آج سادات کے وجود کا مسئلہ ہر روشن خیال کے سامنے ہے اور ایک نسلی مسئلہ ہو گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا اور نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ نسلی برتری کا عقیدہ بنیادی طور پر اسلام کی روح اور قرآن و سنت کی نصِ صریح کے منافی ہے اور جس پیغمبر نے نسل پرستی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور جاہلی رسم کہہ کر اس پر ضرب لگائی ہے وہ کبھی اپنے معاشرے میں خود نسل پرستی کو جگہ نہیں دے سکتے۔

تاریخ اسلام کے متن اور قدیم اجتماعی نظاموں میں ملاحظہ کیجئے کہ قبیلہ بنیادی طور پر ایک پارٹی اور ایک خاص اعتقادی گروہ بھی ہے اور قبیلہ پر حاکم ہستی کئی نسلوں میں مشخص ہے۔

نبوت اور رسالت کے مسئلہ سے ہٹ کر "بنی امیہ" اور "بنی ہاشم" کے دو قبیلوں کو دیکھئے کہ حتیٰ بعثت سے پہلے، بنی امیہ انسانی اور اخلاقی نقطہ نظر سے کمزور اور مال ودولت کے اعتبار سے برتر ہیں اور بنی ہاشم مال ودولت کے اعتبار سے، مرتبہ میں کم اور انسانی "کرامت" کی رو سے برتر ہیں۔

بنیادی طور پر گزشتہ میں قبائل اپنے اخلاقی، اعتقادی، اور خونی شجروں کو ایک دوسرے کے ساتھ تحفظ دیتے تھے۔ اس لئے کہ آج کی طرح فرد کے لئے "ماحول"، "سماج" شہر اور ملک نہیں تھا بلکہ اس کی تربیت اور اس کا اجتماعی ماحول "خاندان" تھا اور قومی اور سیاسی معاشرہ، اقتصادی طبقہ، تعلیم وتربیت کا نظام اور ملکی ثقافت، اس پر اس سے کمتر اثر قائم کرتے تھے، خاندان ایک مشترک قومی روح اور مشابہ خصائص کے ساتھ ایک حقیقی سوسائٹی تھی۔

اس اعتبار سے، سادات ایک بہت بڑا گھرانہ تھا کہ جس کا مرکز علیؑ تھے اور سادات اور "بنی علیؑ" کی طرف توجہ، بنی امیہ اور اس کے بعد بنی عباس کی نفی تھی۔ خود "سادات" کا وجود حکومتوں، طبقوں، اور حاکم قوتوں کے خلاف ایک پہرہ تھا۔

پس بلا سبب نہیں کہ بنی امیہ اور بنی عباس سادات کے قتل عام کا حکم صادر کرتے ہیں اور جہاں کہیں آل علی کا کوئی نشان انہیں ملتا ہے اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے ایران وہندوستان سے لیکر شمالی افریقہ اور الجزائر تک گھوم آیئے اور پوچھئے کہ آخر کیوں ہر تنگ گلی (ہر پہاڑی راستے، ہر اسٹرٹیجی مرکز اور ہر کوہ دکہ) میں کوئی نہ کوئی امام زادہ مدفون ہے۔

یہ لوگ صرف خاندانی انتساب اور نسلی بزرگی کی بنیاد پر حکومتوں کے تعاقب کا

شکار نہیں تھے بلکہ یہ سب علوی انقلابی پارٹی کے ارکان تھے کہ جو حکومتوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور حکمرانوں کو غاصب سمجھتے تھے۔ ان سے لڑتے تھے اور ان کو مظلوم اور انصاف طلب لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ایران کے شمال اور البرز کے پہاڑوں کی پشت پر چند ایک حسنی سادات کے آنے سے وہ سب لوگ کہ جو چوتھی اور پانچویں صدی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے خلافت کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا تشیع کے گرویدہ ہو کر شیعہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ سادات کو خلیفہ اور حکومت کو خلاف سمجھتے تھے اسی لئے انہوں نے ان کی مدد کی اور گرگان اور شمالی حکومت کو ان کے حوالے کیا۔

پس سادات کا اتنا احترام اور ان کی قانونی، شرعی، اور اخلاقی مدد نسلی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ حکومت مخالف محاذ کی مدد اور مجاہدے اور مبارزے کے لئے تھی۔

سادات کی ابھی حال تک میں اسلامی ممالک میں اصل نقیب و نقابت کے نام سے ایک آرگنائزیشن اور باضابطہ پارٹی تھی اور بڑی آراستہ تھیں، (بخارا تنظیم، بلخ تنظیم، نیشاپور تنظیم ....) اور مختلف نقباء کا امام کے ساتھ رابطہ تھا۔ ان کے تبلیغاتی، اقتصادی اور سیاسی امور کو امام سے نسبت دی جاتی تھی، یہ لوگ ہر تنظیم سے مرکز کو پیسہ بھیجتے تھے اور مرکز اور امام سے مبارزے اور مجاہدے کے احکامات حاصل کر کے انہیں اپنی تنظیموں تک پہنچاتے تھے۔

نقباء، اہلبیتؑ کی فقہ اور ثقافت کو (کہ جن کی سختی سے ممانعت تھی) لوگوں کے قلوب اور اذہان تک پہنچاتے تھے اور ان کی حکومتوں اور وسیع تبلیغات کے خلاف جنگ لڑتے تھے۔

خمس و زکوۃ کا مصرف

زکوۃ ان دنوں ایک جبری ٹیکس تھا جو جلاد حکومت کو عطا کی جاتی تھی، اور یہ پیسہ زکوۃ دینے والوں اور محروم و مجبور عوام کے قتل عام میں مصرف ہوتا تھا۔

پس اس دوران ان عوام دشمن زکوۃ لینے والوں کے خلاف جنگ کے اخراجات کو کہاں سے مہیا کیا جاسکتا ہے؟

مگر کیا ایسا نہیں کہ جنگ کے لئے سازو سامان کی ضرورت ہوتی ہے اور سازوسامان کی خریداری کے لئے پیسے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ "خمس" جنگی بجٹ کے عنوان سے ادا ہوتا ہے اور "حسینیہ" اور "امام بارگاہ" اینٹی حکومتی انتظامی مرکز کے عنوان سے عمل میں آتا ہے۔

"زکوۃ" حکومت کے اختیار میں ہے اور وہ عوام کی بربادی اور ان کے گھروں کی ویرانی میں صرف ہو رہی ہے اور مسجد، حکومت کی تیز پنجوں والی بلی کی عابد نمائیوں کا تبلیغاتی مرکز ہے۔

حکومت "زکوۃ" سے محل بنا رہی ہے اور ان محلوں کی تعمیر کی توجیہ مسجدوں میں کر رہی ہے، حکومتی سرمایہ دار، زکوۃ کے پیسے سے صحت مند سے صحت مند تر ہوتے جا رہے ہیں اور مسجد میں ان کامیابیوں کو منہ پر لا رہے ہیں۔

اور شیعوں کو اس بات کا سامنا ہے کہ شیعہ "خمس" ادا کرتے ہیں تاکہ اپنی جنگ کو وسعت دیں اور حسینیہ اور امام بارگاہ بناتے ہیں تاکہ اپنے سپاہیوں کو پناہ دیں۔

شیعہ جب زکوۃ کو اپنے کچلنے کی راہ میں اور مسجد کو (ابتداء میں) علیؑ کی قتل گاہ اور

(انتہا میں) فکر علی کی قتل گاہ دیکھتے ہیں تو "خمس" اور امام بارگاہ کا رخ کرتے ہیں تا کہ اپنی ہمیشہ کی (علی سے اب تک کی) جنگ کو ممکن اور طاقتور بنائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر امام بارگاہ کی تعمیر، حکومت کے پیر پر ایک تازیانہ ہے اور مسجدوں کی تعداد حکام کی اتراہٹ کا ذریعہ اور ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

تقیہ، تقلید اور شہادت

دنیا کے مجاہدین کے معاہدوں میں ہم ان تین اصولوں کو مکرر دیکھتے ہیں۔ ساری دنیا کے انقلابی رہبر اپنے پیروکاروں سے "رازداری"، "تنظیم کی اطاعت" اور "موت کے لئے تیار رہنے" کو چاہتے ہیں اور یہ شیعوں کے وہی تین بنیادی اصول ہیں جو ان کے عقائد کا حصہ رہے ہیں:

۱۔ تقیہ ۲۔ تقلید ۳۔ شہادت۔

تقیہ

"تقیہ" اس مجاہد کی رازداری کے مفہوم میں ہے کہ جو خفیہ تنظیم کے ساتھ حکومت کے خلاف جنگ لڑتا ہے اور اگر ایک جملہ یا ایک راز اس کے منہ سے پھوٹ پڑے (حتیٰ حق بات بھی) تو پورا گروہ ختم ہو جاتا ہے۔

شیعوں کا قتل عام (فی القتل) نیشاپور بلکہ بغداد میں بھی ان افراد کے عمل کا نتیجہ ہے کہ جنہوں نے تقیہ سے کام نہیں لیا اور رازدار نہیں رہے۔

شیعوں کی "ذهبك، ذهابك اور مذهبك" (رفتار، رفت وآمد اور عقیدہ) کی

پوشیدگی پر تکیہ اور دوسروں سے اس کی حفاظت اس بات کی دلیل ہے کہ تم شیعوں کا عقیدہ یا ارادہ خطرناک ہے۔ تمہاری رفت وآمد مثبت اور بے ضرر انہ انداز میں دشمن اور حکومت کے مفادات کے بر خلاف ہے۔

وگرنہ بیوی سے چھپ کر "متائی منکوحہ" کے گھر جانے کا نام تو تقیہ نہیں ہے۔ نہیں...... ہے، مگر صفوی شیعوں والا تقیہ۔

تقلید

ایسے وقت میں کہ جب رہبری مشخص اور آشکار نہیں اور ابلاغ عامہ کے ذرائع آزادی سے اپنا کام انجام نہیں دے سکتے تو پھر کھوج لگانا، تامل سے کام لینا اور لیت ولعل کرنا مبارزہ میں خطرناک ہے۔ ایسی منزل پر اطاعت کو ایک تنظیم کے ساتھ آنکھ بند کر کے روبعمل آنا چاہئے۔ جونہی قابل اعتماد رہبر سے کوئی حکم پہنچے فوراً بے چوں وچرا اسے انجام دینا چاہئے۔ یہ وہی اصل ہے کہ جس کو آج کی خفیہ تنظیمیں کہہ رہی ہیں: "بے چوں وچرا اپنے لیڈر کی اطاعت کرو۔ اگر کوئی منحرف ہوا تو اسے پشت کی جانب سے چھپ کر بھی مار سکتے ہو لیکن اس کی نافرمانی نہیں کر سکتے"!

یہ اسی تقلید کا مفہوم ہے کہ جو شیعوں میں رائج ہے۔ اہل تشیع امام کی پیروی کو "اطیعو اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" کی آیت کی بنیاد پر توجیہ کرتے ہیں اور امام کو اولا الامر جانتے ہیں کہ جس کی اطاعت کو خدا نے اپنی اطاعت اور اپنے رسول کی اطاعت کے ہم ردیف قرار دیا ہے اور یہ تقلید شیعوں میں اس غیر امام رہبر کے لئے بھی متعین ہے کہ جو ان کا نائب ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک مسئول اور مجاہد

نظام میں یہ تقلید ایک اجتماعی اور تنظیمی تقلید ہے نہ کہ عقلی اور ذمہ داری سے خالی۔

شہادت

خلافت سے آراستہ حکومت میں شیعہ کے پاس سوائے "شہادت" کے اور کوئی سرمایہ و ہتھیار نہیں ہے اور یہ جو ہم سن رہے ہیں: "من بکیٰ او ابکیٰ او تبا کی وجب له الجنة" اور اس پر اظہار تعجب کر رہے ہیں۔ (کیونکہ جو روتا ہے اس کے پاس رونے کیلئے کوئی دلیل ہے، جو رلاتا ہے اس کے پاس رلانے کے لئے کوئی دلیل ہے اور یہاں کوئی بات بنتی ہے لیکن رونے والی صورت بنانا اور جھوٹ موٹ رونے کا مفہوم کیا ہے؟!) ہمارا تعجب بے ہودہ ہے اس لئے کہ ہم اس وقت اور اس زمانے سے واقف نہیں ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس دور میں واپس لوٹیں جس میں کہ ہر قطرہ اشک ایک ایسا کلام رہا ہے کہ جس نے شہادت کو ایک پیام کی طرح لوگوں تک پہنچایا ہے اور ہر وہ نالہ کہ جو کسی مظلوم کے گلے سے بلند ہوا ہے حاکم طبقے کے ظلم کو دنیا والوں کے کانوں تک پہنچایا ہے۔

اور اسی لئے رونے کا حکم صادر ہوا ہے (خواہ وہ جھوٹ موٹ کا رونا کیوں نہ ہو) اس لئے کہ رونا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی المیہ رونما ہوا ہے، کسی ظالم نے ظلم و زیادتی کی ہے اور اس طرح وہ تمام کوششیں مٹ جائیں جن کو خلافت کے تبلیغی ذرائع، اسلامی حکومت کی توفیقات کے جنجال اور فتوحات و کامیابیوں کے بارے میں پھیلا رہے تھے۔

عزاداری

عزاداری نہ ایک دن، نہ دس دن، نہ ایک ماہ، نہ دو ماہ، بلکہ سارے سال، آخر کیوں؟

اس لئے کہ ایک قوم شہادت میں زندگی کر رہی ہے اور اسے چاہئے کہ وہ عزادار رہے اور اپنی مجلس عزا میں شہادت کا ذکر کرے اور اپنے شہیدوں کی یاد تازہ کر کے نئے شہید پیدا کرے۔

وہ مجلس عزا بپا کرتا ہے تاکہ شہادت کو آئندہ نسل اور آئندہ نسلوں میں منتقل کرے اور یہی وجہ ہے کہ حکومت کا عملہ اپنی کوشش اس بات میں صرف کرتا ہے کہ ان مجلسوں کے انعقاد کو روکا جائے۔

اور یہ بات بھی شہادت اور فلسفہ شہداء کو اجاگر کرنے کے لئے کہ شیعہ اپنے بھائی، اپنے چچا، اپنے ماموں اور اپنی خالہ و چچا وغیرہ کے لڑکوں کے فاتحہ کی مجلس کے بہانے سے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو جمع کرتا ہے اور حسینؑ بن علیؑ اور شیعہ شہداء کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور پھر یہ خبر حکومتی محافظوں، تھانیداروں اور مسجد کے حکومتی مولویوں کو ملتی ہے اور وہ سب مل کر دھاوا بولتے ہیں، اسے گرفتار کرتے ہیں، اس پر تشدد کرتے ہیں اور جیلوں میں ڈالتے ہیں مگر شیعہ وہ ہے کہ جو اپنی شادی کی محفل میں بھی جناب قاسم کی شادی کو روتا ہے اور کربلا کی گفتگو کرتا ہے۔

منقبت و مکرمت

آپ دیکھتے ہیں کہ علی کے بارے میں نہیں جانتے، انہیں نہیں پہچانتے اور

منقبت و مکرمت کرتے ہیں اور خدا تک پہنچاتے ہیں، اور ہم اور آپ جیسے روشن خیال تعجب کرتے ہیں کہ اتنی مبالغہ آرائی؟ اتنا اصراف؟ ان ساری لفظی مدح سرائی، ثناء خوانی، شاعری اور منقبت خوانی کا فائدہ کیا ہے؟ لیکن اگر ہم تاریخ کی طرف پلٹیں، اس ظلم کا تجزیہ کریں جو اس خاندان پر ٹوٹا ہے تو نہ صرف یہ کہ تعجب نہیں کریں گے بلکہ اس کو ضروری بھی سمجھیں گے، اور ان کے ہم زبان بھی ہو جائیں گے۔

حکومت کے تبلیغی ذرائع نے اپنے پورے وسائل کے ساتھ اس بات کی کوشش کی ہے کہ علیؑ کو ایک نامناسب اور غیر مسلمان صورت میں پیش کریں۔

ایک طرف سے بنی امیہ، ایک طرف سے بنی عباس اور دوسری طرف سے خوارج اور ان سے وابستہ لوگ اپنی پوری قوت اور پورے زور کے ساتھ، منبروں اور محفلوں اور تقریروں اور تحریروں میں علیؑ اور ان کے گھرانے پر حملہ آور ہوتے ہیں اور یہ پروپیگنڈہ اتنا جاندار اور طاقتور ہوتا ہے کہ مسجد کی محراب میں علیؑ کی شہادت کے بعد استحمار شدہ (استحصال کی ایک قسم) لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں:

علیؑ مسجد میں کیا کرنے گئے تھے؟ اور جب سنتے ہیں کہ انہیں حالت نماز میں قتل کر دیا گیا ہے تو پوچھتے ہیں:

کیا علیؑ نماز بھی پڑھتے تھے؟! ملاحظہ کیجیے کہ شام کے سبز محل اور بغداد کے ہزار ویکشب والے دار الخلافہ کی روٹیاں توڑنے والے نمک خوار ملاؤں نے باشعور لوگوں کے ساتھ کیا کیا؟ خاص طور پر ان دنوں میں نہ فوٹو تھی نہ فلم، نہ چھاپے خانے، نہ فوٹو کاپی، نہ آفسٹ، اور نہ وڈیو کیسٹ کہ کوفہ کی مسجد، ان پروپیگنڈوں کی تکذیب کر سکے۔

پھر اس ہجوم کے سامنے اور اس ڈھیر سارے پروپیگنڈے کے آگے آپ شیعوں سے کیا توقع کرتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ ان کی اندھی آنکھوں کے سامنے، چہرہ سازی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور علیؑ کو خدائی چہرہ دیں؟ جب آج کی دنیا میں ایک روشن خیال سنّی عالم (کہ جو ایک علمی انجمن کا سربراہ بھی ہے) میری اس تقریر کی رو میں جسے میں نے انجمن کی کارکردگی کی توجیہ میں علیؑ کو مثال بنا کر پیش کیا اور کہا کہ علیؑ کی ذات دنیائے اسلام کے لئے ایک نمونہ ہے تو نہ معلوم کس منہ سے وہ مجھ شیعہ سے کہتا ہے: "یہ علی جس کے بارے میں آپ اتنی مبالغہ آرائی کرتے ہیں ایک جذباتی آدمی ہیں جو اپنے نہج البلاغہ میں عشاق، تاریخ اور میووں کی توصیف کرتے ہیں.........." اور علیؑ پر حملے شروع کرتا ہے (حالانکہ آج کے دور میں علیؑ کی قدریں اتنی روشن ہیں کہ ایک عیسائی بھی ان کو ہم سے بہتر جانتا ہے) اور ابھی تک وہ چودہ سو سال پہلے کے پروپیگنڈے کے زیر اثر رہتا ہے اور پھر صدیوں پہلے دشمن کے پروپیگنڈے کے اوج پر آپ شیعوں سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ شیعہ حضرت علیؑ کی شخصیت کی توصیف کے ساتھ حکمران طبقے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے پروپیگنڈے کے ہجوم کو روک لیتا ہے اور علیؑ کی تحقیر میں مبالغے کے آگے تبلیغاتی مقاومت اختیار کرتا ہے۔

پس شیعوں کا عترت، ولایت، اور امامت پر خصوصی تکیہ حکومت، خلافت اور زعامت کی نفی ہے۔ روایات، سادات، خمس، امام بارگاہ، تعزیہ داری، تشخص، جدائی، تقیہ، گریہ، عزاداری، زیارت، منقبت اور مدح، تقلید اور شہادت پر تکیہ یہ سب چیزیں شیعہ تاریخ کی تقدیر اور آل علی کا طبقاتی عوامل کے خلاف اور حکومت کے

خلاف اقدام اور حق طلبی، حریت پسندی اور عدالت جوئی کا پیام ہے اور یہ سب چیزیں جابر حکمرانوں کے خلاف، شیعوں کے خصوصی اجتماعی اور اعتقادی موقف میں توجیہ ہوتی ہیں، اور بتاتی ہیں کہ یہ سب باتیں ایک عظیم انقلابی کردار کی حامل ہیں۔

موسیقی یا غنا کی حرمت

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ اس حاکم طبقے کے مقابل جو اپنی حکومت کو قرآن وسنت کے ساتھ توجیہ کرتا ہے شیعوں کے ہر چیز کو اس کی خاص معاشرتی (ثقافتی) اور تاریخی سرنوشت میں دیکھا جانا چاہئے ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ جو اہل تشیع کے ہر حکم، ہر عقیدے، ہر عمل، ہر کردار، ہر مقصد، ہر مسئلہ اور ہر فلسفے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اور اس طرح شیعہ سماج، حتی کہ شیعہ عوام کے بہت سے وہ نا قابل قبول خاص مسائل کہ جنہیں آج ہم روشن خیال لوگ کہ جو انقلاب فرانس اور عصر لیبرالزم کی منطق، ڈیموکریسی، سائنس، تعلقات عامہ کی پیشرفت اور عوام کی ترقی وبیداری کی موجودہ فکر سے سوچتے ہیں یا پھر ان مسائل کو کہ جو تاریخی، سماجی، ٹیکنیکی اور حکمت عملی کا پہلو رکھتی ہیں، علمی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، نہ صرف غیر مہذب، بیہودہ اور باطل دکھائی نہیں دیتے بلکہ وہ سماجی اور آزادی طلبانہ، سیاسی اور فکری جنگ کے اعتبار سے بہت پر معنی، عمیق، ترقی پسندانہ، بہت زیادہ ہوشمندی اور روشن خودآگاہی کے حامل ہوتے ہیں۔

ان ہی مسائل میں ایک مسئلہ "حرمت غنا" ہے جو شیعوں کے درمیان متواتر چلا آرہا ہے۔ موجودہ شیعی تبلیغاتی مراکز کہ جو شیعہ عقائد میں سے بہت سے خصوصی

عقائد واحکام کی منطقی تفسیر اور تاریخی تجزیہ سے عاجز ہیں ترقی پسند لوگوں کی اس تنقید کے مقابل کہ "آخر کیوں موسیقی کہ جو ایک نہایت عمیق اور موثر ہنر ہے اور جو بہت مثبت نتائج کا حامل بھی ہو سکتا ہے شیعوں میں حرام ہے؟" جواب سے عاجز ہیں اس لئے کہ اس کی حرمت کی سند نہ تو قرآن میں ملتی ہے اور نہ حدیث میں بہت سے لوگ "فاجتنبوا قول الزور" کی آیت کا سہارا لیتے ہیں اور قولِ زور" کو کہ جو "بیجابات" کے مفہوم میں ہے قرآن میں موسیقی کی حرمت کی دلیل گردانتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بنیادی طور پر موسیقی "صوت" ہے "قول" نہیں! ان لوگوں نے گویا اس بیہودہ شاعری کو جنہیں مطرب یا گویے گاتے ہیں موسیقی سمجھا ہوا ہے! یا وہ موسیقی کو لہو ولعب میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ "لعب" وہ مصروفیت والے کھیل ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں اور "لہو" ہر وہ عمل یا گفتگو ہے کہ جس میں وقت اور انرجی دونوں ضائع ہوتی ہیں اور اس سے کوئی مثبت بات سامنے نہیں آتی۔ جبکہ موسیقی کی بعض قسمیں وہ ہیں جو دوسرے فنون لطیفہ (مثلاً شاعری) کی طرح، روح، ایمان، علم، تربیت، تکامل اور روح کی زیبائی میں موثر ہو سکتی ہے۔ ایک عمیق سمفونی (بھیروں)، ایک فلسفی یا اخلاقی کتاب سے زیادہ پر اثر ہے۔ بھروں کی راگنیوں میں سے پانچواں راگ (بھیرویں) کہ جو انسان کو اس قدر بلندی پر لے جاتا ہے اسے اقتدار و شکوہ بخشتا ہے حرام ہے اور افیم کا استعمال (چونکہ مسکر مایہ نہیں) حلال؟ یہ کیسی فقہ ہے؟

اور پھر یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ پھر کیوں بڑے بڑے علمی اداروں تک میں قرآن کے لئے خوبصورت آواز اور ایک معیّن لے پر تکیہ کیا جاتا ہے۔ پھر کیوں امام رضا علیہ السلام کے حرم میں "گنبد طلا" کے کنارے "دربار سلطان ارض طوس" کے نام

سے منسوب ایک "مکمل آرکسٹرا" ہر صبح و شام نقارہ بجاتا ہے ؟

پھر کیوں، جناب آقای حجتہ المسلمین ، آیت اللہ زادہ حسینی کہ جو "بیت روحانیت" سے منسوب ہیں اور علوم قدیمہ کے مدرسے کے مسئول بھی، اپنی کتاب "ڈاکٹر کیا کہتا ہے ؟" میں میری اس تنقید کی رد میں کہ "آخر کیوں آپ شیعوں کے مناسک حج کی بعض کتابوں میں لکھتے ہیں کہ حاجی حضرات کو چاہیے کہ وہ منیٰ میں قربانی کا گوشت (کہ جسے لاکھوں دنبوں اور اونٹوں کی صورت میں بلڈوزروں کے ذریعے تہ خاک کیا جاتا ہے اور فقہی نقطہ نظر سے کہا جاتا ہے کہ ان کا گوشت کافروں اور مشرکوں تک کو دینا جائز ہے) ہرگز سوڈانیوں کو نہ دیں ؟ یہ لوگ کیا اس بات کو نہیں جانتے کہ سوڈان ایک قابل فخر اسلامی ملک ہے ؟ اس کی حکومت ایک مسلم ڈیموکریٹک جمہوریہ ہے اور وہ افریقہ میں ایک عظیم ترین ترقی یافتہ ترین مسلمان قوم ہے۔ یہ حکم کہ جس سے "یان اسمتھ" کی تلخ و ناگوار نسل پرستانہ بو آتی ہے۔ اہلبیت اور شیعہ مکتب فکر کے علماء کی زبان سے بھلا کیوں ؟ اس طرح کی گفتگو سے دنیا میں، خاص طور پر مسلمانوں میں اور بالاخص سیاہ فام مسلمانوں میں اور ایسے دور میں جب کہ عیسائیت پر نسل پرستی اور سیاہ فام لوگوں کی تحقیر کا الزام ہے اور اسلام برابری اور نسلی برادری کی حمایت سے سرفراز ہے، ہماری کیا آبرو رہ جاتی ہے"۔

میری اس تنقید کا کسی نے جواب نہیں دیا اور جس سے بھی میں نے پوچھا (حتیٰ ان بڑی شخصیتوں سے بھی کہ جن میں وہ ہستیاں بھی شامل ہیں کہ جنھوں نے حج کے مناسک میں یہ بات لکھی ہے اور اسی پایہ کے اور لوگوں سے بھی کہ جن سے میری ملاقات حج میں ہوئی) کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ البتہ کچھ لوگوں نے کہ جن کی

معلومات گویا کسی قدر زیادہ تھی فرمایا: چونکہ اس بات کو شیخ مرتضیٰ انصاری اعلی اللہ مقامہ نے لکھی ہے اس لئے ہم بھی اسے دمِ تحریر میں لے آئے ہیں!

اور حقیقت امر بھی یہی ہے۔ لیکن جناب آقای حسین میلانی نے میرے نظریات کے خلاف جو کتاب "ڈاکٹر کیا لکھتا ہے؟" (مطبوعہ مشہد) کے نام سے چھاپی ہے اس میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ میری تنقید کے جواب کو علمی انداز میں دیں اور "سوڈانی کو قربانی کے گوشت کی امتناع" کے سلسلے میں منطقی اور تاریخی توجیہ پیش کریں اور اس کے لئے "سند" بھی لائیں اب ذرا اس بات کی صحت اور آج کے شیعہ کے لئے اس فقہی حکم کی ضرورت پر کہ "منیٰ میں وہ جس گوسفند کو ذبح کرے، زمین میں اس کو دفن بھی کرے تاکہ کوئی بھوکا سوڈانی اس کا گوشت نہ کھائے" توجہ فرمایئے اور اس کی توجیہ اور اس کے علمی جواب پر سر دھنئے اور دیکھئے کہ ایک پڑھا لکھا سند یافتہ فاضل شخص (عام پیشہ ور مولوی نہیں کہ جس نے جھوٹ موٹ روحانیت کا لباس پہن رکھا ہو اور اسلام اور علماء کے تحفظ کے نام سے اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہو) کس طرح استدلال اور استناد کر رہا ہے اور کس منطق کے ساتھ میری اس تنقید کا دندان شکن جواب دے رہا ہے اور کس اصل کی بنیاد پر اس طرح کے حقارت آمیز نسل پرستانہ حکم کی اس زمانے میں، یعنی بیسویں صدی میں، مذہب اہلبیت، مذہب علیؑ اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی فقہ کی نسبت سے علمی فقہی توجیہ کر رہا ہے۔ بعض لوگ اس کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سوڈانی سے مراد سیاہ فام لوگ ہیں، سوڈانی قوم نہیں! (اور بدتر!) وہ سیاہ فام نسل کہ جو اسلام کی نگاہ میں ہمیشہ سے محبوب ترین نسل رہی ہے اور جو گروہ در گروہ اسلام کی

طرف راغب ہوئی ہے؟ ہم اطمینان خاطر کے لئے اس کے متن کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ یہ فاضل آیت اللہ زادہ آقای حسینی کیا کہتا ہے اور "ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟" کی کتاب کے چھپے صفحے پر کیا لکھتا ہے"؟

پہلی دلیل : "بستانی" دائرة المعارف میں سوڈانی قبائل کا شمار کرتے ہوئے ان میں سے بہت سوں کے بارے میں لکھتا ہے : "لصوص قساة، مغرمون باللعب، جنبا، قزرون ينزعون الى السرقه."

دوسری دلیل : "عام روایت ہے کہ یہ لوگ مسجد نبوی میں داخل ہو کر ناچتے اور کھیل دکھاتے تھے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں :

پیغمبر اکرمؐ مجھے ان کا تماشا دکھانے کے لئے کاندھوں پر سوار کرتے تھے"۔
(صحیح بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ روایت ۶۹، صحیح مسلم کتاب العیدین روایت ۱۷)

شیعہ فقہا نے فتویٰ دیا ہے کہ ان کو قربانی کا گوشت نہ دیا جائے نہ کہ سوڈانی مسلمانوں کو کہ جو افریقہ کا ایک اسلامی ملک ہے"!(۱)

۱۔ میں جناب "الفاضل الحسینی المیلانی" صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرا اشکال بھی دور کیا اور اس فتوے کی دلیل اور اس کی سند بھی مجھے بتائی (کہ جس میں "بستانی" ایک مسیحی ہے اور بخاری اور مسلم سنی ماخذ) یعنی چونکہ بعض سوڈانی قبائل چور اور بازیگر رہے ہیں، اس لئے شیعہ قربانی کا گوشت مشرک و کافر کو دے سکتے ہیں یا اسے مٹی تلے دفن کر سکتے ہیں مگر سوڈانی کو نہیں دے سکتے۔ پھر یہ کہ اس جرم میں کہ چودہ سو سال پہلے بعض سوڈانی آرٹسٹ مدینہ آئے اور انہوں نے مسجد نبوی میں جا کر کھیل دکھایا اور جناب رسالتمابؐ اور ان کی زوجہ کی تفریح کا موجب بنے آج سوڈانیوں سے ان کا انتقام لیا جانا چاہئے۔
دوسری بات یہ ہے کہ منیٰ میں دنبہ ذبح کرنے والے شیعہ حاجی کو چاہئے کہ وہ اس سیاہ فام بھوکے آدمی کے بارے میں کہ جو آکر اس سے اپنے بھوکے اور غریب بیوی بچوں کے لئے اس دنبہ کا گوشت

(بقیہ اگلے صفحے پر)

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ اسلام میں موسیقی کی حرمت کے سلسلے میں ایک طرف تو قرآن یاسنت یا نقل یا اجماع سے کوئی مسلم معیار اور واضح دلیل موجود نہیں ہے اور ترقی پسند لوگوں کی یہ تنقید کہ آخر کیوں ایک انتہائی بلند بشری آرٹ کو حرام قرار دیا گیا ہے بلاجواب رہ جاتی ہے، اور دوسری طرف شیعوں کے نزدیک موسیقی کی حرمت اتنی مشہور اور متواتر ہے کہ کوئی عالم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور میرے عقیدے کے مطابق شیعوں کے اس "رد" کا شمار ایک منطقی ترین اور ترقی یافتہ ترین فقہی

(بقیہ حاشیہ)

طلب کر رہا ہے جسے وہ مٹی میں دبانا چاہتا ہے، تاریخی تحقیق کرے کہ کہیں وہ ان ہی بازیگروں کے اخلاف میں سے تو نہیں کہ جس کا ذکر بستانی نے دائرۃ المعارف میں کیا ہے یا اس کا شجرہ ان سوڈانی مطربوں کے گروہ سے تو نہیں ملتا کہ جنہوں نے چودہ سو سال پہلے مسجد نبوی میں رقص اور بازیگری کی تھی؟ کہ اگر اس بے سروپا تنگ دھڑنگ سوڈانی فقیر نے کہ جو اپنے پیٹ بھرنے کے چکر میں پیدل چل کر منیٰ آیا ہے مسلمہ تاریخی اسناد، علم الرجال، علم الانساب، تاریخ، سیرت، ملل و نحل اور معتبر شجرے سے ایرانی حاجی آقا کو ثابت کر دے کہ وہ ان کی اولاد و احفاد سے نہیں ہے تو حاجی آقا صاحب اسے اجازت دیں کہ وہ اس کے ذبیحہ سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر لے جائے (وہ بھی آقای الفاضل الحسینی المیلانی کے نقطہ نظر سے کہ جس نے اپنے ذاتی سلیقے کی بنیاد پر حکم کی توجیہ کی ہے اور معلوم نہیں کہ وہ اب بھی اصلی صاحبان فتویٰ کی نظر سے مجاز ہے کہ نہیں!) اور اگر اس سیاہ فام کے دلائل کافی نہ ہوئے اور یہ بات سامنے آئی کہ اس کا تعلق اسی گانے بجانے والے سوڈانی خاندان سے ہے کہ جس نے مسجد النبی میں تماشا دکھایا تھا تو ضروری ہے کہ اسے اپنے سے دور کر دیا جائے۔ وہ کافر اور مشرک سے بدتر ہے اور اسے چاہئے کہ وہ اپنے پچاسویں جد کی ناقابل معافی گناہ کے خمیازے میں بھوکا مرے!

(بقیہ اگلے صفحے پر)

احکام میں ہوتا ہے اور یہ بات ان کی اجتماعی آگاہی اور ان تمام سیاسی، ثقافتی، فکری، بلکہ فنی حالات پر بھرپور توجہ کی علامت ہے جو معاشرے میں لوگوں کے خلاف عمل میں لائی جارہی ہے۔

(بقیہ حاشیہ)

البتہ اس حقیر کا اشکال دور ہو گیا اور اس شرعی حکم کا سبب اور اس کا فلسفہ میری سمجھ میں آگیا۔ مگر اب ایک دوسرا اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایک ایسے گناہ کو جو اتنا قبیح ہے کہ اس کے ارتکاب کرنے والے کی ساری نسل اس سے متاثر ہوتی ہے اور ہمیشہ کے لئے شرعی حکم اس پر لگ جاتا ہے اور وہ ہندو قوم کے نجس طبقے کی صورت اختیار کرتی ہے اور اس منزل پر آجاتی ہے کہ چونکہ چودہ سو سال پہلے جن لوگوں نے مدینہ میں گایا جایا تھا وہ سوڈانی تھے اس لئے اب قیامت تک ہر سوڈانی کو کافر اور مشرک سے زیادہ نجس سمجھا جانا چاہئے جو بھوکے فقیر سوڈانی کو بھی (منی کے) بے مصرف گوشت کا حق نہیں دیتی تو پھر کس طرح خود پیغمبر کے زمانے میں ان کی اپنی مسجد میں کھلم کھلا باضابطہ طور پر یہ صورت رونما ہوئی اور رسول خدا نے نہ صرف یہ کہ انہیں نہیں روکا اور اس عمل سے وہ بھی مسجد میں منع نہیں کیا بلکہ اپنی زوجہ کو بھی کاندھوں پر بٹھا کر صحن مسجد میں ان سوڈانیوں کے گانے بجانے کا نظارہ کرایا۔ اگر میں کسی بھی عنوان اور کسی بھی استنتاج سے ایسی روایت صحیح مسلم اور صحیح بخاری سے نقل کرتا تو یہی آقای الفاضل الحسینی المیلانی میری کیا گت بناتے؟ اور کیسی تہمتیں لگاتے کہ میں سنی ہوں، اسلام میں رقص کی حمایت کرتا ہوں، رسولؐ پاک کی اہانت کا مرتکب ہوں اور مسجد نبوی کے صحن اقدس میں کہ جو مہبط وحی ہے ناچنے گانے کی محفل برپا کرتا ہوں، حتیٰ رسولؐ خدا اور ان کی زوجہ کو (نعوذ باللہ) نئی نسل کے ہپیوں کی مثل گردانتا ہوں کہ جو اپنی عورت کو اپنی پشت پر سوار کئے تفریحی پروگرام دیکھتے ہیں! خدا کا شکر ہے کہ اسے میں نے نقل نہیں کیا بلکہ ایک عالم شخصیت الفاضل الحسینی المیلانی نے نقل کیا ہے، وہ بھی شیعی علماء کے عقلی اور تاریخی فتویٰ کی سند کے عنوان سے!

اس حکم کو سمجھنے کے لئے تین باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ (۱) اصل حکم (۲) موسیقی کے فن کو اور (۳) اس حکم کے اجراء کے تاریخی زمانے اور اجتماعی شرائط کو۔

اولاً موسیقی ایک فن ہے کہ جس طرح شعر جملوں سے، مصوری رنگ و شکل سے اور تھیٹر اداکاری سے وجود میں آتا ہے، موسیقی "صوت" یا آواز سے وجود پذیر ہوتی ہے اور اس ترکیب کے مختلف اشکال آواز کی موزونیت یا راگوں کو جنم دیتے ہیں جو عام مفہوم میں موسیقی کہلاتی ہے۔ موسیقی، اپنے مقصد اور اثر کی بنیاد پر جنگی، غزلی، عاطفی، مذہبی، قومی، روایتی، ماڈرن، کلاسیکل، سازی اور ضربی وغیرہ جیسی قسموں پر منقسم ہے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں الگ فیصلے کی ضرورت ہے اور انہیں فنی، تکنیکی، اثرپذیری، اخلاقی، سماجی، فکری اور سلانے اور بیدار کرنے والے عامل کی حیثیت سے جانچنا چاہئے، بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے فنون کی کیفیت ہے، مثلاً شعر کہ جو معاشرے میں آگاہی، ایمان، تحریک، تعمیر اور قوت و شور بھی پیدا کر سکتا ہے، مجاہد کی تلوار کا سا کردار بھی انجام دے سکتا ہے، روشن خیال افراد کا قلم بھی بن سکتا ہے اور جنسیت، خواب، بے حسی، انحراف، غریزی لذت جوئی، اور تباہی، برائی اور ہوس کا سبب بھی بن سکتا ہے اور ہیروئن، زہر، بیماری، جہل اور مصیبتوں میں مبتلا کرنے والی بلا کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

ولیکن شیعی فقہ میں عوام کے درمیان رائج اصطلاح کے برخلاف، گفتگو "موسیقی کی حرمت پر نہیں ہے بلکہ اس اصطلاح پر ہے کہ جو ہمارے علمی متون میں پائی جاتی ہے اور اسے ہمارے فقہا استعمال کرتے ہیں اور وہ "غنا" ہے۔ جس طرح "تغزل" شہوانی اور عاشقانہ شاعری سے عبارت ہے اسی طرح "تغنی"، اصطلاحا

"گانے جانے" کے مفہوم میں آتا ہے اور گانے بجانے سے مراد وہ موسیقی ہے کہ جس سے عاشقانہ احساسات اور حیوانی شہوتوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور جس میں عام طور پر ہوس انگیز کنیزوں کے رقص، مطربوں کی غزل سرائی، ممدوح کی قصیدہ خوانی، مخالف کی ہجو سرائی اور تملقانہ اور چاپلوسانہ شاعری شامل ہے اور انہیں عیاشی کی محافل اور اشرافی حضرات کے رت جگوں میں ترنم اور احساسات کو ابھارنے والی آواز کے ساتھ گایا جاتا ہے۔

اس بناء پر موسیقی کو بھی دوسرے فنون کی طرح، بے حسی، تحریکی، مثبت، منفی، رزمی، غزلی اور آج کے ترقی پسند لوگوں کی اصطلاح میں "معتبر فن" (فن عوام کی سیوا میں) اور غیر معتبر یا لاابالی فن (فن برائے فن، فن برائے تفنن و لذت و جنسیت و ذاتی احساسات) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے موسیقی کی بھی دو قسمیں ہیں ایک رزمی اور دوسرے غزلی اور شہوانی، ظاہر ہے کہ غزلی اور شہوانی موسیقی کے جسے (Lirigue) کہتے ہیں ایک مطربانہ، تفریحانہ، عیاشانہ اور بے شرمانہ موسیقی ہے کہ جو بنیادی طور پر "غنا" کا ترجمہ ہے اور اس میں "مطرب" کا مفہوم آتا ہے جنہیں ہم گزشتہ میں مطربوں، کنجروں، رامشگروں، رقص و سرور کی پارٹیوں، ڈومنیوں اور ساز نوازوں اور طبلہ نوازوں کے عنوان سے جانتے تھے اور آج ہم انہیں کیبروں میں، شب کے تفریحی پروگراموں میں، ڈانسنگ میں، کلبوں میں، ریڈیو اور ٹیلویژن کے مختلف پروگراموں میں اور تھیٹروں میں فن اور فنکار کے عنوان سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔

یہ سب موسیقی نہیں "غنا" ہے۔ بھیروں کی بعض راگنیاں اور بھیرویں "غنا" نہیں بھیرویں، بھیروں کی پانچویں راگنی ہے۔ اس راگنی کو جب جرمن کا مرد آہن

"بیسمارک" سنتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں اور ایک تأمل آمیز، گہری، اور عرفانی کیفیت کے ساتھ کہتا ہے: ہم اس دھن میں سارے اسرار حیات، انسانی روح کے ناپیدا پیچ و خم اور تقدیر کے حیران کن کھیل کو گوش ہوش سے سنتے ہیں" ایک ایسی موسیقی کو ولگر اور چھچھورے دھنوں اور گیتوں کے ساتھ ایک سا نہیں سمجھا جاسکتا کہ جو معاشرے کی بدبختی، ذلت، بے حسی، پستی، لاابالی پن، خیال پرستی اور تباہی کو دعوت دیتی ہو۔ بھلا ایک ایسے راگ کو کہ جو انسان کو اتنی بلندی پر لے جاتا ہے اور اتنا طاقتور دکھاتا ہے کہ جبر اس کے آہنی پنجوں کے نیچے چیں بولتا ہے، اس رنگا رنگ انداز کی شاعری کے ساتھ کہ جو مستانہ وار آواز میں گائی جاتی ہے:

من خاکِ کفِ پائے سگِ کوئے ہمانم
کو خاکِ کفِ پائے سگِ کوئے تو باشد

کس طرح یکساں سمجھا جاسکتا ہے اور موسیقی کہہ کر دونوں کو ایک سطح پر لایا جاسکتا ہے؟

اب ہمیں چاہئے کہ ہم تاریخ کی طرف پلٹیں اور لوگوں کی بیداری، ان کے قیام، ان کی وفاشعاری، ان کی ستیزہ جوئی اور روح ایمان و جہاد کے سلسلے میں شیعوں کی ذمہ داری اور شام و بغداد کی خلافت اور ان سے وابستہ حکام و امراء و سلاطین کے خلاف، فوجی، معاشرتی، ثقافتی، مذہبی، اخلاقی اور تمام جہتوں میں جنگ کی صورت پر نظر ڈالیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی بار خلیفہ معاویہ نے ایک ایرانی موسیقار اور گلوکار کو اپنے سبز محل میں ملازم رکھا اور اس کے بعد رومی، ایرانی، اور عرب مطربوں نے خلیفہ کے

محل کارخ کیا اور پھر خلفاء اور اشراف میں اس کا رواج بڑھتا گیا اور اس عزم، عقیدے، حق پرستی اور جہاد کے جذبے میں کمی واقع ہوتی گئی کہ جو صدر اسلام میں مسلمانوں کا طرہ امتیاز تھا۔ معاویہ کی ڈالی ہوئی یہ بنیاد، بنی عباس کے دور میں اپنی بلندی کو پہنچی اور اس نے ساسانی دربار کی تقلید میں افسانوی انداز کی تفریحی رت جگائی کا آغاز کیا اور چین سے لیکر ماوراء النہر اور اسپین تک کی رقاصاؤں اور گلوکاروں نے دار الخلافہ کا رخ کیا۔ رقص شکم اور کنیزوں کے برہنہ ڈانس نے خلیفہ کے شراب و کباب اور مے و مطرب کی محفلوں میں ایک دھوم مچا رکھا تھا۔ اس راہ میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ بغداد جو مرکز اسلام اور پیغمبرؐ کی خلافت کا پایہ تخت تھا ایک افسانوی شہر بن گیا تھا اور قصر خلافت، قصر ہزار و یکشب کے نام سے دنیا میں ایک اساطیری شہرت کا حامل ہو گیا تھا۔ موسیقی، ناچ گانا، اور مے و مطرب (یعنی غنا) اب صرف حکام، سلاطین اور دربار خلفا ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ فطری طور پر لوگوں کے درمیان بھی حیرت انگیز طور پر رائج ہو گیا تھا۔ اس راہ میں حکام کے علاوہ صوفیہ نے بھی بنیادی کردار ادا کیا جن کے خانقاہ غزنوی، سلجوقی، اور مغل سلاطین کے مراکز بن گئے تھے۔ انہوں نے اس رائجہ وبا کو رقص و سماع کا نام دیا۔

ان سب باتوں کو شیعوں کے پر عزم اور آگاہ و بیدار، انقلابی مجاہد رہنما، درد و غم کی تصویر بن کر دیکھ رہے ہیں۔ شہادت اور جہاد کا جذبہ ان کے اندر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ظلم و بربریت کا دکھ انہیں کھا رہا ہے۔ وہ ان تبلیغات اور تلقینات پر نظر رکھے ہوئے ہیں جنہیں خلافت سے وابستہ حکومت پھیلا رہی ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح یہ مذکورہ حکومت ادھر قتل عام کرتی ہے اور ادھر اسی رات، شیعوں کے

امام اور علم و آزادی و تقویٰ کے رہبروں کو اپنے محل کے نیچے واقع ہولناک عقوبت خانوں میں زنجیروں سے جکڑ کر تشدد کے عذاب سے گزارتی ہے اور پھر کس طرح اپنے پر شکوہ افسانوی دالان میں کنیزوں کے رقص، گلو کاروں کی آواز، ساقیوں کی گردش، شاعروں کی مدح و ثناء اور فقیہوں کی توجیہ و تائید کی دھوم ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے صرف درباریوں اور امراء کو اس دھندے میں نہیں لگایا ہے بلکہ عوام کو بھی غنا کے لذت بخش، خواب آور، اور مست کرنے والی آواز سے ایسا بے خود، بے حس، لاابالی، اور غافل کر دیا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہیں اور اپنی سانس کو غنیمت سمجھتے ہیں! علیؑ کی فریادیں، حسینؑ کا لہو، علویوں کا قتل عام، زندانوں میں تلے اوپر بھرے ہوئے مظلوم قیدی، مسلمانوں کی غربت و ذلت، ظلم و ستم اور المئے، ان سب سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ ان سب باتوں کو بھلائے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں: اس دردِ سر میں کون پڑے اور کیوں اپنے آپ کو اس فکر میں ضائع کرے، بس: ؎

یک دست، جام بادہ و یکدست زلف یار
رقصی در این میانہ چو مستانہ آرزوست

ترجمہ: ایک ہاتھ زلفِ یار پہ ہو اور ایک میں جام
ہے آرزو مجھے، اسی مستانہ رقص کی

اور اس اوج غربت و فلاکت میں، ان المیوں کی بھیڑ بھاڑ میں اور اس جہل و جور کی آسماں سوزی میں مے و مطرب کے تھپکیاں دینے والے فریبی ہاتھ خمار آلود لحن میں اس سے کہلوا رہے ہیں: ؎

راہی بزن کہ آہی بر ساز آن توان زد
شعری بخوان کہ با او رطل گران توان زد

ترجمہ: ہو راہ اس طرح کی کہ ساز آہ گھولے
ایسا ہو شعر کوئی، پیمانہ لب کو چھولے

یہ "غنا" ہے۔ یہ سماجی کردار کو تباہ کرنے والی اور غفلت و بے حسی کا شکار بنانے والی شے "غنا" ہے۔ غنا صرف شیعہ فقہ ہی میں نہیں بلکہ تمام با اصول روشن خیال لوگوں میں، ان تمام گروہوں میں کہ جن کی کوئی آئیڈیالوجی ہے اور جنہوں نے عوام کی بیداری اور جہاں کے بھاری بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے، حتی کہ ان کی نظر میں بھی جو فنکار ہیں بلکہ ان موسیقاروں کے نزدیک بھی کہ جو فن کو سماجی اور انسانی مال اور ان کی بالیدگی کے عنوان سے دیکھتے ہیں اور اس کی اہمیت کے قائل ہیں، حرام ہے اور اس کے خلاف جنگ، ان کی سماجی اور اعتقادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افریقہ میں مغربی استعمار (استحصال کی ایک قسم) کا جاز اور ناشائستہ رقص پر تکیہ ہے، اور وہ اس کی تجلیل و توقیر کر رہا ہے تاکہ وہ، سیاہ فام افریقی کو کہ جسے ایک بیدار مجاہد بننا چاہئے ایک مطرب رقاص بنائے اور ہم دیکھتے ہیں سیاہ و سفید میں امتیاز کا قائل امریکہ آخر کیوں افریقیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ کالے بنیادی طور پر ایک اچھی فنکارانہ صلاحیت کی حامل نسل ہے! البتہ فن اور فنکاری سے اس کی مراد رقص و سرور اور غنائی انداز میں جاز کی موسیقی ہے کہ جو مغرب میں افریقی فن کا مظاہرہ کر رہی ہے!

اور یہی وجہ ہے کہ اتحادی لوگ اس ڈر سے کہ کہیں جرمن کی خطرناک حملہ آور

نیشنلزم شکست کے بعد پھر سے جاگ نہ جائے اور جرمن کا جنگجویانہ جذبہ سرے سے مٹ جائے اور وہ اپنے مایہ ناز بہادروں کو فراموش کرے اور شکست کے ساتھ سمجھوتہ کرلے۔ انہوں نے "ایلوس پریسلے" جیسوں کو جرمن نوجوان نسل کا معشوق بنایا ہے۔

غنا، غافل کرنے والی ایک شہوانی موسیقی ہے۔ یہ نظام خلافت میں حکومت کے عملے کا سمبل تھا اور اس کے ذریعے عوام الناس کو سلایا جاتا تھا، شیعوں نے اس کو حرام قرار دیکر حکومتی عملے پر ایک زبردست چوٹ ماری ہے اور اس کے سماج دشمن کردار کو رسوا کیا ہے اور اس کے سامنے مقاومت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

ہر روز عاشورہ، ہر جگہ کربلا اور ہر وقت محرم ہے

میرے دوستوں کی ایک جمات نے جو لوگوں کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے صحرا کے اطراف رہنے والوں کی بستیوں میں گئی تھی مجھے بتایا کہ انہوں نے طالقان کے ایک گاؤں میں ایک مرثیہ خواں گروہ کو دیکھا کہ جس کے پاس ۳۶۰ شبیہیں تھیں۔ یعنی سال کے ہر دن کا ایک تعزیہ تھا اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر حکومت اس کوشش میں ہے کہ وہ شہیدوں کی یاد مٹادے تو ہمارے پاس ہر دن کے لئے ایک مرثیہ لکھا رکھا ہے۔ اگر حکومت کی یہ کوشش ہے کہ عاشورہ بہانہ ہو تو ہم ہر دن کو عاشورہ بنائیں گے اور ہر جگہ کو کربلا۔ اس منزل پر کسی ترقی پسند شخص نے پوچھا تھا، ایک مہینے، دو مہینے کیوں نہیں، تمام سال کیوں؟ اور جواب میں سنا تھا کہ: ہم مار گزیدہ لوگ ہیں، ہم نے غدیر کے معاملے میں خاموشی اختیار کی اور کہا کہ

تاریخ خود کہتی ہے کہ حجتہ الوداع میں (مسلمانوں کے عظیم الشان مجمع میں) ایک ایسی جگہ پر جس کی نشانی آج بھی موجود ہے، ایک ایسے زمانے میں کہ جس میں کوئی ابہام نہیں، خود جناب رسالتمآبؐ نے علیؑ کی رہبری کا اعلان کیا اور ہم نے دیکھا کہ کس طرح ان تمام باتوں کو صاف کر دیا گیا اور کس طرح جڑ سے اسے اڑا دیا گیا، اسی لئے ہم "عاشورہ" کے بارے میں اس غلطی کا ارتکاب نہیں کریں گے اور خوشی میں، غمی میں، شادی میں، عزا میں، پانی پینے میں، کھانا کھانے میں، بھوک میں، پیاس میں، حسینؑ حسینؑ کہیں گے، عاشورہ، عاشورہ کہیں گے، کربلا کربلا کہیں گے تاکہ ہماری نسل اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس بات کو بھول نہ جائیں کہ شیعوں پر کیا گزری ہے اور جان لیں کہ شیعوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ذکر اور ذاکرین

یہ بات کہ شیعہ، عاشورہ کی یاد تازہ کرنے اور انقلاب کا فلسفہ بیان کرنے والوں کو واعظ، مقرر، خطیب، عالم اور فقیہ نہیں بلکہ "ذاکر" کہتے ہیں بلا سبب اور اتفاقی امر نہیں ہے۔

ذاکرین اور ان تمام لوگوں کی سب سے بڑی ذمہ داری، کہ جو ظلم کے خلاف، ان خامہ برداروں کے خلاف کہ جو تاریخ کو مقتدر لوگوں کے حق میں توجیہ کرتے ہیں اور ان تمام تاریخ نویسوں، مصنفوں، مبلغوں، عالموں اور روحانی پیشواؤں کے خلاف بلکہ ان تمام ذرائع کے خلاف لڑتے ہیں جو پامال شدہ حقائق کا ذکر نہیں کرتے اور حادثوں، قتل عام کی وارداتوں اور عظیم الشان ہستیوں سے اور شہادتوں سے چشم پوشی کرتے ہیں اور ہمیشہ کاخ نشینوں اور خراج وصول کرنے والوں کے آگے پیچھے رہتے ہیں

اور ان کی زبان میں بولتے ہیں، ذکر ہے۔ ذکر اس ظلم کا جو وقوع پذیر ہوا، ذکر اس عظیم ترین، تاریخی واقعہ کا جو رونما ہوا، ذکر اس بھاری جرم کا کہ جو خلفاء رسول اللہ کے ہاتھوں اور ان سے وابستہ علماء کے فتوؤں سے سرزد ہوا، اور ذکر اس ظلم و ستم کا کہ جو مسلسل طور پر عوام اور مظلوم طبقہ کے حق میں روا رکھا گیا اور روا رکھا جارہا ہے۔

اسی لئے شیعہ حضرات نے ان مظالم کی یاددہانی کرنے والوں کو کہ جو گزشتہ میں ہوئے اور اب بھی جاری ہیں، "ذاکرین" کا نام دیا ہے تاکہ وہ، وقت بے وقت، ہر جگہ، اور ہر زمانے میں تمہیں یاد دلاتے رہیں کہ کیسے کیسے لوگوں کا خون بہایا گیا اور کیسے کیسے لوگوں کا خون بہایا جارہا ہے تاکہ مذہب، مکتب اور عدالت کی آواز کو دبادیا جائے۔

پس اگر تم مجھے اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہو کہ تم ہم میں سے ہو تو پھر "محمدؐ" کی گفتگو کے ساتھ "علیؑ" کی بات بھی کروگے، ائمہؑ کا ذکر بھی کروگے، قرآن کو شامل کروگے، اور جو کچھ بھی کہوگے، "کربلا" کی سمت گریز لازمی ہوگی جو کچھ بھی کروگے، جو کچھ بھی کہوگے اس پر کربلا کی مہر ہوگی تاکہ اس میں سندیت پیدا ہو اور میں اسے مان لوں۔

...... میں اس محمدؐ کو مانتا ہوں کہ جس کی رسالت عاشورہ میں متجلی ہوتی ہے۔

...... اس نبوت کو تسلیم کرتا ہوں کہ جس کا پیام روز عاشورہ منزلِ کمال پر پہنچتا ہے۔

...... میرا قرآن، وہ کتاب ہے کہ جو کربلا سے متصل ہوتی ہے۔

...... میرا ابراھیمؑ وہ ابراھیمؑ ہے جو حسینؑ سے ملحق ہوجاتا ہے۔

...... میرا اسمٰعیل وہ اسمٰعیل ہے جو حسین کے بیٹے تک پہنچتا ہے۔

میں، بن حسینؑ کسی شخص کو اور کسی چیز کو نہیں مانتا۔ میں نے "حسینؑ وارث

آدم" میں بھی یہ بات کہی ہے کہ جب حسینؑ طواف چھوڑ دیتے ہیں اور حاجیوں کی صف چیر کر باہر آتے ہیں اور دوسرا رخ کرتے ہیں تو پھر تم کیسے طواف کر رہے ہو، کس چیز کے گرد گھوم رہے ہو؟ اگر حسینؑ کی راہ اختیار نہیں کی تو کربلا نہیں پہنچو گے..... بس چکر لگاتے رہو، گھومتے رہو یہاں تک کہ تمہارا سر چکرا جائے۔ اتنا گھومو، اتنا گھومو کہ اگر تمہارے پیروں تلے روغنی بیج ڈال دیئے جائیں تو تم ان سے کئی ملین ٹن تیل برآمد کر لو۔ تمہارے طواف کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور نہیں ہے!

یہی سبب ہے کہ شیعوں کا بنیادی ترین تبلیغی کام "ذکر" ہے۔ اس چیز کی طرف توجہ دلانا ہے جس پر حکمران پردہ ڈالتے اور لوگوں کے ذہنوں سے محو کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے ذاکر اگر خدا، قرآن، اور پیغمبر کی گفتگو کرتا ہے تو اس کا اختتام حسینؑ پر کرتا ہے اور وہ صحرائے کربلا میں آجاتا ہے، اس لئے کہ خدا، قرآن، اور پیغمبر کی سنت کے بارے میں تو ظلم و جور سے بھری، جلاد حکومت بھی گفتگو کرتی ہے۔ حسینؑ حقیقت اور جھوٹ کے درمیان ایک حد فاصل اور جلاد کو شہید سے جدا کرنے والی دیوار ہیں، خاص طور پر ایک ایسے نظام میں جہاں شہید اور جلاد دونوں کی ایک ہی کتاب، ایک ہی پیغمبر اور ایک ہی دین ہو۔

آج شیعوں کی ذمہ داری کیا ہے؟

لیکن اب صفوی دور کی آمد ہوئی ہے۔ یہ خود ذکر اور ذاکرین کے سب سے بڑے اور اصلی مروج ہیں۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے برخلاف وہ نہیں چاہتے کہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات ذہنوں سے ڈھل جائیں بلکہ چاہتے ہیں کہ انہیں ہمیشہ

سے زیادہ یاد دلایا جائے۔

بنی امیہ اور بنی عباس چاہتے تھے کہ لوگ ان واقعات کو بھول جائیں اور ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ ایسا کوئی واقعہ تاریخ میں رونما بھی ہوا تھا۔ مگر صفوی خاندان چاہتا ہے کہ لوگ تاریخ میں بجز اس واقعہ کے اور کچھ نہ دیکھیں۔

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ یہ داستان بھلا دی جائے اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس کے معنی اور مقصد کو مسخ کریں۔ یہ لوگ عاشورہ اور کربلا کی تعظیم و تکریم اور ترویج کے ذریعے کوشاں تھے کہ ان کی معنویت اور مقصدیت ختم ہو جائے اور فقط ان کی ظاہری شکل و صورت باقی رہے۔

کل جب کہ تمام حکومتی عوامل اس کوشش میں تھے کہ یہ سب یادیں فراموش ہو جائیں یہی روشن خیال ذاکرین تھے کہ جو اپنے سارے شعور اور اپنی ساری آگاہی کے ساتھ اس بات کے درپے تھے کہ اس المیہ کی گہرائی اور اسلامی انقلاب کی روح کے نچوڑ اور اس کی عظمت اور بلندی کو یادوں میں بسائے رکھیں اور طاق نسیاں کی نذر نہ ہونے دیں اور آج جبکہ صفویوں نے شیعوں کے تمام سمبل کو اپنا سمبل بنا لیا ہے اور اب انہیں سندی بن شاہک کے زندانوں اور بغداد کے خلیفہ کے قید خانوں کے سمبل کی ضرورت نہیں ہے اور وہ اس کے بغیر، ان قدروں کو مسخ کر رہے ہیں کہ جنہیں ہم نے عظیم ہستیوں کی قربانی کی قیمت پر حاصل کیا ہے تو پھر ترقی پسند شیعوں کی ذمہ داری کیا بنتی ہے؟

اب ہماری ذمہ داری یاد تازہ کرنا نہیں ہے، اس لئے کہ اس کو ہم نے بھلایا ہی کب ہے، اس لئے کہ خلیفہ شیعہ ہو گیا ہے اور وہ انصاف کے متقاضی لوگوں، علی کے

سچے پیروکاروں اور حسینؑ کے چاہنے والوں سے زیادہ ذکر کی منزل میں آتا ہے، روتا ہے، رلاتا ہے، رونے والی صورت بناتا ہے، علیؑ کے دشمنوں پر لعنت بھیجتا ہے اور آل علی کی مدح و منقبت کرتا ہے۔ تشیع پر تکیہ کرنے والے صفوی نظام کے مقابل شیعوں کی کیفیت تو وہی ہے کہ جو اسلام پر تکیہ کرنے والے اموی اور عباسی نظام میں ان کی تھی۔ اشرافیت قریش نے اسلام کا نقاب اوڑھ لیا۔ اور قرآن و سنت کو اپنا شعار بنایا تاکہ علیؑ کا حق پامال اور حسینؑ کی یاد فراموش ہو جائے، یعنی قرآن کی روح اور سنت کا "روٹ" مسخ ہو جائے۔

شیعوں نے مقاصدہ پر تکیہ کیا، اور ذکر پر،

اور اب، صفویوں کی قومی اشرافیت نے تشیع کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور قصیدے اور ذکر کو اپنا شعار بنایا ہے تاکہ "علیؑ کی حقیقت" پامال اور حسینؑ کی فکر فراموش ہو جائے۔

اور جب زور بھی "ذکر" پر تکیہ کرتا ہے تو "ذکر" کا انقلابی کردار ختم ہو جاتا ہے اور "ذاکر" ایک ترقی پسند شخصیت نہیں بلکہ موجود نظام کا ایک تبلیغاتی آلہ کار بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صفوی دور میں "یاد" (ذکر) ذمہ داری نہیں، ذمہ داری "شناخت" (پہچاننا) ہے۔

"واقعہ پیش کرنا" نہیں، "واقعہ کا تجزیہ" ہے، "محبت" نہیں "معرفت" ہے اور بالآخر "صفوی تشیع" کے نظام میں "تشیع مطلق" پر نہیں بلکہ "تشیع علوی" پر تکیہ کرتا ہے۔

اس لئے کہ صفویوں سے پہلے شیعہ جب "محمدؐ" کا نام سنتا تھا تو اسے یہ پوچھنے کا

حق حاصل تھا کہ : "کونسے محمدؐ"؟

اور صفویوں کے بعد شیعہ جب حسینؑ کا ذکر سنتا ہے تو اسے پوچھنا چاہیے کہ :
"کونسے حسین"؟

دفتر سوئم

ڈاکٹر علی شریعتی

تشیع کی ذمہ داری

ترجمہ: سید محمد موسیٰ رضوی

بسمہ اللہ الرحمن الرحیمO

''شیعہ ہونے کی ذمہ داری'' علاوہ ازیں کہ ایک بہت عمیق علمی، فلسفی، اور اعتقادی گفتگو ہے، ایک محقق، مفکر، اور علمی مسائل سے آشنا انسان کے قلمروِ تحقیق میں خود بخود ایک عمومی بحث بھی ہے، کہ ہر وہ شخص جو کسی مکتب۔۔۔ یا مذہب۔۔۔ کا معتقد ہوتا ہے وہ کچھ ذمہ داریوں کو بھی اپنے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور تشیع بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

ہر کوئی، وہ کسی سطح کا کیوں نہ ہو، کسی مکتب یا کسی مذہب سے اس کی وابستگی کیوں نہ ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس سوال کے آگے اپنے آپ کو رکھ کر خود اپنا محاسبہ کرے:

''میرا عقیدہ اور میرا اعتقاد کن ذمہ داریوں کو مجھ سے وابستہ کرتا ہے؟''

خاص کر اس وقت جب مسئلہ تشیع کا ہو اور ذمہ داری زیادہ بھاری اور سخت ہو۔ اس لئے کہ اسلام میں سارے بھائیوں کے مذاہب کی نسبت شیعہ مذہب کی ایک خصوصیت، ایمان کی تعریف ہے۔

تشیع میں ایمان کی تعریف:

شیعہ دانشور ایمان کی تعریف میں، دل سے ایمان اور زبان سے اقرار کے علاوہ، عمل اور اجراء کی شرط۔۔۔ اور بنا بہ اصطلاح۔۔۔ عمل بہ اعضاء و جوارح۔۔۔ کا

بھی اضافہ کرتے ہیں کہ جو اصلِ ''اصالتِ عمل'' ہے، یعنی جس طرح فلسفہ میں ''اگزسٹنسلیسٹ''، اصلِ ''پراکسیس'' (PRAXIS) ہے اسی طرح عمل، واقعیت اور حقیقت کو وجود میں لانے والا ہے اور عمل کے بغیر کسی چیز پر ایمان اور عدم ایمان برابر ہے۔ عمل بنا مومن ہونا، کافر اور منکر ہونے کے مترادف ہے، اس لئے کہ فن اگزسٹنسلیسٹ کے ایک ناقد ''Regrille'' کے بقول: اعلیٰ درجہ کے باہنر افراد ان آثار میں جن کو انہوں نے ابھی وجود نہیں بخشا ہے، بے ہنروں کے برابر ہیں''۔ مثلاً فردوسی اور مولوی کہ جو شاہنامے اور مثنوی کو وجود بخشنے کے عمل میں ہنرمند اور شاعر ہیں، ان آثار میں جن کو انہوں نے جنم نہیں دیا ہے دوسروں کے مساوی ہیں حتیٰ ان لوگوں کے مساوی ہیں جو پڑھنے اور لکھنے سے عاجز ہیں، اور ہماری ذہنیت یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو ہنرمند اور شاعر کہتے ہیں کہ جو لوگ تخلیق و آفرینش کے عمل میں باہنر نہیں ہیں۔۔۔ یعنی عمل نہیں کر رہے ہیں۔۔۔

وہ ترقی پسند اور آگاہ روشن خیال آدمی کہ جو جانتا ہے اور عمل نہیں کرتا، اس غیر ترقی یافتہ، خواب آلود، جاہل آدمی کے برابر ہے جو نہیں جانتا، کہ اس پر عمل کرے۔ وہ شخص کہ جو سارے سماجی مسائل کو بہت عمدہ طریقہ سے عالمانہ روش کے ساتھ تجزیہ کرتا ہے لیکن ہر سماجی ذمہ داری کی مسؤلیت سے منہ موڑتا ہے اس شخص جیسا ہے جو سرے سے نہیں جانتا کہ سماج کیا ہے، اس کی شخصیت صرف وجودی حیثیت کی حامل ہوتی ہے، اس لئے کہ ''برا'' اور ''اچھا''، ''ایمان اور کفر'' اور ''شیعہ ہونا'' اور ''شیعہ نہ ہونا''، عمل کے بعد ثابت ہوتا ہے۔

شیعہ دانشور، اس اضافی اصل۔۔۔ اصالت عمل۔۔۔ کے ساتھ اس بات کو

منظر پر لاتے ہیں کہ تشیع کا اصلی نقطۂ نظر، کس حد تک مسئولیت کے لئے، اصالت کا قائل ہے۔ ایک ایسی اصالت کہ جو فریضہ اور تکلیف سے بالاتر ہے۔ یہ وہ اصالت ہے کہ جو ''تشیع'' کی ذات میں پوشیدہ ہے نہ کہ وہ فریضہ جس کی انجام دہی شیعہ ہونے کے بعد ضروری ہوتی ہے۔

مسئولیت

آج دنیا میں بنیادی طور پر جو بحث چل رہی ہے اس نے مسئولیت کے مسئلہ کو اس مفہوم سے کہیں زیادہ اہمیت اور گہرائی بخشی ہے جسے ہم فارسی میں بولتے ہیں۔

''مسئولیت'' کی اصالت یا ''ہنر مند کی آزادی'' پر اصلِ اعتقاد دنیا کے دو بلاکوں کے درمیان ایک بڑے ٹکراؤ کا سبب بنی ہے۔ کیا ہنر مند وہ ہے کہ جو مجرد ہنری اقدار کو جس طرح کہ وہ خود سوچتا ہے اور اس معیار کی اساس پر جسے وہ خود پسند کرتا ہے، تخلیق کرتا ہے یا وہ تخلیق کار ہے کہ جو اپنے ہنری اثر یا اپنے شاہکار کو ماہیت دینے سے پہلے اپنے آپ کو کسی فرض کی انجام دہی کے لئے مسئول قرار دیتا ہے اور اپنے اثر کو اس ہدف تک پہنچنے کے لئے وسیلہ گردانتا ہے جسے وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے؟

ان دو مختلف تعریفوں نے دنیا کے دانشوروں اور مفکروں، خاص طور پر ہنر مندوں اور مصنفوں کو دو متضاد بلاکوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اصلِ ''ہنر برائے ہنر'' کو ہنر برائے انسان اور برائے ترقی ونجات وآزادی انسان وسماج قرار دیا ہے۔

کیا ''علم'' خود علم کے لئے ہے یا وہ انسانوں، عامة الناس اور بشری

معاشروں کی احتیاجات کو پورا کرنے اور ان کی سیوا کے لئے ہے؟

کیا وہ شخص شاعر ہے جو عناصر کلام کے ساتھ ایک خوبصورت قطعہ لکھتا ہے اور ایک ایسا تاثر تخلیق کرتا ہے کہ جو کسی احساس کو ابھارے؟ یا شاعر وہ ہے جو اپنے تمام قوتِ بیان کو کلام میں لاتا ہے تاکہ نوع بشر کو اپنے مقاصد تک پہنچانے ۔۔۔ اور انہیں ان کی زندگی، ان کے احساس، ان کی مسئولیتوں اور ان کی سرگزشت و سرنوشت کی ناہنجاریوں سے آگاہی بخشنے ۔۔۔ میں ان کی مدد کرے؟ ان میں سے کس میں واقعیت ہے؟

"نطشے" کے قول سے، ایک جملے میں اپنی بات عرض کروں: "ہنر برائے ہنر"، "علم برائے علم" اور "شعر برائے شعر" ہنرمند کے "لاش ہونے" کو چھپانے اور سماجی ذمہ داریوں سے اس کے گریز کو ۔۔۔ آبرومندانہ ۔۔۔ صورت دینے کے لئے ایک فریب ہے!

المیہ کی صورت گری

بیسویں صدی میں ایک بہت بڑے المیہ کو بڑی گہرائی اور بڑی ہنرمندی سے معرض وجود میں لایا گیا اور علم نے مذہب، مکتب، آئیڈیالوجی اور حق و باطل کے اثبات وانکار کی خاطر نہیں بلکہ خود علم کی خاطر اہمیت حاصل کی۔ میں یہاں "اپنی سماجیاتی سماجیات" کو وسیلہ نہیں بنا رہا ہوں تاکہ لوگوں کے لئے مکتب سازی کروں، ان کے سامنے ایک راہِ حل رکھوں اور اپنی سماجیاتی علمی آگاہیوں کے ذریعے ان کو ان کی رہائی

اور نجات کا راستہ دکھاؤں......اس لئے کہ سماجیات کوئی تیکنیک نہیں جو راہِ حل بتائے، کوئی پیغمبر نہیں جو ہدایت کرے اور نہ ہی وہ کسی ہدف یا کسی مکتب کے اثبات و انکار کا مسئول ہے۔ سماجیات کا کام اس دائرہ میں محدود ہے کہ وہ سماج میں کسی واقعیت --- یا واقعیت کو بنام سماج --- تجزیہ کی منزل پر لائے، اسے --- اینیلائز --- کرے۔ صرف یہ بتائے کہ دنیا میں جو نوظہور چیزیں آرہی ہیں ان کے عواقب یہ ہوں گے، اور معاشرے کی جو حالت ہے وہ ان عوامل یا ان علل کے اسباب ہیں اور اگر اس سے راہ نجات کے بارے میں پوچھا جائے، تو وہ کہے گا: رہنمائی میری ذمہ داری نہیں ہے یہ فلسفے، آئیڈیالوجی اور مذہب کا کام ہے......اور اگر تم اس سے عالِم کے بارے میں پوچھو گے تو تمہیں یہی جواب ملے گا: جو بات تم پوچھ رہے ہو وہ علم کو خاص اہداف کا خادم بناتا ہے جبکہ علم آزاد ہے!

اگر تم نے سماجیات سے یہ پوچھ لیا کہ سماجیات کو سرمایہ داری جنم دیتی ہے یا غیر سرمایہ داری؟ تو تم جواب میں سنو گے کہ: ان باتوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف یہ بتاؤنگا کہ سرمایہ داری کس طرح کا "فنومنا" (Phenomena) ہے، یہ کیسے وجود میں آئی اور اس میں کیسے انقلابات رونما ہوئے، اور اس کی کتنی قسمیں ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ یہ اچھی ہے یا بری، اسے رہنے دیا جانا چاہئے یا اجاڑ دینا چاہئے، اس سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں بھوک کا تجزیہ کرسکتا ہوں لیکن اس بات کی نشاندہی کہ بھوکوں کو کس طرح سیر کیا جائے، میرا کام نہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح آزادی، عدم وابستگی، عالِم کی مسئولیت اور "علمی حقیقت" کے خوبصورت سرپوش تلے اور "دانش و دانشمند کی آزادی کے نعرے

کے ساتھ نوع بشر کی جماعتوں اور ان معاشروں کو کہ جو ناہنجاریوں، بے جا ترجیحات، اور تضاد و ٹکراؤ سے دکھ جھیل رہے ہیں اور نجات کی تلاش میں ہیں، ان آگاہیوں، ضیا پاشیوں، اور اعانت سے محروم کر رہے ہیں جنہیں علم ۔۔۔ اور خاص طور سے سماجیات ۔۔۔ انہیں دے سکتا ہے؟

اس صورت میں علم لوگوں کی خدمت نہیں کر رہا ہے۔ فزکس کا عالم صرف حقائق عالم کو دریافت کرنا چاہ رہا ہے۔ ماہر سماجیات صرف سماجی واقعیتوں کے تجزیے کے درپے ہے اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی کام نہیں ہے۔ اور یہی حال نفسیات، معاشیات اور تعلیم و تربیت...... کا بھی ہے۔

جب علم لوگوں کی دسترس سے دور ہو جائے اور لوگوں کی ہدات سے منہ موڑ کر، تنہا، الگ تھلگ، پارسا اور گوشہ نشین ہو جائے تو ایسا تر نوالہ ہو جاتا ہے کہ بڑی آسانی سے حکومتوں کے ہتھے چڑھتا ہے، جس طرح کہ آج آئیڈیالوجی ۔۔۔ اور ہر مذہب و مکتب ۔۔۔ کے پیرائے سے آزاد علم، سب سے زیادہ ان لوگوں کے اختیار میں ہے جو عوام کے دشمن ہیں، جو ہدف و ایمان و نجات بشریت کے دشمن ہیں۔

''ہنر کو ہنر کے لئے پسند کرو'' یعنی لوگوں کو مجرد زیبائیوں اور لذتوں میں مصروف کرو اور ہنر کو نیز اس طرح کی ذوقی خوش طبعی کے کام میں لگاؤ تاکہ صرف وہ لوگ اس سے محظوظ ہوں جو سماجی اور مادی رفاہ میں بسر اوقات کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے فارغ وقت کو ہنری سرگرمیوں میں صرف کریں۔ مختصر یہ کہ اس میں وہ لوگ آتے ہیں جو صاحبان زور و زر ہیں، جو نیلاموں اور گیلریوں میں مہنگے داموں کی پینٹنگز خریدتے ہیں تاکہ دور دور تک ان کے نام کا چرچا ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے

پاس ہنر میں صرف پیسہ اور مکر وفریب ہے!

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ "ہنر برائے ہنر"، "ہنر برائے عیش واشرافیت" میں بدل جاتا ہے۔ ایسے فن پارے جو دل کی خواہش پر بنتے ہیں اور لوگوں کی پسند وناپسند کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا اور اس پر نظر نہیں کی جاتی کہ یہ لوگوں کے کام آئے گا یا نہیں وہ صرف اور صرف نیلاموں اور ٹینڈروں کے منہ کی غذا ہوتے ہیں اور ارب پتیوں کے گھر کی زینت بنتے ہیں۔

علم، ادب اور شعر و ہنر سے سلب مسئولیت، بشریت پر مسلط طاقتوں کا اصلِ فریب ہے تاکہ وہ نوع بشر کو عظیم ترین سرمایوں ...... اور نجات و رفاہ و ترقی کے عوامل سے محروم کریں، اور دانشمندوں اور ہنر مندوں کو ۔۔۔ کہ جو بشری زندگی کے لئے بلند ترین سرمایہ ہیں ۔۔۔ معاشرے کے بیچ سے نکال کر انہیں تجربہ گاہوں اور در بستہ (closed) دانشگاہوں میں محصور کریں، اور ایک طرح کی آبرومندانہ پارسائی سے انہیں اپنے مفاد میں استعمال کریں۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں لفنگانہ ڈکٹیٹری کے دور میں تنہائی، عزلت گزینی، منفی پارسائی، سنیاسی گری، اور جماعتی صورت میں گوشہ نشینی کی اتنی ترویج ہوتی ہے تاکہ معاشرہ اپنی بہترین اور پاک ترین روح کو نہ دیکھے اور وہ سب کے سب گھروں، اور غاروں کے کونے کھانچوں اور بے دلیل کی رھبانیت میں پڑے سڑتے رہیں تاکہ وہ لوگ جو عوام کی گردنوں پر سوار ہیں اور لوٹ کھسوٹ اور غارتگری میں ہمہ تن مصروف ہیں، صرف ان عوام کالانعام سے سروکار رکھیں جو اپنی بہترین سوچوں اور پاک ترین جذبوں سے خالی ہیں۔

اسلام میں مسئول
علم و ادب و ہنر

شاید ''مسئولیت'' کا لفظ اور اس کی تعبیر نئی ہو، لیکن اسلام کے جان و دل اور اس کے رہبروں کا علم و ادب و ہنر ۔۔۔ اور حتیٰ شعر ۔۔۔ پر جو تکیہ ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو آج دنیا میں دیکھنے میں آرہا ہے، مسئولیت کے مسئلہ کو پیش کیے بغیر جو تناقضات اور تضادات ہمارے محسوسات میں جنم لے رہے ہیں وہ علم و ہنر و شعر و فکر و تحقیق پر اسلام کی تاکید و اصرار و حمایت کے درخشاں ترین اور بنیادی ترین معیار و میزان ہیں کہ جو علم و ہنر کی ممکنہ صورت کو ایمان اور سماج کی خدمت میں جانتے ہیں اور اس کے مخالف شکل کی شدت سے نفی کرتے ہیں۔

دور جہالیت کے اشعار، ''ہنر برائے ہنر'' اور ''شعر برائے شعر'' ہیں، امرؤالقیس ۔۔۔ اور معلقات سبعہ ۔۔۔ کے سارے اشعار کہ جن کا شمار آج بھی دنیا کے خوبصورت ترین قصائد میں ہوتا ہے ''شعر برائے شعر'' کے معیار پر ضبط تحریر میں آئے ہیں، لیکن اسلام نے (جس میں قرآن نے صراحت کے ساتھ ۔۔۔ ''والشعراء یتبعهم الغاوون''☆ کہہ کر ۔۔۔ اور مسلمانوں نے عملی اور نظری اعتبار سے) اس پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر اس میں سر اٹھانے کی سکت باقی نہیں رہی اور اسلام کے بعد بھی ۔۔۔ بقول طٰہٰ حسین ۔۔۔ دور جاہلیت کے شعراء نے شعر

☆......شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں (سورہ شعراء ۲۲۴)

برائے شعر کہنا نہیں چھوڑا، لیکن اسلام کی منطق کے آگے وہ اشرافیوں کے زربفت چولے سے سر باہر نہ نکال سکے۔ لیکن یہ لوگ کہ جو اب جاہلی دور کے شعراء کہلاتے ہیں حقیقت میں جاہلی شعراء نہیں تھے بلکہ مسلمان شعراء تھے کہ جنہوں نے شعر کو شعر کے لئے لکھا، اور روحِ اسلام نے ان کی نفی کی اور رسالتمآبؐ نے فرمایا:

شعر سے بھرے دل سے بہتر ہے کہ انسان کا دل پیپ سے بھرا ہو۔ ☆

وہ مذہب جو اتنی شدت سے اور اتنی بری تعبیرات سے شعر اور شاعر پر حملہ کرتا ہے دوسری طرف سے اس طرح شعر کی حمایت کرتا ہے کہ جو نا قابل یقین ہے۔

حسان بن ثابت ایک ایسا شاعر ہے کہ جس کا کام سوائے شاعری کے اور کچھ نہیں۔ خندق کی لڑائی میں کہ جہاں سارے مجاہدین، شہر سے باہر، خندق کے قریب دشمن سے برسرِ پیکار ہیں اور عورتیں حصار کے اندر بیٹھی ہیں اور ان ہی کے درمیان "حسان" بھی ہے، ایسے میں جب عبد المطلب کی صاحبزادی "صفیہ"۔۔۔ بنی قریظہ کے۔۔۔ ایک یہودی کو خندق کے اندر جاسوسی کے عمل میں دیکھتی ہے اور حسان سے کہتی ہے کہ جا کر اس کا پیچھا کرے تو وہ یہ جواب سنتی ہے کہ:

"اگر شعر کی بات کرو تو یہ میرے بس میں ہے مگر یہ کام......!" اور پھر صفیہ نیچے جا کر نیزے کے وار سے اس کا قصہ تمام کرتی ہے اور اوپر آ کر حسان سے کہتی ہے تم مرد ہو، جاؤ اور اس کے لباس کو مال غنیمت میں لے لو، تو سنتی ہے: "ہاں، یہ کام البتہ میں کرونگا!"

یہی شاعر، حسان، رسول خداؐ سے ایسی جلالت و عظمت پاتا ہے کہ کسی شہید یا مجاہد

☆......لیمتلی قلب الرجل قیحاً خیر من ان یکون شعرا.

کے حصے میں یہ بات نہیں آتی ہے۔ پہلے تو یہ کہ حاکمِ مصر نے ''ماریہ'' اور ''سیرین'' نامی جن دو کنیزوں کو رسول خداؐ کے لئے بھیجا تھا ان میں سے ماریہ کو وہ خود اپنے نکاح میں لیتے ہیں۔۔۔ کہ ''ابراہیم'' ان ہی سے ہیں۔۔۔ اور ''سیرین'' کو حسّان کے حوالے کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اشراف میں سے کسی نے مدینہ کے اطراف واقع، خوشگوار کوہستانی علاقے کی جو کوٹھی رسول خداؐ کو ہدیہ کی تھی، اس واحد کوٹھی کو وہ حسّان کی ملکیت میں دیتے ہیں، حالانکہ یہ وہ جگہ تھی جہاں رہنے کی آپ آرزو کرتے تھے۔☆ اور پھر ایک بار آپ نے کعب بن زہیر کے اشعار کے صلے میں اپنی عبا اتار کر کعب کو پہنا دی تھی۔

اور یہی پیغمبرؐ ہیں جو کہتے کہ ''پیپ''، ''شعر'' سے بہتر ہے۔ فرماتے ہیں: ''وان من الشعر لحکمۃ''، اور ایک دفعہ حسّان کے ایک شعر پر آپ نے فرمایا: ''انما نفث روح القدس علی لسانک'' بلاشبہ روح القدس نے تمہاری زبان پر اتارا ہے۔

ہنر کی اتنی ستائش اس مذہب کی جانب سے کہ جو اس قدر شعر اور شاعری کی مذمت کرتا ہے، وہ بھی اس شخص کے لئے کہ جس کا ہنر صرف اور صرف شعر ہے۔ اس تحدید

☆...... ''عقیق'' مدینہ کے اطراف واقع ایک نہایت خوشگوار آب و ہوا والی وادی ہے۔ ایک دن جناب رسالتمآبؐ کو وہاں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ آپ کو وہاں کی ہوا اور وہاں کا خوبصورت منظر بہت پسند آیا تھا۔ جب وہ شہر واپس آئے اور گارے سے بنے ہوئے کمروں سے ہوتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔۔۔ کہ جہاں ان کی پوری زندگی کا سامان تھا۔۔۔ تو حضرت عائشہ سے کہا: کیا ہی اچھا ہوتا جو ''عقیق'' میں ہمارا کوئی گھر ہوتا! حضرت عائشہ نے چاہا کہ وہاں زمین کا کوئی ٹکڑا خرید کر اس پر مکان تعمیر کرائے! رسول خداؐ نے فرمایا: نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا اس لئے کہ وہاں کی ساری زمینیں لوگوں نے لے لیں ہیں!

اور اس تائید کے تجزیہ میں صرف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ رسول خداؐ اس شعر کے آڑے آتے ہیں جو غیر مسئول ہے، جو ذاتی شوق کے لئے ہے، جو فردی احساسات کو سمیٹے ہوئے ہے اور جو اشرافیت کے لئے ہے۔۔۔ آپ جاہلی دور کے اشعار کو دیکھ لیجئے۔۔۔ پیغمبرؐ اس شاعری کے سامنے کھڑے ہوتے اور اس قدر لڑتے ہیں کہ اس کی نسل ختم ہو جاتی ہے۔ مگر بعد میں جب خلفاء آتے ہیں تو تماشے بازی، حاجب سازی، اور شاعر پرور حکومتوں کا آغاز ہوتا ہے یہاں تک کہ سلطان محمود غزنوی جیسا آدمی ۴۵ ہزار شعراء کو اپنے دربار میں پالتا ہے۔

جو شعر رسول اسلام کی حمایت کا حامل ہوتا ہے، ایک مسئول اور ذمہ دار شعر ہے اور وہ لوگوں کے ہدف، ان کے آئیڈیل اور ان کی نجات و آزادی کی راہ میں ہوتا ہے۔

پس تمہیں چاہئے کہ تم ایک شاعر اور ہنرمند کے عنوان سے اپنی اور قوم کی ذمہ داری اور اپنی اعتقادیت کی سرحدوں کو واضح کرو۔ اس لئے کہ آزاد ہنرمند، ایک فریب ہے اور بس۔ یا ضروری ہے کہ تم عوام میں شامل ہو جاؤ اور ان کی نجات پر اپنی کمر کس لو یا پھر ان کے اور فضیلت و آزادی کے دشمنوں میں اپنا نام لکھواؤ...... اس کے علاوہ اور کوئی تیسری راہ نہیں ہے۔

اور دیکھئے کہ صاحبان قلم اور ہنرمندوں کے کاندھوں سے ذمہ داری کا بوجھ اتارنے کے لئے کتنی کوششیں ہوئی ہیں۔۔۔ اور ہو رہی ہیں۔۔۔ اور اگر اسوقت تبصرہ کا موقع ہوتا تو ہم دیکھتے کہ ہماری ساری پریشانیاں اور ساری بدبختیاں براہ راست اس دلیل پر نہیں کہ یہ ساری طاقتیں اور علمی اور ہنری آثار لوگوں کے لئے

نہیں ہیں تو کم از کم یہ تو ہے کہ اگر یہ انسانی مسئولیت کے حامل ہوتے تو ان کی سرنوشت اور طرح کی ہوتی۔

جب سے اسلام رخصت ہوا اور صرف مسلمان رہ گئے تو ہمارے مومنین اور ہماری دینی شخصیتوں نے بھی اسلام کی اس روح اور اس کی جہت کی بینائی کو کھودیا اور انفرادی احکام اور شعائر کو فہم میں اتارا، وہ اس بات پر خوش تھے کہ سلطان محمود غزنوی ہندوستان کے غیر مسلموں سے لڑنے جارہا ہے، ......"سلطان خدا بندہ" شیعہ ہورہا ہے، اور مغل ملکہ خانم گوہر شاد مسجد کی تعمیر کررہی ہے۔ اس سے اوپر کی بات ان کے فہم میں نہیں آرہی تھی۔ بس یہی کہ فلاں سرکش، خودسر، لفنگا......اپنی فرعونی زندگی، اپنے رویہ اور اپنی حکومت کو جوں کا توں رکھتے ہوئے ختنہ کرے اور ظاہری ضوابط و تشریفات کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوجائے اور بے ضرر شعائر کی تعظیم سے رشتہ جوڑے اور اپنی غارتگری کو جہاد کا نام دے، یزید سے بدتر اعمال بجالائے اور حسینؑ کی مجلس برپا کرے۔ ان باتوں سے مومنین کے دل شاد، اور اسلام آباد ہوتا تھا۔

یہی طاقتیں تھیں کہ جو شاعروں اور نگارندوں کو اپنے کھور پر باندھتی اور ان کی پرورش کرتی تھیں۔ اور اس کا حاصل یہ ہوا کہ وہ ڈھیر سارے قصیدے، غزلیں، قطعے، مثنویاں، رباعیاں، ترجیع بند اور مستزاد وغیرہ کہ جو اس قوم اور اس ثقافت کی زیبا آفریں طاقت اور ہنری فطانت کا ثمرہ تھیں، عوام کے معمولی سے کام تک نہ آئے۔ ان میں یا ممدوح کی مدح میں قصیدے تھے یا پھر معشوق کی تعریف میں غزل۔ وہ لوگ بھی جنہوں نے دنیا سے کنارہ اور طاقتوں سے ترک تعلق کرلیا تھا پھر بھی لوگوں کے دکھ، درد، اور ان کی ضرورتوں کے درپے نہیں ہوئے تھے اور زہد و تقویٰ و عرفان

کے گوشہ خلوت میں گھس بیٹھ کر اپنے آپ سے گفتگو میں مشغول تھے اور اپنے دل سے آپ باتیں کرتے اور راتوں کو صبح تک بیٹھ کر تارے گنتے تھے اور استغراق کے عالم میں لوگوں کو ان کی پست دنیا کے ساتھ چھوڑ کر سطح خاک سے پرواز کرتے تھے اور اس طرح اپنی روحانی معراج کے ساتھ پرلوک پہنچ کر عملیات میں مشغول ہو جاتے تھے۔

میں اس عنوان سے کہ طبقاتی اعتبار سے اس ملک کا ایک دیہاتی باشندہ ہوں ۔۔۔ یا کم از کم رہا ہوں ۔۔۔ دیکھتا تھا کہ ان ہی لمحوں میں جب غریب کسان اپنی ساری عمر کو زمیندار کی عیاشیوں میں گنواتا تھا اور اپنی ناموس کو خان زادوں کے ہاتھوں کا کھلونا بناتا تھا۔ اور اس کا وجود خان کے کوڑے سہنے اور اس کے کام کو انجام دینے کے لئے تھا، ہمارے حساس شعرا احساسات سے لبریز اہل فن اور اعلیٰ سطح کے صاحبان قلم، تہران کے انتہائی موقر و محترم! انجمنوں میں کیسے عظیم آثار کی تخلیق میں مصروف تھے! ان کا سارا دکھ وہ قافیہ تھا جو صحیح جگہ جا بیٹھے اور اپنے ہمردیفوں کے ''اعد''، ''اعد'' کی آواز نکالے۔ اور ہمارے پایہ کے محقق و دانشور حضرات نے ۔۔۔ بقول خود ان کے ۔۔۔ اسی دور میں ۱۵ سال مسلسل کوشش کی اور گزشتہ ہزار سال کے سارے اسلامی اور ادبی متون کو چھان مارا اور اس ہیجان انگیز نتیجہ پر پہنچے کہ ''زلیخا'' کا لفظ کسی قدیم متن میں موجود نہیں ہے!!

اب بھی آپ ہمارے آرٹس کالج کے رسالوں کو دیکھئے، ہماری تحقیق کا ڈھنگ اسی روش پر قائم ہے۔ جس روش پر اڈورڈ براؤن اور قزوینی کے ادوار میں قائم تھا بلکہ اس کی روح اور اس کی بصیرت اس سے بھی زیادہ قدیم ہے، یہ ''سیبویہ'' کی میراث ہے کہ جس کی حسرت ایک عمر کی تحقیق کے بعد دم مرگ یہ تھی کہ: ''مت و فی قلبی

شائبہ حتی" (میں اپنے دل میں یہ شائبہ وابہام لے کر مر رہا ہوں کہ "حتی" کا لفظ، حرف کسر تھا؟ اسم تھا؟ کیا تھا؟)

ادبیات کے اس بڑے دکھ اور اس غیر مسئول تحقیق کو آپ نے ملاحظہ فرمایا؟!

اخلاق اور انسانی اصولوں کے پابند، کم وبیش مذہبی اور گراں قدر قدما اور تھے، جدید کیفے ٹیریاز کے زلفوں والے نئے امواج، آج آپ کے سامنے ہیں۔ اشعار میں نیا اور ہمارے ادبی انقلابیوں کا اساسی کام یہ نہیں تھا کہ انہوں نے وزن کو توڑا اور بات کو قافیہ کے مکرر قید سے آزاد کیا بلکہ یہ تھا کہ انہوں نے شاعر کے احساس ونگاہ میں تبدیلی پیدا کی اور اس خدائی زبان کو بلند حصاروں کی قید سے گلی کوچوں میں لے آئے، اور اتنی قوت اور اتنی کامیابی کے ساتھ کہ گویا بنیادی طور پر نیائی شعر کے قالب میں اب کوئی مدح سرائی نہیں کرسکتا!

محمد حجازی اور علی دشتی جیسے نرم دل اور جذباتی صاحب قلم کا کہ جن کی آنکھوں کو زمین پر گرا ہوا وہ پتا نمناک کرتا ہے جس پر خزاں کی ہوا نے ستم ڈھا کر اسے تاراج کیا ہے، صرف ایک بار از راہ اتفاق ہمارے گاؤں "مزینان" سے گزر ہوتا ہے اور ہمیں بڑی خوشی اور ساتھ میں حیرانی ہوتی ہے کہ تہران کے بلند پایہ ادباء اور صاحبان قلم نے اپنی ادبی گرم محافل کو چھوڑ کر اس چھوٹی سی بستی میں قدم رکھا ہے اور "فتنہ کی آنکھ"، "حسین چہرے"، ممدوح کے دست ودل اور معشوق کی ناز وادا سے کچھ دیر فارغ ہوکر ہم صحرا کے جھلسے ہوئے لوگوں اور کام، بھوک، اور دکھ کے مارے ہوؤں کی خبر گیری کے لئے آئے ہیں؟!

لیکن انہوں نے نہ ہماری بھوک کو محسوس کیا، نہ ہمارے دکھ دیکھے، نہ تازیانوں کی

آواز سنی اور نہ ہماری زندگیوں پر نظر کی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ صرف اور صرف ایک ''زیبا'' خانم کی جستجو میں یہاں آئے تھے جو نہ جانے کہاں سے ہمارے گاؤں میں ٹپک پڑی تھی اور کہانی پھر وہی ''زیبا'' اعضاء کے پست قصے اور شیخ حسین مزیتانی ہے!

(حجازی کے ''زیبا'' کو مطالعہ فرمائیے)۔

یہ ہے غیر مسئول صاحب قلم، اور یہ ہے وہ المیہ جسے ''ہنر برائے ہنر'' بناتا ہے کہ جو نہ صرف ہنر کو انسان کی خدمت سے آزاد کرتا ہے بلکہ اسے انسان دشمن، اور انسانی انحطاط کے کاموں پر مامور کرتا ہے۔

صورت یہ ہے کہ آج کل ہنر عبارت ہے ان غذاؤں سے کہ جنہیں اہل ہنر ان لوگوں کے لئے تیار کرتے ہیں کہ جو نہیں جانتے کہ سیری کے بعد اور کیا کھائیں اور اپنا وقت کس طرح گزاریں؟ ہمارے لکھنے والے جنسی اور جرائی خوراکوں، ذہنی سرگرمیوں اور فکری فاسد خیالوں کو ان لوگوں کے لئے مرتب کرتے ہیں کہ جو مادی زندگی سے فارغ اپنے فراغت کے اوقات کو کسی شغل میں گزارنے اور اپنی مہمل زندگی کو پُر کرنے کی سوچ میں رہتے ہیں!

اور علماء کی دانشگاہی تحقیقات کا عوام اور ان کی سرنوشت کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یہ لوگ حقیقتِ علم! کی خاطر عظیم ترین ذرائع کو انسان دشمنوں کے حوالے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہنر پینٹنگ، موسیقی اور علم و شعر و ادب و تکنیک و فزکس کی اتنی پیشرفت سے عوام الناس کو کچھ حاصل نہیں گو کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جن کی زندگی میں بہتری آئی ہے لیکن یہ سب اہل، مصرف ہیں، تخلیق کار نہیں۔

مذہب برائے مذہب

''ہنر برائے ہنر''، ''علم برائے علم'' اور ''مذہب برائے مذہب''۔ اگر ''ہنر برائے ہنر''، ہنر کی عظمت، اور علم برائے علم، علم کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے اور ان کو انسان کی خدمت کے لئے وقف کرنا علم و ہنر کی تحقیر ہے، تو مذہب برائے مذہب بھی مذہب کو اصالت دینے سے عبارت ہے اور کمال انسان کے لئے اسے وسیلہ بنانا بھی مذہب کی تحقیر ہے!!

لیکن اس طرح کی عامیانہ اور عوام فریبانہ عظمت میں اور اس جھوٹے جلال کی تہ میں، مذہب کی حقیقت و حیات، منجمد اور معطل ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح علم و ہنر کی حیات و حقیقت موقوف و منجمد ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب، مذہبی شعائر، دینی مراسم، عبادات، سنن، اور حتیٰ مخارج اور مذہبی اظہار احساسات، اسلام اور عیسائیت دونوں میں گزشتہ سے بیشتر ہے۔ مسجد نبوی کو ان مساجد سے موازنہ کیجئے کہ جن میں سے ہر ایک سونے، سرمایے اور ذوق و نبوغ و ہنر کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔ یہ مسجد کی عظمت ہے مگر درحقیقت مسجد کو معنویت سے خالی کرنا ہے۔

مذہب، مذہب کے لئے، نماز، نماز کے لئے۔ روزہ، روزے کے لئے۔ حب علی، حب علی کے لئے۔ اور قران، قرآن کے لئے ...... یعنی: علیؑ، قرآن، روزے، نماز، تشیع، اور اسلام کو عظمت دینا لیکن مصرف سے گرانا ہے۔ یعنی اس

چیز کو جو وسیلہ نجات ہے، طاقچہ اور سونے کے قاب میں رکھنا اور اس کے آگے جھکنا، سجدہ کرنا، اور تعظیم و تجلیل کرنا بغیر اس کے کہ اس سے کسی درد کی دوا ہو۔

یہ ہے مذہب برائے مذہب!

مذہب یعنی ''راستہ''

مذہب اور وہ سارے مشابہ اصطلاحات کہ جو اسلامی اور ابراہیمی ثقافت میں دینی احساس کو برملا کرتے ہیں ۔۔۔ لاتین میں اس کے مشابہ اصطلاح کے برخلاف ☆۔۔۔راستے کے مفہوم میں ہیں۔

مسلک، ''Sentine'' کی طرح پیچ وخمدار کوہستانی راستے ہیں۔ طریقت، سفری راستوں کی طرح ایک علاقہ سے دوسرے علاقے جانے والی راہ ہے۔ شریعت، پانی کا راستہ ہے، وہ راستہ کہ جو دریا کے بلند کنارے سے سطح آب تک نیچے آتا ہے، تاکہ پانی کا حصول ممکن ہو اور پانی کی طلب میں آنے والے ضرورتمند کا ہاتھ اس تک پہنچ سکے ☆☆۔

لغت میں، صراط۔۔۔ اپنے پہلے مفہوم میں۔۔۔ وہ راستہ ہے جو معبد کی طرف جاتا ہے۔

مذہب نیز ''ذہب'' سے، جانے کے مفہوم میں ہے، یعنی چلنے کی راہ وروش۔

☆......Religion

☆☆......یہ بڑی من بھاؤنی بات ہے کہ پیغمبرؐ کی صفت شارع ہے اور حتیٰ آپ کے احکام و قوانین اور لائی ہوئی باتیں نیز شرع کہلاتی ہیں۔

دین نیز اپنے مفہوم میں راہ ہے۔ امت کہ جو اسلامی معاشرے سے عبارت ہے "ام" سے نکلا ہے اور اس کے معنے راہ اور آہنگ کے ہیں۔ امامت بھی، امت کی ہم اصل ہے اور رہنمائی اور رہبری کے مفہوم کا حامل ہے۔ اور عبادت، راستے کے ہموار ہونے اور ہموار کرنے کے مفہوم میں آیا ہے (عبد الطریق)۔ حج کسی جگہ جانے کے قصد اور ارادہ کو کہتے ہیں۔ اور طواف، کسی محور کے گرد حرکت کرنے سے عبارت ہے۔ اور سعی، مطلوب کو پانے کی کوشش میں ایک مرکز سے دوسرے مرکز کی طرف دوڑنا ہے۔ اور سبیل، مطلق طور پر بمعنائے راہ ہے......

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ رائج اصطلاحات کہ جو اساسی ترین اور اسلامی اصولوں کو بیان کرتے ہیں بلکہ وہ اصطلاحات کہ جن کا اطلاق خود دین پر ہوتا ہے اسلام کی اولین ثقافت میں بمعنائے راہ اور راہ میں حرکت کے ہیں، اور یہ، مذہب کے فلسفے اور ان تمام عقائد و اعمال کو منظر پر لاتا ہے جنہیں مذہب پیش کرتا ہے۔ راہ یا راستہ یعنی وہ وسیلہ کہ جسے پار کر کے ہم کسی مقصد تک پہنچیں، یہ نہیں کہ "راہ" سے راستے میں رک جائیں اور حقیقت و ہدف سے عاری چیزوں سے رشتہ جوڑیں کہ یہ ایسی بات ہوگی کہ ہم مقصود و مقصد تک پہنچنے کے لئے ایک وسیلہ کے عنوان سے نہیں بلکہ نفس "راہ" کے لئے استفادہ کریں اور اس کی سجاوٹ، چراغانی اور آرائش میں لگے رہیں۔ یہ صورت راہ برائے راہ کی ہے یعنی پہنچنا نہیں، جانا، بلکہ بلا ہدف، بلا دلیل اور بے نتیجہ ٹہلنا۔ اور اگر ہم ساری عمر راہ میں رہیں، لیکن اس میں کھڑے رہیں یا ٹہلتے رہیں اور قدم آگے بڑھانے اور مقصد تک پہنچنے کی نہ سوچیں تو ہم ایک گام راہ بھی طے نہیں کریں گے، جیسا

کہ نہیں کیا ہے اور یہ ہے علیؑ کے کلام کا مفہوم کہ:

"وہ لوگ کہ جو نا آگاہانہ اور بے خبرانہ عبادت کرتے ہیں ان کی مثال کولھو کے بیل کی سی ہے۔ جو راہ طے کرتے ہیں اور کہیں نہیں پہنچتے۔ صبح سے شام تک چلتے اور راہ میں ہوتے ہیں لیکن اختتام راہ پر پھر وہاں پہنچتے ہیں جہاں سے چلے تھے"۔ عبادت برائے عبادت، مذہب برائے مذہب، اور راہ برائے راہ کا یہ مفہوم ہے۔

راہ نہ برائے راہ، بلکہ ہدف تک پہنچنے کے لئے ہے اور مذہب نہ برائے مذہب، بلکہ ہدف کی سمت ایک راہ ہے۔ لیکن آج مذہب برائے مذہب کو وقعت حاصل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مذہب پر اعتقاد، اس مذہب کے معتقد سے، سلب مسئولیت کرتا ہے۔ وہ بھی کس مذہب سے؟ خود اسلام سے کہ جو بنیادی طور پر انسان کی مسئولیت کو دکھانے کے لئے عمیق ترین، روشن ترین اور قاطع ترین بیان کو منتخب کرتا ہے، اس لئے کہ جب مذہبی عقائد، مذہبی شعائر اور مذہبی احکام خود ہدف ہوں تو جس کسی کا مذہب ہو وہ ہدف تک پہنچ گیا ہے اور اب اس پر مسئولیت کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ نماز برائے نماز، اس مفہوم میں ہے کہ جس کسی نے نماز پڑھائی ہے گویا اس نے اپنی ذمہ داری انجام دیدی ہے، لیکن یہ جو قرآن کہہ رہا ہے:

"ان الصلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء و المنکر" اس مفہوم میں ہے کہ نماز، بدی اور بدصورتی کی نفی اور نہی کا ذریعہ ہے اور اگر کسی کی نماز کی یہ صورت نہ ہو اور اس سے یہ نتائج نہ نکلیں تو نماز پڑھنے والا اور بے نمازی دونوں یکساں ہیں۔ وہ گاڑی جو مجھے کسی جگہ نہ لے جائے اس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ گاڑی برائے گاڑی یعنی کیا؟

مسئولیت والا مذہب

اسلام میں، انسان، خدا کا ایک امانتدار موجود، اور اس امانت کا حامل ہے جسے خدا نے زمین، آسمان، اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ یہ انسان تھا کہ جس نے اس امانت کو اٹھایا، یعنی اس نے مسئولیت کو قبول کیا کہ ''امانت'' وہی مسئولیت ہے پس انسان، انسان کی خاطر نہیں، آزاد انسان، غیر مسئول نہیں، آزاد مسئول ہے۔ نہ وہ مجبور ہے اور نہ آزاد۔ قرآن اور ہمارے عقائد میں، اساس۔ مسئولیت بڑی شدت اور بڑی وضاحت سے زیر بحث آئے ہیں۔۔۔ لیکن آج ان کے مفہوم کو اس طرح الٹ دیا گیا ہے کہ واقعی معجزہ ہے۔۔۔ مثلاً یہ کہ قیامت میں آدمی کے ہاتھوں، پاؤں، آنکھوں اور کانوں نے جو کچھ کیا ہے یہ اعضاء اس کی گواہی دیں گے۔ یہ اس بات کو بتاتا ہے کہ انسان کا ہر ہر جز اور اس کا انگ انگ، اس کی انسانی ذمہ داری کے مقابل مسئول ہے۔ مگر اب بحث یہ ہو رہی ہے کہ ''کیا ہڈیوں کے گل سڑ جانے اور آکل و ماکول کی تمیز ختم ہو جانے کے بعد، یہ اس قابل رہتے ہیں کہ کسی سوال کا جواب دیں''۔ کیا ہاتھ اور پاؤں...... الفاظ و آواز و جملوں کی صورت میں جواب دیں گے یا نہیں وہ زبان حال سے اپنی بات کہیں گے؟...... تحقیقات، قیامت میں گواہی کی تکنیکی مشکل کے حل میں چلی گئی ہے!

مومنین کہتے ہیں بالکل، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان اور دل فصیح زبان میں بولیں گے اور گواہی دیں گے، اور روشن خیال لوگ کہتے ہیں: نہیں یہ بات فزیالوجی کے اعتبار

سے درست نہیں، مرنے کے بعد یہ اعضاء معدنی مادہ بن کر کسی پودے، کسی حیوان یا کسی انسان کے بدن میں وارد ہوتے ہیں اور بنیادی طور پر آج سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ ہاتھ، پیر اور آنکھ کان کلام نہیں کرسکتے۔ہم دیکھ رہے ہیں نظریات کی کیا صورت ہے۔ ان میں سے کسی کی نفی سے کچھ حاصل ہے اور نہ اثبات سے۔ یہ ایک لاحاصل امر ہے۔ اس لئے کہ یہاں بات مسئولیت کی ہے، یہ فرد کی مسئولیت کی حساسیت، اس کی سنگینی اور شدت کو حتیٰ ایک ایک عضو کی نسبت ظاہر کرتی ہے اور ان بہت زیادہ علمی مباحث، ان علمائی تحقیقات اور ان متدین اور متجدد دعویٰ کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ اس آیت کا اصلی مفہوم فوت ہوگیا ہے!

قرآن کہتا ہے: "ان السمع و البصر و الفواد کل اولئک کان عنه مسئولا". (الاسراء......۳۶)، کان، آنکھ اور دل ---احساس---کُل کے کُل مسئول ہیں، یعنی مسؤلیت، انسان کی روح اور اس کے اندام کے ہر ہر حصے پر لدی ہے۔ "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیة"۔ مسئولیت، رہبر سے مخصوص نہیں، عالم اور روشن خیال سے مختص نہیں۔ اس مجمع میں ہر فرد سب کی رہبری کا مسئول ہے اور یہ ٹھیک سارتر☆ کی کہی ہوئی بات ہے کہ جو اس کی اگزسٹنسیلزم کا ایک ممتاز، اعلیٰ

☆......وہ عمل میں خیر و شر کے معیار کو حسن نیت (Benison) پر محمول کرتا ہے ---چونکہ وہ خارج میں کسی معیار کا قائل نہیں تھا--- اس مفہوم میں کہ آپ دو طرح کا انتخاب یا عمل کرتے ہیں۔ ایک حالت میں آپ، ایک ایسا عمل انجام دیتے ہیں جسے آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی اور انجام نہ دے۔ دوسری حالت میں آپ کا عمل ایسا ہوتا ہے جسے آپ چاہتے ہیں کہ ہر کوئی اسے انجام دے۔ پس ایسی حالت میں گویا آپ ساری بشریت کے لئے ایک کلی قاعدہ وضع کرتے ہیں۔

اوراونچے پیمانے کا نقطہ ہے: "ہر کوئی جس چیز کو اپنے لئے چنتا ہے، چاہتا ہے کہ سب لوگ اس کی پیروی کریں اور اسی لئے وہ اپنے ہر چناؤ کے ساتھ پوری بشریت کے لئے گویا ایک کلی قانون وضع کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر فرد کی مسئولیت اس کی سماجی زندگی میں اتنی ہی بھاری اور اضطراب آور ہے جتنی کہ سارے انسانوں کی سرنوشت کی ذمہ داری سنبھالنا"۔

اسلام، عَالِم بے عمل کی توصیف میں ۔۔۔ کہ جو ایک بار پھر بہت سے اعلیٰ مفاہیم کی طرح ورد زباں ہے اور تکرار کے عمل سے گزر رہی ہے، عمل کی نوعیت کی بات بیچ میں لائے بغیر، اور اگر آ بھی رہی ہے تو بھی اس کا مقصد "عمل بنا علم ہے" یعنی "عمل خود برائے عمل" ہے ۔۔۔ کہ جس سے مراد وہ دانشور ہے کہ جو زمانے، عوام کی سرنوشت، قوم کی سرنوشت، اور اس کی روح وثقافت وایمان اور عوامل کی نسبت ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا کہ جو عوام الناس کی غفلت، ان کی گمراہی، اور ان کے ذہنی انحراف پر ختم ہوتی ہے،...... اس ادبی نزاکت کو بھی ترک کرتا ہے:

"مثل الذین حملوا التوراۃ، ثم لم یحملوھا کمثل الحمار...... فمثلہ کمثل الکلب" غیر مسئول مذہبی عالم گدھے کی طرح ہے...... کتے جیسا ہے!!

مُرَکب اور خونی ناتہ داری

ہر انسان خدا کا امانتدار ہے ۔۔۔ اس لئے کہ وہ آدم کی اولاد ہے ۔۔۔ اور

مسئول بھی، اور نہ صرف اپنی جماعت، اپنے گھرانے، اور اپنے لوگوں کا مسئول بلکہ سارے وجود اور وجود پر حاکم ارادے، اور پوری کائنات کے مقابل مسئول ہے۔

یہ ہے انسان کی مسئولیت کی انتہا۔ لیکن اسلام میں سب سے بڑی مسئولیت کا رخ علم کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربستان میں اسلام کی نوخیز تحریک میں کہ جسے بت پرستوں، دشمنوں، اشرافیوں اور حملہ آور طاقتوں سے نبٹنے کے لئے مجاہدوں کی ضرورت درپیش ہے، تحریک کا رہبر ایک ایسے جملے سے مجاہدوں کو آواز دیتا ہے کہ بشریت آج بھی اپنی ثقافت و فطانت و دانش کے دور میں اس طرح کی درخشاں تعبیر سے فاقد ہے کہ جو ایک ناخواندہ ۔۔۔ بلکہ خط و کتابت سے عاری ۔۔۔ معاشرے کے سینے سے پھوٹ رہا ہے کہ:

"مداد العلماء افضل من دماء الشهداء"

اہمیت اور قدر و منزلت میں دانشمندوں کے قلم کی سیاہی، شہداء کے خون سے برتر ہے۔ اور اس تعبیر سے کیا واضح طور پر یہ بلند مفہوم نہیں نکلتا کہ وہ خون اور قلم کی سیاہی ایک مشابہ ذمہ داری کے حامل ہیں اور ثانیاً سیاہی کی مسئولیت خون کی مسئولیت سے زیادہ حساس اور زیادہ بھاری ہے؟

یہی وجہ ہے کہ قرآن ایک ان پڑھ معاشرے میں کہ جس کے پیغمبرؐ کے پاس آغاز کار میں حتیٰ مدینہ جیسے شہر میں صرف ایک منشی ہے اور وہ بھی یہودی ہے اور خود آپ ایک امّی ہیں، کتاب، سیاہی، قلم اور اس چیز کی جو لکھتے ہیں، قسم کھاتا ہے (ن والقلم و مایسطرون) لیکن اس قلم کی جو مسئول ہے اور اس سیاہی کی جو خون کی والا ترتانہ دار اور اس کی برتر ہمزاد ہے۔

اسی لئے میں قرآن اور اسلام کی زبان میں آئے ہوئے علم و عالم کو نہ متجد دین کے عقیدے کی بنا پر مطلق طور پر ہر علم اور ہر عالم اور کسی خاص مضمون میں دسترس رکھنے والا سمجھتا ہوں اور نہ بہت سے قدماء کی طرح کہتا ہوں کہ علم صرف علم دین یعنی دینی احکام پر علم و فقہ ہے، بلکہ یہاں عالم ٹھیک اسی مفہوم میں ہے جس میں آج ساری ثقافتیں، پوری سماجی ادبیات اور مسئول، انقلابی اور عوامی آئیڈیالوجیز "روشن خیال" کے بارے میں قائل ہیں۔

"علماء امتی افضل من انبیاء بنی اسرائیل" (میری امت کے علماء، بنی اسرائیل کے علماء سے برتر ہیں)۔ اس بات میں جناب رسالتمآب عالم کو پیغمبر کے مشابہ و یکساں اور علم کو نبوت کا ایک جاری سلسلہ جانتے ہیں اور تشخص کے اعتبار سے اپنی قوم اور اپنی تاریخ کے دانشمندوں کی ذمہ داری کو تاریخ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی ذمہ داری سے سنگین تر، برتر اور قابل قدر تر شمار کرتے ہیں۔

یہ علم مسئول ہے، ایسی مسئولیت کہ جو ہمراہ و ہمگام نبوت ہے۔ اور اسی نتیجہ کو وہ ایک اور حدیث میں ایک بار پھر بیان کرتے ہیں کہ: "العلماء ورثہ الانبیاء" (دانشمند لوگ، پیغمبروں کے ورثاء ہیں)! وراثت میں کیا چیز ان کے ہاتھ آتی ہے؟ آگاہی، اور زمانے اور لوگوں کی سرنوشت کی نسبت مسئولیت۔

یہ ٹھوس مسئلہ، تشیع میں تین اصولوں کی صورت میں آیا ہے کہ جس پر اگرچہ بظاہر گفتگو نہیں ہوئی ہے مگر یہ متن تشیع، عمل تشیع، اور اس کی ثقافت واس کے اعتقادی اور عملی اصول میں مشخص ہے۔

تاریخ تشیع کے ادوار

تاریخ، اہل تشیع کی سوچ اور ان کے زاویہ نگاہ پر مبنی تین ادوار کی حامل ہے:

الف: پہلا دور کہ جس میں ۔۔۔قسط وعدالت وآزادی وکمال ونجات کے لئے ۔۔۔عوام کی رہبری نبوت کے ہاتھ میں ہے۔

ب: دوسرا دور کہ جو اختتام نبوت، دوران خاتمیت اور آغاز ''امامت'' کا دور ہے، اس دور میں عوام کی رہبری نظام امامت کے ہاتھ آتی ہے۔

ج: تیسرا دور وہ ہے کہ جو امام کی غیبت سے شروع ہوتا ہے۔۔۔یعنی غیبت کبریٰ کا اور ۔۔۔اس میں خلق خدا کی رہبری، ان کی ہدایت، فروغ حکمت، اور استقرار عدالت وقسط یعنی وہ ساری ذمہ داریاں جو نبوت وامامت کی تھیں اب علم کے ذمہ آگئی ہیں، لیکن ان علمی اطلاعات کے مجموعے کو سمجھنے کے عنوان سے نہیں جنہیں اور کوئی نہیں جانتا بلکہ اللہ کے پیغمبروں کی آگاہی سے ملتی ہوئی آگاہی کے مفہوم میں۔

غیبت

جو باتیں ہمیں سمجھائی گئی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں، ان کے برخلاف، غیبت کا دور نفی مسئولیت اور ظہور کے منفی انتظار کا دور نہیں بلکہ انسان کی مسئولیت کے سنگین تر اور مستقیم تر ہونے کا دور ہے، اس دور میں عالم...... خدا، مکتب اور اپنے علم اور نیز امام اور

عوام کے مقابل بڑی بھاری، صریح اور مشخص مسئولیت کو اپنے ذمہ لیتا ہے، اور یہ "نیابت" سے عبارت ہے۔

نیابت

یعنی وہ مسئولیت جسے علم سنبھالتا ہے تاکہ وہ امام کی راہ اور نبوت کی تحریک کو جاری رکھے، اس تاریخی لحہ میں علم کی ذمہ داری اور اس کا فریضہ...... خلق خدا کی رہبری، عوام الناس پر حکومت، لوگوں کی تربیت، اور اپنے مکتب، اپنے زمانے، اپنی سرنوشت اور اپنی مسئولیت سے مستقل طور پر عوام کی آگاہی ہے۔

اس دور میں غیبت، سماجی مسئولیتوں سے دست برداری نہیں ہے بلکہ جو غذا وہ پکا رہے ہیں اور پکا چکے ہیں اس کے برخلاف نبوت و امامت کی ساری مسئولیت، علما ور عالم کے کاندھوں پر پڑ جاتی ہے۔

اجتہاد

اجتہاد، ذمہ دار محقق کی آزادانہ تحقیق ہے۔۔۔ اس محقق کی نہیں کہ جو حقائق کو کتابوں، تجربہ گاہوں، اور دانشگاہوں کے لئے دریافت کرتا ہے۔۔۔ یہ تحقیق عوام کے لئے، ان کی سرنوشت کے لئے، عقائد کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لئے، نئے تجاویز کے لئے، زمانے اور سماجی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اور بر بنائے مکتب

اپنے معاشرے کی ہدایت اور بصیرت کے لئے ہے۔

اجتہاد، شیعہ مذہب کی وہ مشخص اور بھاری ذمہ داری ہے کہ جو محقق عالم کے کاندھوں پر دھری ہے تا کہ وہ لوگوں کی علم و آگاہی کی پیشرفت کے مطابق مذہب کے برتاؤ اور اس کے زاویہ نگاہ کو، زمانے کے ذہن، اور زمانے کی سوچ میں بصورت انقلاب لائے اور اسلام اور اس کے مکتب کی برقراری کو زمانے کی ضرورت کے مطابق اور اس حد تک ممکن بنائے جس حد تک کہ آنے والے زمانوں میں اس کے حقائق کی بہتر سمجھ اور بہتر دریافت کا امکان ہو۔ اور سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ یہ عالم کی بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عظیم مکتب کے احکام و اصول کی بنیاد پر جو اس کا اپنا ہے اور اس زمانے کی ضرورت و حرکت و اجتہاد کے مطابق جس میں وہ جی رہا ہے ۔۔۔ اور جس میں اس کے مذہب کو بھی زندہ رہنا ہے ۔۔۔ نئے فہم، نئے استنباط، اور نئے احکام کی سمت ۔۔۔ زمانے کے احتیاج، بشری ضرورت اور اس دور کی نسل کی مناسبت سے ۔۔۔ ہاتھ بڑھائے اور ان کا استنباط و استخراج کرے تا کہ مذہب، قدیم اور گزرے ہوئے شرائط کے دائرہ میں گھٹ کر یا منجمد ہو کر نہ رہ جائے ☆

☆......لیکن افسوس ۔۔۔ بقول ڈاکٹر شادماں کے ۔۔۔ "گزشتہ میں باوجود اس کے کہ معاشرے کی سماجی اور عرفی زندگی اور اس کے قانونی اصول، اسلامیہ فقہ کی بنیاد پر استوار تھے، ہمارے دینی حوزوں میں، فقہ، دینی علوم کے دیگر علوم میں کا ایک سبجیکٹ تھا اور اس کے ساتھ فلسفہ، ادبیات، علم کلام، حدیث، تفسیر، حتیٰ طب کا سبجیکٹ وغیرہ بھی تھا، لیکن اب جبکہ سماج کا سماجی اور قانونی نظام فقہا کے ہاتھ سے نکل گیا ہے، ہمارے حوزوں کی ساری علمی کوششیں فقہ تک محدود رہ گئی ہے۔ حالانکہ آج جسقدر رفقہ، سماجی زندگی سے دور ہوگئی ہے اسی قدر دین کے اعتقادی، معاشرتی، اور علمی مسائل گزشتہ سے زیادہ موضوع بحث ہیں یعنی یہ وہ مسائل ہیں جن کا جواب فقہ نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اظہار افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علماء کی زحمتیں اور طلباء کی سخت کوشی بھی ضائع ہو رہی ہے اور اسلام بھی بے یار و مددگار ہو گیا ہے!

اور یہ اس مفہوم میں نہیں ہے کہ فقیہ ۔۔۔ زمانے کے نئے واقعات کی دریافت اور اسلامی جواب یابی کے بجائے ۔۔۔ بیٹھا رہے تا کہ بینک، بیمہ اور بیانہ آئے اور وہ اس کی شرعی توجیہی حکم بیان کرے بلکہ ضروری ہے کہ ضروریات اور احتیاجات کے تغیر و تحول کے مطابق روح و فکر و استنباطِ احکام اور اسلامی فقہ کی صورت ۔۔۔ مسئول مجتہد کے ذریعے، یعنی آزاد اور مسئول محقق کے ذریعے ۔۔۔ تغیر و بالیدگی کے عمل سے گزرے۔

اور یہی وہ منزل ہے کہ ایک بار پھر، اجتہاد، معاشرے کی علمی اور فکری ہدایت، امتدادِ تغیر زماں، اور ضرورتوں اور قدروں کی تبدیلی میں، دانشور کی نفسِ مسئولیت کو اس خصوصیت، اس سنگینی اور اس صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ایسے مشکلات کا تذکرہ جو مشکل نہیں

بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً ''ایلام'' سے کسی نے خط لکھ کر ایسی مشکل کو پیش کیا کہ آپ اس میں رہ جاتے ہیں اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس نے اپنی ساری مشکلات حل کر لی ہیں کہ اب اس پہلی اور آخری مشکل کو پہنچا ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ جس مشکل کو اس نے سوال کے عنوان سے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ آدم کے فرزندوں نے ۔۔۔ کہ جو آپس میں بھائی بہن تھے ۔۔۔ کس طرح ایک دوسرے سے شادی کی ہے؟ اب مسئلہ سے زیادہ اس کے حل کی راہیں سننے کے قابل ہیں۔ ایک کہتا ہے، حوا کے پیٹ سے ہر دفعہ جڑواں بچے عالم وجود میں آتے

تھے ان میں سے ایک لڑکا اور دوسری لڑکی ہوا کرتی تھی! پہلے پیٹ کی لڑکی، دوسرے پیٹ کے لڑکے سے اور دوسرے پیٹ کی لڑکی پہلے پیٹ کے لڑکے سے بیاہ دی جاتی تھی! (ذرا فطانت ملاحظہ فرمایئے کہ ان کی شادی کو شرعی بنانے کے لئے اتنی زحمت اور ایسے حل کے بعد بھی، شرعی اشکال اپنی جگہ باقی ہیں) اور دوسرا اس سے زیادہ فطانت آسا حکم دیتا ہے کہ ایک جنّی ـ ـ ـ مادہ جن ـ ـ ـ قابیل کے لئے اور ایک پری زادی ہابیل کے لئے بھیجی گئی تا کہ آدم کے فرزندوں کی تکلیف روشن ہو! اور یہیں سے یہ علمی نظریہ ظہور میں آیا کہ عورتیں، مردوں کی جنس سے نہیں ہیں۔ اب بتایئے محضر میں کونسا "عمل خیر" متوقف تھا کہ اس حلال زادگی کے اثبات یا شرعی ٹوپی کی ضرورت آن پڑی تھی۔ یہ وہ چیز ہے جس میں کہ وہ خود عالم ہیں!

یا پھر ہر کسی کی مشکل یہ ہے کہ خدا کی ذات کے ساتھ اس کے صفات کا رابطہ کیا ہے کہ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ تم سے اس کا کیا تعلق ہے، کیا تمہارا چو ہے جتنا حقیر ذہن اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے؟ یا پھر ایک ہزار سال پرانی جبر و اختیار کی بحث جس میں پھر وہ، بنی امیہ اور بنی عباس ـ ـ ـ اور ان کے وارثوں ـ ـ ـ کے کوڑوں تلے جان سے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ وہ گھٹن، بدبختی، اور پلیدی کے جبر میں غوطہ کھا رہے ہیں لیکن اختیار کے اثبات کے درپے ہیں وہ بھی زمین و زندگی میں نہیں بلکہ ہوا و آسمان و غیب اور قبل از خلقت میں!

ہم تہران کے ٹریفک اور بس سروس کے مسئلہ میں رہ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ذاتِ الٰہی میں جمع حُدوث و قدم کو حل کریں۔ یہ ہے ذہنوں کو منحرف کرنا اور جھوٹی مشکلات تراشنا تا کہ ہم اپنی سچی مشکلات اور ان کے حل کی راہ کو نہ پاسکیں۔

حج کے سفر پر ہم اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک دانشور سے ملنے جارہے تھے، ملنے سے پہلے اثنائے راہ میں، میں نے اپنے دوستوں کے لئے پیش بینی کی تھی کہ وہاں علمی مسائل اور سماجی مشکلات کے عنوان سے کس طرح کے مسائل زیر بحث آئیں گے اوران کے حل کے لئے کس طرح کی کوشش واجتہاد کی راہ ہموار ہوگی۔

جن چھ مسئلوں کے بارے میں، میں نے پیش بینی کی تھی، ان میں سے چار بالکل صحیح بیٹھے اور باقی دو پر بحث نہیں ہوئی۔ ایک پر اس لئے کہ خود ہمارے دوستوں نے دوسرے مسائل چھیڑ دیئے تھے، اور دوسرے پر اس لئے کہ دامن وقت میں گنجائش نہیں تھی۔

ان میں سے ایک مسئلہ اسلام کے سماجی اور علمی مشکلات کا تھا کہ جو وہاں زیر بحث آیا اور اس کے فوری حل کے لئے بہت سا وقت، بحث ومباحثہ، جنجال و کوشش اور باہمی حساسیت میں صرف ہوا۔ اور صیہونزم، استعمار، پس ماندگی، اسلامی ممالک کے افلاس، امت مسلمہ کے ٹکڑیوں میں بٹاؤ، استثمار کے تضاد، تفرقے، مغربی ثقافت کی یلغار، اسلامی ثقافت کے بگاڑ، اسلام سے مغرب زدہ نئی نسل کی بیگانگی، مسخ ونفی تاریخ، مسلمانوں کے فکری انحطاط، اور فرقہ وارانہ مشکلات وغیرہ جیسے مسائل میں سے ایک بھی مسئلہ زیر بحث نہیں آیا، مشکل یہ تھی کہ: ’’قطب شمالی یا جنوبی میں کہ جہاں چھ مہینے رات اور چھ مہینے دن ہوتا ہے، اگر برحسب اتفاق وہاں کچھ لوگ بسیرا کریں یا وہاں سے گزریں اور اگر اتفاق سے وہاں کوئی مسلمان ہو یا پھر وہاں کے رہنے والوں میں احتمالاً اسلام کے زیر اثر کوئی مسلمان ہوگیا ہو تو اس کے لئے نماز اور روزوں کا حکم کیا ہوگا؟

یہاں تک کہ بالآخر بڑی علمی کشمکشوں، زاویہ نگاہوں، فرضیوں اور مختلف فتوؤں کے بعد، مذکورہ دانشور شخص نے کہ جو ایک بڑے صاحب بصیرت آدمی ہیں فرمایا: میرا فتویٰ یہ ہے کہ وہ مسلمان جو قطب شمالی یا جنوبی میں رہائش پذیر ہے اس سے احکام روزہ ونماز ساقط ہیں، اس لئے کہ صبح، ظہر، عصر، اور مغرب وعشاء کی نمازوں کا تعلق شب وروز سے ہے اور وہاں دن، رات نہیں ہیں، نہ صبح ہے، نہ ظہر ہے، نہ عصر ہے، اور نہ کوئی مغرب وعشاء، روزے کا تعلق بھی رمضان کے مہینے سے ہوتا ہے اور وہاں بنیادی طور پر کوئی مہینہ نہیں ہے کہ جس کا کوئی رمضان ہو۔

نوظہور واقعہ

شیعہ فقہ کی ایک ترقی پذیر پیش بینی یہ ہے کہ وجود میں آنے والے ان نئے واقعات کو کہ جو ہر زمانے میں ظاہر ہوتے ہیں اور فطری بات ہے کہ اس کا حکم اور اس کا حل گزشتہ کے فقہی قوانین میں نہیں آیا ہے، ایسے علماء جانچیں گے کہ جو مجتہد محقق ہوں اور انہیں علمی اور اجتہادی پیمانوں اور اسلام کی علمی اور عملی شناخت کی بنیاد پر انہیں دیکھیں، حل کریں، اور حقیقت تک پہنچیں۔ یہ اصل اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کس طرح اسلام نے تاریخی ادوار میں، زمانے کی حرکت، اور کسی نوظہور واقعہ کے تغیر و تبدل کی نسبت پیش بینی کی ہے اور آگاہ لوگوں اور اسلام شناسوں کو اس کے مقابل ذمہ دار جانا ہے۔ نوظہور واقعات کلی طور پر سارے ثقافتی، فکری، سماجی، سیاسی، معاشی اور انسانی روداد یں ہیں۔ مشین، قدیم وجدید استعمار، الینیشن (اپنے آپ سے مکمل

بیگانگی)، بیوروکریسی، ٹکنوکریسی، فاشی ازم، ڈیموکریسی، مشروطیت، فلم، ٹیلیفون، سوشلزم، کیپٹل ازم، صیہونزم، فلسطین کا مسئلہ، اسلامی معاشرے میں نیشنلزم، ہپی ازم، ثقافتی یلغار، نوجوان نسل کا عصیان، پسماندگی، مشرق و مغرب کا رابطہ، مغرب پرستی، ٹیکنالوجی اور مشین ازم، روشن خیالوں کی ثقافت پرستی، دلال بورژوازی، میڈیالزم، مذہب کا بحران، اخلاقی اصولوں کا تنزل اور اپنی روایات سے دوری، تاریخ سے جدائی تمدن، تجدد، عورتوں کی آزادی، جنسیت (Sexuality)، پوپ کے ذریعے، دو ہزار سال بعد حضرت عیسیٰ کے قتل کی تہمت سے یہودیوں کی بے گناہی! بھوک، نیا طبقاتی استثمار، طبقاتی روابط کی تلپٹ، معاشی انقلاب، نئی ادبیات، اور آج کے ایمان کو زائل کرنے والی آئیڈیالوجی...... یہ سب کلی طور پر مستحدثہ حوادث ہیں کہ جن سے اسلامی معاشرہ اپنے گوناگوں بعد میں الجھا ہوا یا ملا ہوا ہے۔ اب یہ آگاہ اور مسئول اسلامی دنیا پر ہے کہ وہ اس اجتہاد، فتویٰ اور آزادی کی تحقیق سے جو اس کا حق ہے ان مسائل کو اسلامی نقطہ نظر، اور اس مکتب کے علمی اصولوں کی بنیاد پر، پیش کرے اور ان سے مقابلہ کے لئے اور ان کے انتخاب، اقتباس، نفی تائید اور تجزیہ و شناخت کے لئے کوئی راہ دکھائے، اپنا نقطہ نظر پیش کرے، لوگوں کو فکری تعلیم دے، انہیں پابند کرے اور عوام کی سماجی رہبری کو اپنے ذمہ لے۔

لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ، ہمارے فقہی رسائل کہ جو صرف ایک نشریہ ہے جو ہمارے بڑے علمی حوزوں سے لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے اور جو ہمارے مذہب کے بہترین تحقیقی اور علمی فطانتوں اور ہماری برسوں کی کوشش و اجتہاد کا ثمرہ ہے، وہی شیخ بہائی کی کتاب جامع عباسی ہے کہ جو شاہ عباس کے دور کی یادگار ہے اور اب اس کا

خلاصہ کیا گیا ہے اور بغیر کمی بیشی کے وہی مسائل پھر سودیں بار اور دس نسلوں کے بعد پھر تکرار ہو رہے ہیں، صرف فتویٰ کی صورت میں معمولی سی تبدیلی آئی ہے۔

ابھی حال ہی میں دو ''رسالے'' میں نے دیکھے کہ جن میں اس دور کے نئے مسائل پر توجہ دی گئی ہے۔ اور یہ بات خود امید افزا ہے ''حوادث مستحدثہ'' میں: بینک، بیانہ، اور بیمے جیسے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس کی فقہی توجیہ ہو اور یہ بات بتاتی ہے کہ اب ہم چاہتے ہیں کہ گزشتہ کے منجمد قانون سماج کے دائرہ سے باہر آئیں اور زمانے کے مسائل پر گفتگو کریں اور اسلام کو اس عصر میں اپنائیں۔ دراصل ہم تنگ نظری میں مبتلا ہیں اور ہماری مسئولیت یہ ہے کہ ہم انتظار میں بیٹھے رہیں تا کہ زمانہ جیسا خود چاہتا ہے یا وہ چاہتے ہیں اسی طرح کرے اور اس کے بعد ہم آئیں اور فقہی کتابوں سے کسی طرح اس کی توجیہ کریں! یعنی ہمیشہ زمانے کے نقش قدم پر چلنا اور نئے واقعات اور رودادوں کے توجیہ کنندہ ہونا نہ کہ زمانے اور اس کے نئے واقعات کو سنوارنے اور ہدایت کرنے والا ہونا، کہ عالم اسلامی کو۔۔۔ کہ جسے انبیاء کی وراثت ملی ہے۔۔۔ اور عالم تشیع کو۔۔۔ کہ جسے امام کی نیابت حاصل ہے ۔۔۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

تشیع کی مسئولیت

شیعیت ایک مسئولیت کو ساتھ لاتی ہے اور اس میں انسان ہونا، صاحب فکر ہونا، اور مسلمان ہونا سب سے زیادہ خصوصیت کی حامل ہے، اس لئے کہ شیعہ زمین،

مسئولیت خیز ہے۔ لیکن یہ بات علوی شیعہ کے لئے ہے، صفوی شیعہ کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ عامل سلب مسئولیت اور اس تمام امر و نہی کی نفی ہے جس کا خطاب انسان اور مسلمان سے ہوا ہے۔

صفوی تشیع، مسئولیتوں سے گریز کے لئے راہ ڈھونڈنے والا مذہب ہے۔ یہ قرآن کی تفسیر و تحقیق کا مذہب نہیں بلکہ قرآن کی تجلید و تجلیل و تذہیب کا مذہب ہے۔ تقدیس قرآن، مگر اسے کھول کر پڑھنے کے لئے نہیں، قرآن کی کتاب کو بند رکھنے کے لئے، مکمل طور پر دعا کی کتاب سے توسل، اس لئے کہ قرآن کو کھولنا بہت سخت اور مسئولیت آور ہے، ایسی کتاب کہ جس کا حساب و کتاب اتنا کٹھن ہے کہ وہ پڑھنے والے کو متنبہ کر کے کہتی ہے: ''تم اپنی ذرہ برابر نیکی کے عمل کو دیکھو گے اور ذرہ برابر بدی کے کیفر کا مزہ بھی چکھو گے۔ (**فمن یعمل مثقال ذرة خیراً یرہ و من یعمل مثقال ذرة شراً یرہ**) ۔ قیامت، وہ دن ہے جس میں تم اپنے اعمال اور محاصل کو دیکھو گے (**یوم ینظر المرء ماقدمت یداہ**) بس یہی اصل ہے!

انفاق، ہر چیز کو ہاتھ سے چھوڑنا ہے، اور اس میں جان، مال، زندگی، بیوی بچے بھی آتے ہیں، اس لئے کہ عقیدہ کی راہ میں، عوام کی راہ میں یہ سب ''فتنہ ہیں''۔ ضروری ہے کہ تم دنیا کو پلید سمجھو اور اپنی زندگی کو وقف کر دو وہ بھی کاہلی اور زھد و عبادت و ریاضت و اعتکاف کے گوشہ میں نہیں...... بلکہ متن جہاد و اجتہاد و عوام و عقیدہ و عمل میں۔

اتنی مسئولیت؟ اتنا بوجھ؟ بڑی سخت گرفت ہے۔

لیکن صفوی شیعہ کو کوئی پریشانی نہیں، اس لئے کہ اس کے پاس بڑی آسان راہ

رہے: دعا کی کتاب کھولتا ہے، اس میں لکھا ہے فلاں چار لفظوں کو اگر صفا اور مروہ کی چوتھی سیڑھی پر کھڑے ہو کر پڑھو گے تو دولت تمہارے قدم چومے گی!۔۔۔ یہ مال دنیا ۔۔۔ اور اگر اسی دعا کو کاغذ پر لکھو یا قبلہ رخ ہو کر پڑھو یا انار کے پانی سے کورے کٹورے پر لکھ کر پیو تو تمہارے سارے گناہ ۔۔۔ خواہ وہ آسمان کے ستاروں، صحرا کی ریت، اور بارش کے قطروں کے برابر کیوں نہ ہو ۔۔۔ بخش دیئے جائیں گے، اور اس طرح گناہوں سے پاک ہو گے جس طرح کوئی بچہ پہلے دن ماں کی پیٹ سے جنم لیتا ہے ۔۔۔ یہ بھی آخرت ۔۔۔ پس ایک ہوشیار مومن اس کی طرف رخ کرتا ہے کہ جو زیادہ آسان بھی ہے اور کم خرچ بھی اور زیادہ آمدنی والا بھی! وہ قرآن کو نہیں کھولے گا اس لئے کہ اس نے اپنا حل کتاب سے ڈھونڈ لیا ہے!

علیؑ ہمارے سامنے کھڑے ہیں، وہ علیؑ کہ جس نے اپنی ساری مصلحتوں، اپنی سرنوشت، اپنے خاندان، اپنے عزیز و اقارب اور اپنے گروہ کو ''حق'' اور ''ناس'' پر نثار کیا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی جہاد اور مبارزہ کے میدان کو خالی نہیں چھوڑا ہے اور اس کے ساتھ اپنی عظیم مسئولیت کے آگے جو ان کے کاندھوں پر ہے اتنے مضطرب اور بے چین ہیں کہ اپنے اضطراب اور اپنی بے چینی کو اپنے چاہنے والے میں نیز منتقل کرتے ہیں اس کیفیت میں اگر ہم انہیں پہچان سکیں تو مسئولیت کا بوجھ ہمارے کاندھوں پر بھی آجاتا ہے۔

رسول خداؐ ہمارے سامنے کھڑے ہیں ۔۔۔ اور اپنی پیاری اور لاڈلی بیٹی سے کہہ رہے ہیں: فاطمہؑ! کام کرو کام، کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا ۔۔۔ ان کی شناخت بھی مسئولیت کی نسبت ہمیں شادماں کرتی ہے۔

پس محمدؐ وعلیؑ کی شناخت، قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے، اور مسؤلیت کو قبول کرنے کے بجائے، ہم اس کے حل کی راہ ڈھونڈتے اور اسے پاتے ہیں!

پیغمبر اسلامؐ کو سمجھنے، ان کی باتوں پر کان دھرنے اور علیؑ اور ان کی زندگی کو مدنظر رکھنے اور ان کی نہج البلاغہ کو دائرہ فہم میں لانے کے بجائے ان کے حُب کو پکڑو اور ان کی شناخت کو واگزار کرو! اس لئے کہ ناشناختہ حُبّ علیؑ مسؤلیت پیدا نہیں کرتا۔ ناشناختہ علیؑ کی مثال بت کی سی ہے جسے ہم پوجتے ہیں، بغیر اس کے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کسی قسم کا ارتباط ہو۔ سمجھ کے دائرے سے فاصلہ پانے والے علیؑ، دوسروں کی طرح ہیں۔ ان کے، اور معرفت سے خالی ان کے خالص محبتوں کے درمیان کسی قسم کی ترغیب، کسی طرح کی مسؤلیت اور امر ونہی کی بات پیدا نہیں ہوتی، جتنا چاہو آنسو بہاؤ، سر پیٹو، ہائے وائے کرو، عشق ومحبت کا جذبہ جگاؤ، ذرہ برابر شناخت کے بغیر علیؑ کو فرشتہ بناؤ، یہ باتیں تمہاری زندگی میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتیں اور نہ کوئی ذمہ داری تم پر عائد کرسکتی ہیں۔ صرف نہ پہچانو اس لئے کہ پہچاننا مسؤلیت آور ہے!

اسی لئے علیؑ کو پہچاننا جرم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ۔۔۔ صدیوں بعد بھی ۔۔۔ ہمیں علیؑ کو، ''سلیمان کتانی'' اور جارج جرداق جیسے مسیحی طبیبوں کی زبان سے پہچاننا، اور نہج البلاغہ کو مصر کے مفتی اعظم اور رہبر اہلسنت، شیخ محمد عبدہ کے حاشیہ اور ان کی تصحیح وطباعت میں دیکھنا پڑ رہا ہے، اس لئے کہ محبان علیؑ کو نہ صرف یہ کہ نہج البلاغہ اور علیؑ کے فہم کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے روبرو آنے سے بھی ڈرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ علیؑ کا محب ۔۔۔ کہ جو اس وقت نہج البلاغہ کا مترجم اور شارح بھی ہے ۔۔۔ نہج البلاغہ کے اختتام پر لکھتا ہے: اس کتاب کا مطالعہ

مظلوم لوگ کریں تا کہ یہ جان سکیں کہ صبر و تحمل کا اجر کتنا زیادہ ہوتا ہے!

کہ اگر ایسا ہوتا تو ہمارا مقام بہشت کے اعلیٰ غرفوں میں ہوتا!

اسلام ''نہیں'' سے آغاز ہوتا ہے اور تشیع بھی نہیں سے

تشیع کی اصل ایک ہے اور باقی تمام اصول اسی سے پھوٹتے ہیں اور بنیادی طور پر میرے عقیدے کے مطابق اسلام میں تشیع کی تاریخ اور تشیع کی پیدائش، اسی ایک ''نہیں'' سے شروع ہوتی ہے۔

اگر سارے شیعہ اصول و فروع اس اصل پر مبنی نہ ہوں تو سب بے بنیاد، بے معنی، اور بے ہدف ہیں اور ان سارے اصولوں کی اصل ''نہیں'' ہے۔

میں خود موضوع کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتا، بلکہ چاہتا ہوں کہ ساری تاریخ کے لئے ایک اصل کا استنباط کروں:

حضرت عمر کے بنائے ہوئے شوریٰ میں، عمر کے بعد خلیفہ کے انتخاب پر مامور شوریٰ کمیٹی کے صدر ''عبدالرحمن بن عوف'' علیؑ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں: رسول خدا کے خلیفہ کے عنوان سے میں ''کتاب خدا''، ''سنت رسولؐ'' اور ''سیرت شیخین'' کی بنیاد پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ علیؑ نے بلاتامل کہا: ''نہیں''۔ ☆ اور ان کی ''نہیں'' ایسی قیمت رکھتی ہے کہ جس کو خود علیؑ جانتے ہیں اور علیؑ

☆......علیؑ کے جواب کا متن: ''خدا کی کتاب'' اور ''رسولؐ کی سنت'' پر جہاں تک ہوسکتا ہے، ہاں، مگر سیرت شیخین نہیں۔ میری اپنی ایک بصیرت اور اپنا ایک رویہ ہے۔

کو اسے چکانا پڑتا ہے: علیؑ کی خود کی نابودی، پہلی قیمت۔ طول تاریخ میں علیؑ کے سارے فرزندوں کی نابودی، دوسری قیمت۔ علیؑ کی حکومت سے، علیؑ کے زمانے کے اسلامی معاشرہ کی محرومی، تیسری قیمت!

اتنے سارے نقصانات ایک ''نہیں'' کے لیے؟ اتنی مہنگی ''نہیں''! کیوں؟ ان کو خود اپنی اور اپنی حکومت کی قربانی کا حق تھا، لیکن ان کے فرزند کیوں؟ اپنے زمانے کے معاشرے اور عوام کو علیؑ کی حکومت سے محروم کرتے اور خلفاء جور کی حکومت وزعامت میں ان کو مبتلا کرنا، آخر کیوں؟

علیؑ اپنے ہدف اور اپنی امامت کی عظیم ذمہ داری کے عنوان سے، نہ حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں، نہ اپنے زمانے کے اسی محدود معاشرے کی نجات کی فکر میں ہیں، نہ ہر قیمت پر اپنے فرزندوں کو حکومت دینا چاہتے ہیں۔۔۔ گوکہ یہ سب وہ چاہتے ہیں لیکن کل سے ایک جزء کی صورت میں۔۔۔ وہ اپنی ''نہیں'' سے سارے ادوار کے لوگوں کو یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ:...... جو کوئی حق کی سوچ رکھتا اور میری راہ اختیار کرتا ہے، ہرگاہ باطل کے مقابل۔۔۔ ہر شرائط اور ہر مصلحت میں قرار پاتا ہے اسے چاہیے کہ ''نہیں'' کہے۔

یہ وہ اصل ہے جس کی برقراری کے لئے ان کی، ان کے فرزندوں کی، حتیٰ اپنے زمانے کے عوام کی قربانی بہت کم حیثیت کی حامل ہے اور یہ اصل ہر زمانے میں اتنی ہی بیش بہا ہے اور یہ اس لئے ہے تاکہ یہ تمام صاحبان عقل وفہم کے درمیان مستحکم رہے اور وہ مصلحت کی خاطر کسی حقیقت کو پامال نہ کریں اور باطل کے مقابل۔۔۔ کسی مصلحت کی بنیاد پر۔۔۔ ''ہاں'' نہ کہیں۔

جس طرح تاریخ میں اسلام اُس "لا" سے شروع ہوا ☆ اسی طرح اسلام میں تشیع اس "نہیں" سے شروع ہوتا ہے،

"مصلحت والی تشیع" صفوی تشیع ہے اور اس کے مقابل قرار پانے والی علوی تشیع "حقیقت بھری تشیع" ہے۔

مصلحت۔ حقیقت

ہمیشہ مصلحت، زیبائی کی جھوٹی روپوش رہی ہے، تا کہ "حقیقت" دشمن افراد حقیقت کو اس میں دفن کر دیں۔ اور ہمیشہ "مصلحت" ایک شرعی تلوار ہے تا کہ حقیقت کو قبلہ رخ ذبح کرے۔ اس لئے کہ مصلحت ہمیشہ دین و دنیا کی اسمبلی پلانٹ رہی ہے۔

"...... جو کچھ تم کہتے ہو وہ حقیقت پر مبنی ہے، ٹھیک ہے، صحیح ہے، بہت اچھا تجزیہ ہے۔ تمہارا نظریہ مکمل طور پر اسلام کا نظریہ ہے مگر...... مصلحت نہیں ہے!

یہ کس کی منطق ہے؟ یہ مصلحت اندیش اور اس کی منطق، مخالف علیؑ ہے، یہ علیؑ کا دشمن ہے، اسی آلے اور اسی ضرب سے علیؑ خانہ نشیں ہوتے ہیں۔

"خالد بن ولید" جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ وہ ایک مجرم ہے۔ اس نے مالک بن نویرہ کو قتل کر کے وہیں اس کی زوجہ سے زیادتی کی ہے۔ اسلامی شریعت کے مطابق اس پر حد لگنی چاہئے۔ اس کے جرم کی اسے سزا ملنی چاہیے، لیکن مصلحت نہیں ہے!

"عبدالرحمٰن بن عوف" پیسے کا پجاری، خود آرا اور اشرافی ہے اسے راستے سے ہٹا

☆...... آغاز بعثت کے تین سالوں میں رسول اسلامؐ صرف اس بات کی تکرار کرتے ہیں: قولوا "لا الہ الا اللہ تفلحوا"۔

دینا چاہئے، مگر مصلحت نہیں ہے!

"علیؑ اگر خلافت کے ناقہ کی مہار ہاتھ میں لیں تو وہ اسے سیدھی راہ پر لے جائیں گے"☆ کہ وہ سب سے زیادہ صاحب علم اور سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار، سب سے زیادہ اسلام کی خدمت کرنے والے اور سب سے بہتر قرآن کو سمجھنے والے ہیں...... یہ سب صحیح ہے، لیکن ان کے مخالف زیادہ ہیں، نئے مسلمان اشراف، پیغمبرؐ کے زمانے کی جنگوں میں ان کی شمشیر زنی کے نتیجہ میں ان سے عناد رکھتے ہیں، اس لئے خلافت کے لئے ان کا انتخاب مصلحت نہیں ہے......

بنی امیہ نے اپنی پوری طول حکومت میں بڑے مظالم ڈھائے ہیں، بڑے جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں، اندر سے اسلام پر ضربیں لگائی ہیں، لیکن طاقتور ہیں، انہیں عہدے دیئے جانے چاہئیں، خشونت اسلام کی مصلحت نہیں ہے!

اور اب بھی ہم اسی "مصلحت نہیں ہے" والی باتوں کو ساری کوششوں اور ساری تحریکوں کے مقابل ایک پشتہ کی طرح دیکھتے ہیں۔

فرماتے ہیں: فلاں کتاب جعلی روایتوں سے بھری ہوئی ہے، اس زمانے کے لوگوں کے عقائد کے لئے اس کا ضرر ہر جاہ کن کتاب سے زیادہ ہے...... ہم کہتے ہیں پھر یہ باتیں لوگوں کو بتایئے تاکہ ان کے علم میں یہ بات آئے اور وہ اس کے پڑھنے سے گمراہ نہ ہوں، نوجوان نسل اسے نہ پڑھے تاکہ اس کے اثر سے وہ اسلام سے بدظن نہ ہو"۔ "ہاں، ٹھیک کہتے ہو...... مگر مصلحت نہیں ہے"!

فرماتے ہیں: "سینہ زنی، قمہ زنی، تیغ زنی اور اس قسم کے کام اسلام کے ساتھ

☆...... یہ وہ جملہ ہے جسے حضرت عمر نے موت کے آخری لمحہ میں خلافت کے امیدواروں کے بارے میں بطور وصیت کہا تھا۔

سازگار نہیں ہیں۔ مجمع عام میں لوگوں کا برہنہ ہونا اور بدن کو صدمہ پہنچانا شرعاً جائز نہیں"۔ ہم کہتے ہیں، پھر آپ اس کا اعلان کیوں نہیں کرتے تاکہ لوگ اس سے باز رہیں اور تشیع اور اسلام مخالفین اسے نہ دیکھیں آپ خود اسے درست فرمائیں تاکہ دوسرے لوگ اسے کسی اور طرح اسے پیش نہ کریں...... فرمایا: ٹھیک ہے مگر...... مصلحت نہیں ہے!"

اعتراف کرتے ہیں کہ: اس طرح کا وعظ اور اس طرح کی تبلیغ، اب اس زمانے میں موثر نہیں۔ اور یہ، غیر مذہبی اور مذہب دشمن عناصر کی تبلیغاتی یلغار اور اس جدید علمی، ہنری، اور فنی اسالیب اور آخری سسٹم کی تدریسی، تبلیغی، اور ارتباطی وسائل کے مقابل نہیں ٹھیر سکتی اور نہ ہی موثر طور پر اسلام کا دفاع کر سکتی ہے۔ لہٰذا جدید صورت میں مذہب کی تبلیغ کے لئے ضروری ہے کہ ہم فلم، ٹیلیویژن، تھیٹر، اور ریڈیو سے استفادہ کریں......" آپ اس ہوشمندی، روشن خیالی، زمانے کے احساس، زمانے کی ضرورت، اور سماجی تجزیہ کی اس طاقت پر بڑے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: کوئی بات نہیں، اس سلسلے میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے ہم اس کے لئے تیار ہیں۔ بلا توقف، جھٹ بولے: "ہاں، مگر ابھی جلدی ہے، فی الحال مصلحت نہیں"!

مصلحت نہیں، مصلحت نہیں، مصلحت نہیں،

ہاں، حقیقت نہیں، مگر مصلحت ہے، حقیقت ہے مگر مصلحت نہیں ہے: یہ ہے "مصلحت والے تشیع" کا شعار۔

"مصلحت والا تشیع"، "حقیقت والے تشیع" کو نابود کرنے والا ہے جس طرح کہ تاریخ اسلام میں، "حقیقت والا اسلام"، "مصلحت والے اسلام" کی بھینٹ

چڑھا۔ مصلحت اور حقیقت کے درمیان جنگ کا آغاز سقیفہ میں ہوا جہاں مصلحت کو کامیابی حاصل ہوئی اور وہیں سے یہ سلسلہ آگے بڑھا، بالکل اسی طرح جس طرح ایک نقطہ سے دو خطوط کا آغاز ہوتا ہے اور ایک درجہ کے زاویہ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں اور جتنا آگے بڑھتے ہیں یہ فاصلہ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ حقیقت و مصلحت کا فاصلہ ظلم و عدل کا فاصلہ ہو جاتا ہے اور امامت و استبداد، جمود و اجتہاد، اور ذلت و عزت...... یعنی گزشتہ و حال۔

آج ہر شخص کی ذمہ داری واضح ہے۔ جس شخص سے، جس روشن خیال سے، جس تاجر سے اور جس عالم سے بات کرو گے تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ ذمہ داریوں اور مسئولیتوں سے واقف ہے، لیکن عمل میں مصلحت نہیں سمجھتا، اس لئے کہ وہ جینا چاہتا ہے اور حقوق و بازار و آسائش کے ضمن میں کسی نہ کسی طرح! اپنے دین کو بھی قائم رکھنا چاہتا ہے اور بلا خرچ و بلا ضرر علیؑ، حسینؑ اور اہلبیتؑ کو بھی قوت قلب، زینت دنیا، اور تسلیت آخرت کے عنوان سے اضافی طور پر اپنے ہمراہ رکھنا چاہتا ہے!

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تشیع کی ساری مسئولیتوں سے گریز کے لئے بہت سی راہیں بنائی ہیں اور بنا رہے ہیں تاکہ ان کی نیند نہ ٹوٹے۔

ساری عمر مصلحت پرست انسانوں کے ہاتھوں حقیقتوں کی پامالی دیکھنے کے بعد، ''مصلحت'' کے بارے میں یہ گرہ دل میں پڑ گئی ہے اور میں اس عقیدہ پر آ گیا ہوں کہ:

''خود حقیقت کے سوا کوئی چیز مصلحت نہیں''۔

اگر تم علیؑ کے شیفتہ ہو تو خود تشیع، مسئولیت آور ہے، ''محب'' کے برخلاف کہ جو

صرف احساس ہے اور مسئولیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام اور تشیع میں شناخت کی گفتگو ہے: "من مات ولم یعرف امام زمانه مات میتة جاهلیه" (جو مرجائے اور اپنے وقت کے امام کو "نہ پہچانے" وہ جاہلیت کی موت مرا)، شیعہ پیرو کے مفہوم میں ہے کہ جو حرکت اور کسی کے پیچھے چلنے کے عمل کو اپنی ذات میں رکھتا ہے اور مسئول ہے۔ ہم پر اس کی مسئولیت ہے جس کے پیچھے چل رہے ہیں اور وہ حقیقت کی خاطر، ہر مصلحت کے مقابل "نہیں" کہتا ہے۔

آج شیعہ عالم کی مسئولیت اور اسی طرح روشن خیال، انٹلکچول، تعلیم یافتہ، متجدد اور ہم میں سے ہر فرد کی مسئولیت واضح ہے۔ وہ تاجر کہ جس کا پیشہ قدیم ایام سے تجارت ہے اور وہ مثلاً اون، ریشم اور غلہ کا سوداگر ہے، اس بات سے واقف ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اور اس کی تجارت موجودہ خطوط پر استوار نہیں ہے، پس وہ فوراً اپنی سرمایہ کاری کو تبدیل کرکے اس مارکیٹ سے نکل آتا ہے اور غیر ملکی مال کا ڈیلر بن جاتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اب اس قدیم کلاسک تجارت کا خاتمہ ہو چکا ہے، لیکن یہی آدمی کہ جو اپنے زمانے سے متعلق ایسی روشن آگاہی رکھتا ہے جب مذہبی مسائل پر آتا ہے تو قدامت پرست اور روایت پسند ہو جاتا ہے، اپنے امور میں معمولی سی تبدیلی بھی نہیں لاتا۔ حتیٰ جو پیسہ اپنی جیب سے نکالتا ہے اس تک میں احساس مسئولیت نہیں کرتا۔ بس یہی کہ پیسہ دے اور اپنی جان چھڑالے۔

ایسے ایک آدمی سے۔۔۔ کہ جو معتدل اور مسئول ہے۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ کس طرح دور بیٹھ کر تم نے اقتصادی امور کی تبدیلی، دنیا کی نئی کروٹ، زمانے کے تغیر، نئی صورت کے مصرف اور دنیا کے معاشی اور تجارتی روابط کی دگرگونی کو محسوس کیا

اور یہ بات محسوس نہیں کی کہ تم اس معاشرے، اس زمانے اور اس مذہب کے مقابل کہ جس سے تمہارا قلبی لگاؤ ہے اور ان شخصیتوں کے مقابل جنہیں تم پیغمبر اور امام مانتے ہو۔۔۔ اور دیکھ رہے ہو کہ یہ چیزیں نوجوان نسل اور تمہاری ثقافت سے رخصت ہوگئی ہیں۔۔۔ مسئول ہو؟ اور نہیں جانتے کہ پیغمبر اسلام اور تمہارے ائمہ کی شناخت کے لئے ایک ''کتاب''، آج ایک مسجد اور ایک امام بارگاہ پر فوقیت رکھتی ہے؟ پھر اس باب میں اتنی بے رخی کیوں؟

میرے علم میں ایسی کتابیں ہیں کہ اگر فارسی میں ان کا ترجمہ ہو جائے تو ہماری نوجوان نسل کو نئے سرے سے ایمان و اعتقاد کی دولت سے مالا مال کر دیگا، لیکن ترجمہ نہیں ہوتا اور وہ اسی طرح پڑی رہ جاتی ہیں، اس لئے کہ اس کو چھاپنے اور مترجم کو اس کا حق دینے کے لئے سرمایہ نہیں ہوتا اور پھر صاحبان ایمان اس عظیم مسئولیت سے غافل...... انسان، معاشرے اور مذہب سے متعلق اپنے دین پر اس طرح سے عامل ہوتے ہیں جس طرح کہ صدیوں پہلے ہوتا رہا ہے، اور نہیں جانتے کہ ایک صدی یا صدیوں پہلے کا مسئلہ پانی کے ذخیرہ کا نہ ہونا تھا، اور آج یہ مسئلہ کچھ اور ہے، شہر میں پائپ لائنوں کی تنصیب کے بعد زیر زمین پانی کے ٹینک بنا کر اسے مسلمانوں کے لئے وقف کرنا کار خیر نہیں ہے، بلکہ اخلاقی یا پھر دماغی خلل ہے!

روشن خیال آدمی کی مسئولیت یہ ہے کہ وہ پوش علاقے کی اشرافی کافی ہاؤسز سے کہ جو مہنگے داموں والی چائے پی کر پسماندہ ممالک کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، باہر آئے اور معلوم کرے کہ عوام پر کیا گزر رہی ہے، اس کی زبان کیا ہے، اس کا مذہب کیا ہے، اس کی مصروفیت کن باتوں میں ہے، وہ کس طرح کی جھوٹی۔۔۔ یا سچی

۔۔۔مسئولیت کو محسوس کرتی ہے، اور اس بات کو سمجھے کہ اس معاشرے کے قلب میں ۔۔۔تانبے، ہیرے، اور تیل کے ذخائر کی طرح ۔۔۔تمدن سے متعلق کس طرح کے ذخائر موجود ہیں کہ جس کو وہ استخراج کر کے اس کا تصفیہ کرے اور معاشرے کو حرکت، بیداری، تدریجی ارتقاء، خلاقیت اور روح عمل بخشے۔

مذہبی عالم کی مسئولیت ہمارے زمانے کے مذہبی فہم اور نوع استنباط میں ایک شیعی انقلاب کا اختراع ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ مصلحتوں کے آگے، عوام کے آگے، عوام کی پسند کے آگے، عوام کے ذوق و ذائقہ و انتخاب کے آگے نڈر، بیباک، اور بے پرواہ رہے اور علم و اجتہاد کی رہبری کو اپنے کاندھوں پر لے، نہ کہ ان کے سامنے، مذہبی عوام کے سامنے جھکا رہے، ہر نئے کام کو ہاتھ لگانے سے گھبرائے، فقہی فروع، کلامی اور فلسفی مباحث اور ذہنی مسائل میں مطلق طور پر غور و تحقیق کے بجائے کہ جو البتہ اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے بہت زیادہ قابل قدر اور قابل افتخار ہیں، لیکن اس سے زیادہ ایک فوری ضرورت اور بھی ہے جو اصل واقعہ اور اصل موضوع ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے وقت، زمانے کی فرصتوں اور اپنی عمر عزیز کے اتنے برسوں کی بربادی اور اتنی فطانتوں کے عاطل و باطل کرنے کے بجائے کہ جو اپنی عمر کے چالیس، پچاس اور ساٹھ سال ان علوم کو حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں، لوگوں میں عمومی بیداری پیدا کرے، ان کے ایمان کو فروغ دے، قرآن کو پیش کرے، لوگوں کو نہج البلاغہ کا درس دے، اس نسل کو رسول خداؐ، علیؑ اور اولاد علیؑ اور ابوذر و عمار جیسے اصحاب کبار کی زندگی، ان کے افکار، اور تشیع کے جہاد اور اس کی خون سے بھری ہوئی تاریخ سے آشنا کرے، اور لوگوں کی رہبری اور امامت میں امام کی

جانشینی کی عظیم رسالت (ذمہ داری) کو گھسیٹے بغیر پورا کرے......

جی ہاں: صرف رسالہ نہیں، رسالت (ذمہ داری)۔

اگر ہم تشیع کی تاریخی سرگزشت اور ان کے اساسی ترین اعتقادی اصولوں اور علمی مکتب پر تکیے کے ساتھ تشیع کی مسئولیتوں کی فہرست مرتب کرنا چاہیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ: شیعہ ہونے کی مسئولیتوں میں ذیل کی یہ باتیں شامل ہیں:

۱۔ باطل کے مقابل، ہر مصلحت کے باوجود۔۔۔ خواہ وہ اپنی نابودی کی قیمت پر کیوں نہ ہو۔۔۔ "نہیں" کہنا!

۲۔ مذہب میں ہر عقیدے اور ہر عمل کے مفہوم اور اس کی قدر و قیمت کو "ایک صحیح اور پاکیزہ رہبر" کے وجود سے وابستہ جاننا اور اس بات پر عقیدہ رکھنا کہ معاشرہ اگر صحیح رہبر سے بے بہرہ ہے تو پھر ہر عقیدہ اور ہر عمل بے ثمر ہے۔

۳۔ اس بات پر ایمان کہ آغاز بشریت سے ختم نبوت تک (یعنی آدم سے خاتم تک) اور وہاں سے عصر امامت کے اختتام تک ایک ہی تحریک اور ایک ہی خدائی مکتب اور ایک ہی جہاد رہا ہے اور اس کا ہدف، حصول کمال، بشریت کی نجات، افراد بشر کی آگاہی اور عالم میں آزادی اور مساوات کا استقرار، اور یہ مسئولیت ایک ایسی وراثت ہے کہ جو نسل در نسل پیغمبروں کو اور ان کے پیشواؤں کو اور عصر غیبت میں حق پرست مسئول انسانوں کو فرداً فرداً پہنچتی ہے، اور یہ وہ مسئولیت ہے کہ جس میں ہر شیعہ کو چاہئے کہ وہ زندگی کو "عقیدہ و جہاد"، ہر مہینے کو محرم، ہر دن کو عاشورہ، اور زمین کے ہر ٹکڑے کو میدان کربلا سمجھے!

۴۔ عدالت کو ایک "جہاں بینی" کے عنوان سے دیکھے (خدا عادل ہے)

اور اس کو پیغمبروں کی رسالت کا ہدف جانے اور اپنے ائمہ کو اس رسالت کی نسبت وفادار رہنے کی پاداش میں جان سے گزرتا دیکھے اور خود کو زمین پر اس کے استقرار و جہاد کی راہ میں ذمہ دار سمجھے۔

۵۔ اپنے آپ کو ہر مسلمان سے زیادہ قرآن اور سنت پر تکیہ کے عمل میں پروان چڑھائے اور اسی طرح سوچے اور اس پر عمل کرے۔

۶۔ تمام انسانوں سے زیادہ (چونکہ وہ مسلمان ہے) اور تمام مسلمان بھائیوں سے زیادہ (چونکہ وہ شیعہ ہے) وہ اشرافیت، گھٹن، استضعافی نظام، بیگاری، بے فکری، استبداد، طبقاتی بنیاد، مصلحت پرستی، قدامت پسندی، برائی اور خیانت کی نسبت نرمی اور سازگاری، قساوت، عوام فریبی، جہل و خوف ولالچ، بیجا ترجیحات، ظلم و زور و جارحیت، فکر و تقلید و تعصب و ذلت، پیری مریدی، دست بوسی، ستم پذیری، مال پرستی، زہد پرستی، گوشہ نشینی، فلسفہ بافی، تعبّد......اور ہر اس چیز کے مقابل جو انسان کو کمزور، مدہوش، حقیر، یا تقسیم کرتا ہے، مبارز اور توافق ناپذیر رہے۔

۷۔ علیؑ کی طرح کام کرے، عبادت کرے، تلوار چلائے، سرزور رہے، تحمل سے کام لے، پاکباز بنے، اچھی بات کرے، عمل سے رشتہ جوڑے، سوچ سے کام لے، پیداوار بڑھائے، بھوک مٹائے، نوع بشر کی آگاہی کے لئے کوشاں رہے، برائیوں کا بیباکی سے پردہ چاک کرے۔ اور خوف نہ کھائے، سربلند رہے، مکتب کی راہ میں جہاد کرے، ''وحدت'' کی راہ میں تحمل کا مظاہرہ کرے، عدالت کی راہ میں تھک کر نہ بیٹھے، کجی پر ''ہاں'' نہ کہنے کی راہ میں اپنے آپ کو نابود کرے۔

۸۔ ہمارے روشن خیال لوگوں کی مسئولیت، نبوت کی وراثت کو تاریخ میں،

اور ہمارے علماء کی مسئولیت، امامت کی نیابت کو، اسلام میں قائم رکھنا ہے۔

۹۔ ہر شیعہ گھرانے کی مسئولیت، ایسے خاندان کی پیروی ہے کہ جس میں علیؑ باپ، فاطمہؑ ماں، زینب بیٹی، اور حسینؑ بیٹا ہے!

۱۰۔ بالآخر ہر دور اور ہر نسل میں، ہر شیعہ کی مسئولیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز اور ہر کسی سے زیادہ ''انقلاب والے کربلا'' اور ''شہادت والے حسینؑ'' سے متمسک ہو اور ''رہبری'' اور ''برابری'' کو اصل ایمان اور اصل ہدف سمجھے اور اس پر برقراری کو اپنی مسئولیت جانے اور یہ سب، یعنی ''علیؑ'' کو ایک بت کی طرح نہ پوجا جائے بلکہ ایک رہبر کی حیثیت سے ان کی پیروی کی جائے اور ایک لفظ میں: ''علیؑ سا'' رہے، ''علیؑ سا'' جیئے اور ''علی سا'' مرے۔

کہ ''علیؑ کا شیعہ ہونا'' یعنی یہ

اور ''شیعہ ہونے کی مسئولیت'' یعنی یہ!

والسلام

ملحقات

ملحقات

ص ۱۰۲ ۔۔۔ س ۸

ذکر کے لفظ کا بھی یہی ماجرا ہے۔ اس لفظ کا ایک آئیڈیالوجیکی مفہوم ہے۔ خداوند عالم تمام انبیاء کے ہدف کو "ذکر" سے تعبیر کرتا ہے، اور قرآن کو بھی ذکر کہتا ہے، حتیٰ رسول اسلام کو بھی اسی عنوان سے پیش کرتا ہے (ذکراً رسولا......)۔

ذکر یاد دہانی کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی رسولانِ الٰہی، انسان کے لئے کوئی نئی اضافی چیز نہیں لاتے۔ یعنی دین نوع بشر کے لئے پیغمبروں کی لائی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ اس لئے مبعوث ہوتے ہیں کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی ان خدائی اقدار کو (جنھیں وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کے زیر اثر "بھول" گیا ہے)، "ذکر" کے ذریعے نئے سرے سے یاد دلائیں اور بتائیں کہ "تم کون ہو"! اس لئے کہ یہ ساری کجرویاں اس لئے ہیں کہ انسان نے اپنے آپ کو بھلا دیا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا اور نہیں سمجھتا کہ "وہ کون ہے"۔

جس طرح کہ اس اعلیٰ مرتبت والے علی نے ۔۔۔ کہ جو انسان اور مذہب دونوں کو ہر انسان اور ہر مومن سے زیادہ بہتر جانتے ہیں ۔۔۔ انسان کے بارے میں کہا ہے:

"دائک فیک، ولا تبصر و دوائک فیک، ولا تشعر"

(تمہارا درد تمہارے اندر ہے اور تم اسے نہیں دیکھتے اور تمہاری دوا بھی تمہارے دردوں میں ہے اور تم اس کا فہم نہیں رکھتے)۔

اور پیغمبروں کی رسالت کے بارے میں، ایک عمیق اور انسانی تعبیر کے ساتھ فرماتے ہیں، یہ خدائی شعلہ خود انسان کے اندر ہے ☆ اور یہ ہستیاں اس لئے آئی ہیں "لیثیروا دفائن العقول"...... تاکہ وہ خرد کے ان خزانوں اور خودآگاہیوں کو کہ جو زندگی کی پلیدیوں، پستی پسندوں، کمزدیوں، اخلاقی انحطاطوں..... اور روزآنہ کے مسائل، بداخلاقیوں، حقارت آمیز رویوں، اور انسان کو مسخ کرنے والے نقابوں اور مفلوج کرنے والے تعصبات کے ملبے تلے دفن اور یادوں سے محو ہوگئی ہیں، انقلابی انداز میں ایک بار پھر اجاگر کریں۔

اور عجیب تر یہ کہ یہ لوگ یونانی سوچ کو "ہیومنزم" (اصالت انسان) والی سوچ، اور مذہبی، خاص کر اسلامی سوچ کو "فیتانزم" (آسمانی طاقت کے ہاتھ کا کھلونا بننے والے اور قضا و قدر کی زنجیر میں جکڑے جانے والے انسان کی حقارت) والی سوچ گردانتے ہیں۔

ان سارے انحرافی قضا و قدر کا بنیادی سبب اس میں ہے کہ غیر بھی اور دوست بھی، ہمیشہ مسلمانوں کو خلاف واقع اسلام میں لیتے ہیں اور یہ ایک بڑی مصیبت ہے۔

یہی لفظ "ذکر" اپنی اس تعمیری اور ترقی پسندانہ مفہوم میں کہ جو "مسلمان" کو شخصیت اور انسانی اصالت بخشتا ہے، اس طرح کی ایک خاص صفت کے ساتھ وہ مذہب کے اس منفی کردار کے برخلاف کہ جو اصالتِ انسان کی نسبت اس پر عائد ہے یا

☆...... یونانی سوچ کے برخلاف کہ جس میں پرومتہ "خدائی آگ" کو آسمان سے لاتا ہے اور اسے بنی نوع انسان کے حوالے کرتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہے۔

یہ الزام اس کے سر ہے، انسان کو اصالت بخشنے کا سب سے بڑا عامل ہو جاتا ہے اور اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان خود کو خاطر میں لائے اور اسلام، فطرت اور خود اپنے اندر الٰہی روح کو اور خدا کی جانشینی کے مقام کو دریافت کرے۔ وہ کونسی خدا بیزار انسان پرستی، کونسا ہیومنزم، اور کونسا فلسفہ ہے جو انسان کے لئے اس طرح کے وسائل کا حامل ہو۔ یہ صرف اسلام ہے کہ جو انسان کو ماورائی وجود کا سرچشمہ اور خدائی ماہیت دے سکتا ہے، میٹریلسٹ کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اس کو بھی دیگر مادی مظاہر کا ہمزاد اور ہمذات گردانے، اس لئے کہ اس کے پاس عنصری گھر کی چہار دیواری کے باہر کچھ بھی نہیں ہے کہ جسے وہ انسان کو دے۔ یہ اسلام ہے کہ جو ''پیام ذکر'' کے ساتھ اس کو کہ جو خاکی جانوروں کے مانند و ہمخانہ ہو گیا ہے، زمین کی جلاوطنی میں خدائی شان کا حامل بنائے ☆ اور کوشش کرے کہ بنی آدم ''اپنے آپ'' میں آئے اور اپنی بہترین و بالاترین زادگاہ اور ماورائی سرچشمہ اور نیز خدائی ماہیت و استعداد اور اصل نسب کو حافظے میں لائے...... لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی انسان سازی کا ''خدائی لفظ'' کہ جو شعار رسالت، صفت قرآن، صفت پیام آور انسان، اور انسان کی جلالت و عظمت کی نسبت اعلیٰ ترین خدائی توصیف ہے، اس صورت میں آگیا ہے کہ جس کا اطلاق ان اوراد پر ہوتا ہے جو تسبیح نامی دھاگے میں پروئے ہوئے ان مہروں کو گھمانے اور سکون کے ساتھ دو ہونٹوں کو ہلانے سے متصل ہے، اور جو نہ صرف یہ کہ کسی چیز کی یاد آوری نہیں کرتا بلکہ عربی مخارج سے الفاظ کے تلفظ اور تکرار کی گنتی کے صحیح تعین پر توجہ میں ذاکر کے بے انتہا وساوس، اگر ذہن میں خدا اور خدائی

☆...... عبدی اطعنی حتی اجعلک مثلی (اے میرے بندے میری اطاعت کر یہاں تک کہ میں تجھے اپنا سا بناؤں)

مفاہیم کی کوئی یاد بھی باقی ہو تو اسے بھی مٹا دیتے ہیں۔

آپ کہیں گے: تسبیحات حضرت زہرؑا؟

میں نے اس کی داستان اور خاص طور پر اس کے عدالت خواہانہ، سبق آموز انسانی فلسفہ کو ''فاطمہؑ، فاطمہؑ است'' نامی کتاب میں پیش کیا ہے۔ احساس اور درد سے خالی اس معطل دماغ والے مطمئن اور پرسکون آدمی کی ہونٹوں، دانتوں اور تالو سے کھیلتی ہوئی زبان ورد نہیں ہے، بلکہ تسبیحاتِ فاطمہؑ کو وہ ''ذمہ دار اور روشن خیال آدمی''۔۔۔ کہ جو انسان سے انسان کے استثمار و استخدام کو ایک المیہ سمجھتا ہے اور اس بات سے مضطرب اور متلاطم ہوتا ہے کہ رہبر و رہنما پیغمبرؐ کی عزیز ترین اکلوتی بیٹی، اور اپنے معاشرے کی بلند پایہ ترین خاتون، اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے پر مجبور اور ایک ملازمہ تک سے محروم ہے۔۔۔ اس زاہد و عابد سے زیادہ عمیق، زیادہ سبق آموز اور زیادہ بہتر سمجھتا ہے جو ذکر میں صرف ''تسبیح گھماتا ہے''!

کاش کہ زمانے کے تقاضے کے باوجود، مذہبی عوام اور مذہب دشمن خواص اپنی گٹھ جوڑ کے ساتھ، اور نیز وہ عوام دشمن اور مذہب دشمن عناصر کہ جنہوں نے اسلام کی پوستین کو الٹا پہنا ہوا ہے، اس مذہب کا رخ کریں اور سمجھنے کی غرض سے اس پر توجہ دیں۔

(۲) ص ۱۲۷ س ۷

الف: جب میں ''شیعہ ایک کامل گروہ'' کو اپنی تقریر کا عنوان بنانا چاہ رہا تھا تو میرے بہت سے دوستوں نے مجھے نصیحت کی (اور ان کی نصیحت بھی افسوس کے ساتھ

کہنا پڑتا ہے کہ بجا تھی) کہ : یہ عنوان ۔۔۔ خاص کر ''ارشادیوں'' (حسینیہ ارشاد والوں) کی جانب سے ۔۔۔ ممکن ہے ، ''ارشادی مخالفین'' = (اضلالیوں !؟) کو پھر کوئی بہانہ فراہم کرے گا اور پھر ان کے اطراف کے لوگوں میں اس دینی تبلیغ اور علمی تنقید کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ :

''واہ واہ ! بڑی خوشی کی بات ہے ! شیعوں کے لئے بھی گروہ پیدا کیا گیا ہے ......
اب ان کے کرنے کو اور کونسی چیز رہ گئی ہے !؟'' ......

اگر آپ نے پوچھا کیوں ؟ تو ہم سے سوال کیجئے تا کہ ہم آپ کے سارے مشکلات حل کریں اور آپ کو جواب دیں : ''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم اہلبیت کے شیعہ افراد کو ۔۔۔ سرے سے ۔۔۔ ''حفظی'' بنائیں ! حفظیوں کو تو آپ جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے ؟ حفظی آدمی ۔۔۔ کہ جس کا صحیح تر اور علمی تر تلفظ : ''حبزی'' ہے ۔۔۔ یعنی ایک بے دین اور خدا دشمن آدمی ۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں صحیح ہے کہ یہ لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کی مخصوص جگہ رکھتے ہیں کہ جب اکیلے ہو جاتے ہیں تو وہاں جا کر دروازہ بند کرتے ہیں اور پھر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں ! کسی نے اس کے اپنے طالب علم کی زبانی ۔۔۔ کہ جو اتفاق سے اس کا حامی بھی تھا اور اس کا ارادہ بہتان لگانے کا بھی نہیں تھا کہ ہم کہیں کہ اس نے یہ بات گڑھی ہے ۔۔۔ اس کی کہی ہوئی یہ بات نقل کی ہے کہ : ''ہم یہودیوں کے دشمن نہیں بلکہ اسرائیل کے دشمن ہیں وہ بھی اس کے دین کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ فاشسٹ ، استعمار اور امپریالزم کا گڑھ ہے'' ! ہاں جی ہاں حبزی آدمی اس طرح کی چیزوں کا مخالف ہے ، یہ مسلمان آدمی کا وطیرہ ہے کہ اس کی دشمنی دین کی خاطر ہوتی ہے ۔ وہ یہودیوں

کا دشمن ہے خواہ فلسطینی فدائیوں کے صف میں اسرائیل سے برسر پیکار کیوں نہ ہو، اور مسلمانوں کا دوست ہے اگر چہ وہ اسرائیل سے بھی بڑھ کر فاشی، امپریالیزمی اور استعمارگر کیوں نہ ہوں۔ قبر کی پہلی رات تم سے تمہارے عقیدے کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور اگر عمل میں تم کورے ہو تو تم سے اہلبیت کی محبت اور ان کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا۔ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم فاشی یا امپریالسٹ؟ تم دیکھ رہے ہو کہ ان صاحب نے اپنے آپ کو اسلام شناس متعارف کرایا ہے اور یونیورسٹی میں دین شناسی پر لیکچر دے رہے ہیں اور دین کے حقائق سے اتنے بے خبر ہیں! حتیٰ علمی اور شرعی اطلاعات تک سے ناآشنا ہیں اور اس پر یہ کہ وہ ''اہل فن'' سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا کوئی دین بھی نہیں ہے، یہ وہ شخص ہے جو اخبارات کو، حبزیوں کو، اور نیز امپریالزم، عرب وعجم، مشرق ومغرب، پہلے درجہ کی دنیا اور تیسرے درجے کی دنیا، اور فلسطینی اور اسرائیلی جنگ وجدال اور اس طرح کی حبزیاتی باتوں کو شیعہ سنی جنگ پر مقدم جانتا ہے اور اسرائیل سے فلسطین کی واپسی کو، سنیوں سے فدک کی واپسی پر ترجیح دیتا ہے جس کے بارے میں ہم نے سبزوار کے کورٹ آف جسٹس میں اپیل دائر کی ہے اور ابوبکر کے خلاف ''عرض حال'' (Petition) پیش کیا ہے تا کہ باغ فدک کو اس کے ایک ہزار تین سو اناسی سالہ زرعی آمدنی کے شمار اور چودہ سو سال کے ''تاخیری جرمانے'' اور نیز گیارہ ہجری سے لے کر اس وقت تک یعنی ۱۳۷۹ تک (کہ جو ابی قحافہ کے بیٹے ابی بکر ساکن مدینہ کے خلاف سبزوار کے سیشن کورٹ میں Petition داخل کرنے کی تاریخ ہے) غصب شدہ عائد ہونے والے کمپاؤنڈ انٹرسٹ کے ساتھ واپس لیں۔ البتہ اس مارک اپ کے موضوع

کے لئے بھی، کہ ممکن ہے شرعی اعتبار سے بعض خدا ناشناس سنی مآبوں کی طرف سے کہ جن کو ولایت علیؑ سے دشمنی ہے اور جو فدک کی واپسی کے مسئلہ سے خوف زدہ ہیں اس پر اشکال عائد ہو کہ اس کا شمار ربا (سود) میں ہوتا ہے اور اس پیسے کا استعمال شرعی نہیں ہے، ہم نے سوچ رکھا ہے اور خدا نے توفیق دی کہ اس کے لئے کوئی راستہ نکل آئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اس کی ایک ایسی اچھی شرعی صورت نکالی ہے کہ سبزوار کا ٹریبونل بھی اس کی نسبت کوئی اشکال پیدا نہیں کرسکتا۔ اور اگر پھر بھی کسی نے اشکال پیدا کی، اس لئے کہ ان کے دلوں میں اہلبیت کی نسبت کینہ ہے تو وہ سنی نہیں جائے گی۔ جی ہاں، فدک کی آزادی، اس ڈھیر ساری دولت کا حصول اور سادات میں ورثہ کے عنوان سے اس کی تقسیم (کیا ایسی چیز ہے جسے پس پشت ڈالی جائے)۔ ہمارے ذہین سیاسی دوستوں میں ایک دوست وہ ہیں کہ جو حسینیہ ارشاد اور ارشادیوں کی تحریر پر ہر طرح کی تباہ کن باتوں کے موجد ومحرر ہیں اور دوسرے دوست اس کی باتوں کو ایسی شکل، ایسے لحن اور ایسے انداز میں اپنے نام سے لکھتے ہیں کہ کسی کو شک وشبہ تک نہیں ہوتا کہ یہ سازش ہے یا یہ بناوٹی ہے تاکہ مختلف جگہوں سے اعتراض کی صدائیں بلند ہوں۔ اور ان متعدد مکتوبی اور املائی زہریلی باتوں میں آپ دیکھتے ہیں کہ جن کا اس میں ہاتھ نہیں ہے ان کا نام ہے اور جس کا ہاتھ ہر جگہ ہے اس کا نام نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اہل ریا نہیں ہے اپنی خودنمائی نہیں چاہتا، نہیں چاہتا کہ لوگ اسے جانیں۔ جی ہاں، یہ وہی شخص ہے کہ جس نے ''ارشاد'' سے چھپنے والی علی شریعتی کی کتابوں کے جلد کی پشت پر اس کے مونوگرام کا۔۔۔ کہ جو شرک کے مقابل، ''لا'' سے توحید محمدؐ اور شوریٰ کے مقابل ''لا'' سے تشیع علیؑ ہے، تجزیہ کیا اور اس کے ٹکڑوں سے ایک عدد عمر

اور دو عدد عثمان! (بلا علی) ترتیب دیئے کہ جو در حقیقت بڑا حیرت انگیز تھا اور یہ صورت بعض اذہان پر اثر انداز بھی ہوئی! جی ہاں، گو کہ وہ علماء کے لباس میں رہتے ہیں اور اہل علم کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں لیکن بطن سیاست میں زندگی بسر کرتے ہیں، بالائی سطح کے لوگوں سے ان کے بڑے مراسم ہیں اور بین الاقوامی سیاست کا بھی اچھا درک رکھتے ہیں، انہوں نے ایک ایسی بات کہی کہ جس سے پتہ چلا کہ یہ ''ارشادی'' لوگ (یعنی حسینیہ ارشاد والے)، خاص طور پر علی شریعتی کس ماہیت کے آدمی ہیں اور کس طرح وہ وہابیت، کمیونسٹ، اور چرچ کی مدد کر رہے ہیں کہ جو بین الاقوامی سطح پر ایک ہیں۔ جب سے ہم نے یہاں غصب فدک کے مسئلہ کو اپنا شعار بنایا اور شیعوں کے خفتہ افکار کو بیدار اور مجتمع کیا اور اہلسنت سے فدک کو واپس لینے کے لئے تحریک چلائی، ان لوگوں نے ''غصب بیت المقدس'' کی آواز بلند کی تاکہ لوگوں کی توجہ اس طرف چلی جائے اور اولاد فاطمہؑ کا حق، چودہ سو سال بعد ایک دفعہ پھر پامال ہو جائے۔ جو بات بڑی وضاحت سے دین و ولایت و امت کے دشمنوں کی خائنانہ سازش کو ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ تاریخوں پر غور فرمائیں تو دیکھیں گے کہ صہیونزم کے خطرے، امپریالزم اور سرائیل کے اکیلے، استعمار۔۔۔ کلیسا۔۔۔ اسرائیل کے مشترک محاذ کے مقابل سارے مسلمانوں کی وحدت فکر، اور ''غصب شدہ بیت المقدس کی آزادی'' کے شعار کو ان شیعہ نما افراد نے کہ جو نوشیروان کی عدالت اور شاہ عباس کی ولایت تک کے معتقد نہیں ہیں، ٹھیک جون ۱۹۶۷ عیسوی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، اور یہ وہ تاریخ ہے جس میں۔۔۔ وارثوں میں سے ایک وارث۔۔۔ جناب آقای سید حسین واعظی نے فدک کی

آزادی کے لئے سبزوار کے سیشن کورٹ میں ابی بکر کے خلاف شکایت کی۔

"تو خود حدیث مفصل بخوان ازین مجمل!"

جی ہاں، آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا کام دکھادیا اور بتدریج اپنے کفر کو لوگوں کے وجود میں سمودیا۔ پہلے منبر کو تریبون (Tribune) میں بدلا، پھر امام بارگاہ کو ہال بنایا، اور فرش کے بجائے کرسیاں لگائیں، اس کے بعد دینی تقریر کے درمیان، وہ بھی امام بارگاہ میں جو حسینؑ بن علیؑ کے نام سے، ان کے، اہلبیت سے، حتیٰ اس چھ ماہ کے بچے سے وابستہ ہے جو تشنہ لب تھا منبر پر پانی پینے کی رسم قائم کی، بعدازایں دعا کی کتاب کے حاشیہ پر اعتراض کیا کہ جس میں کہا گیا تھا کہ فلاں الفاظ کے ورد سے ستر شہیدوں کا ثواب حاصل ہوگا اور اس کے بعد گزشتہ سال بڑی ڈھائی سے اپنی کتاب کی جلد پر لکھا "تشیع کی مسئولیت" یعنی شیعہ ہونا جرم ہے، گناہ ہے، مسئولیت کا حامل ہے! اگر شیعہ ہوگے تو خدا کے سامنے مسئول ہوگے، ابھی چند شب پیشتر اس نے مکمل طور پر دین کے دائرہ سے اپنا قدم باہر رکھا اور محمدؐ، علیؑ، موسیٰؑ حتیٰ ابراہیمؑ کو زمانا ترک کرتا ہوا، اور قم، کربلا، نجف اور مدینہ کے قبور مطہرہ کو حتیٰ جناب زینب کے مزار اور خود مصر میں "رأس الحسین" کو مکانا چھوڑتا ہوا، سیدھے پانچ ہزار سال پیچھے کی طرف گھوم گیا اور فراعنہ کے قبور اہرام سے جالگا، نہ کہ خود بادشاہوں اور ملکاؤں سے بلکہ پست سے پست افراد کی قبروں یعنی فرعون کے غلاموں کے قبور سے! اور وہاں بیٹھ کر پانچ ہزار سال پہلے کے غلیظ اور گندے جنازوں پر آنسو بہانے اور مجلس پڑھنے لگا، (جی ہاں، اہلبیت کے سوگ میں اور ان کے بدن کے زخموں اور ان کی پیاس پر رونا اور مجلس برپا کرنا جائز نہیں مگر فرعون کے غلاموں پر جائز ہے اور لازم بھی!) اور پھر بعد

میں عزیز بھائیوں، عزیز بہنو ے اور حسینیہ، ارشاد میں ہزاروں سننے والوں کے سامنے کھل کر اعتراف کرتا ہے حتیٰ اپنی کتاب "ہاں دوست ایسا ہی تھا" میں اپنی زبان اور اپنے قلم سے۔۔۔ کہ جس کی گواہی میں ٹیپ اور کتاب دونوں موجود ہیں۔۔۔ کہتا بھی ہے اور لکھتا بھی ہے کہ: "میں (علی شریعتی اور ان کے ہم خیال لوگ کہ جو اپنے آپ کو علوی اور ہم کو صفوی شیعہ سمجھتے ہیں!) اس تمدن، اس سر بفلک اہرام اور زمین پر ہر جگہ ان گنجینوں، ان معبدوں اور ان محلات کا دشمن ہوں، اس تمدن اور اس تاریخ سے مجھے نفرت ہے بغض ہے (بغض ہے! خود کہتا ہے) اور محسوس کرتا ہوں کہ ان ہولناک اہرام تلے مومیائی شدہ افراد سے، جن کو ہمیشہ لوگوں کی بردگی کی علامت کے طور پر رہنا ہے سوائے نفرت، میرا اور کوئی رابطہ نہیں ہے، میں تمہاری قوم، تمہارے خاندان اور تمہارے طبقے سے ہوں، (اعتراف! فرعون کے غلاموں سے کہہ رہا ہے! غور فرمایئے!) جور کی ان تعمیرات کے لئے پتھر ڈھونے کا یہ بھاری بوجھ میرے کاندھوں پر گرانی کر رہا ہے۔ یہ وہ تعمیرات ہیں کہ جو میرے اجداد اور میرے بہنوں اور بھائیوں کی ہڈیوں پر بلند ہوئی ہیں! میں اس پانچ ہزار سال کو جس میں میرے بھائی آپ چلے گئے اور میں رہ گیا، فرعونوں، قارونوں، بلعموں اور ان کے دیگر ساحروں اور ملاء و مترفوں (صاحبان زر و زور) کے ساتھ! اسی طرح پاؤں میں زنجیر، پہلو پر تازیانوں، پشت پر پتھر اور گلے میں رسی کے عالم میں ہوں اور بھوک اور دکھ میرا کھانا پینا ہے! کسی نے ہماری سرنوشت پر نظر نہیں ڈالی، کسی نے ہماری رہائی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے، نہ خدا، نہ پیغمبر اور نہ کوئی پارسا! اس لئے کہ ہم ملعونِ سرنوشت اور مشیت کے پھٹکارے ہوئے لوگ تھے، حتیٰ وہ سچے پیغمبر بھی جو غلاموں اور اسیروں کی

نجات کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اپنی قوم کی طرف گئے، حتیٰ موسیٰ ہمارے درمیان سے ان بندوں کو آزادی کی طرف لے گئے جو ان کی قوم کے لوگ تھے اور ہم میں سے کسی کی نجات کے درپے نہیں ہوئے، یہاں تک کہ خبر آئی کہ کوئی شخص پہاڑ سے اترا ہے اور زمین کے سارے مصیبت زدوں کی بات کر رہا ہے۔ یہ وہ شخص نہیں کہ جو کسی شہزادے، کسی نمبردار، یا کسی زردار کے محل سے اترا ہے بلکہ غربت و فلاکت سے نکلا ہوا ایک محروم قوم کا اُمّی شخص، کہ جو بچپن میں گلہ بانی اور جوانی میں قافلہ کا محنت کش آدمی ہے۔

ہمیں یقین آ گیا کہ نجات اور عدالت دونوں کی رسائی ہوگئی ہے لیکن ہم اس تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ ہم سے رخصت ہوگئے اور ان کے جانشینوں کی حکومت میں سلاسل، تازیانے، غارت گریاں اور کذب گوئیاں،۔۔۔ آپؐ کے عہد کے سابقہ دور سے بدتر۔۔۔ عود کر آئیں!

اور ان کا گھر بھی ویران اور ان کا گھرانہ بھی ہم سے زیادہ اور ہم سے بدتر صورت میں ظلم و غصب و خیانت کی بھینٹ چڑھا۔

اور یہی وجہ ہے بھائی، کہ ایک ہزار چار سو سال سے میں نے اپنا سر فاطمہؑ کے متروک گھر کی دیوار پر دھرا ہے اور ان تاریک صدیوں میں کسی دھمکی، کسی لالچ، کسی تلوار، کسی مال و زر، اور کسی تسبیح کی تدویر سے اپنا سر نہیں ہٹایا ہے اور کسی ایوان، کسی قصر، کسی معبد، اور کسی خزانے کا رخ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ مٹی کے اس حقیر گھر میں فاطمہؑ ہیں، علیؑ ہیں، حسنؑ و حسینؑ ہیں اور زینب۔ ایسے شوہر، بیوی، بھائی اور بہن، جو ہماری عورتوں، مردوں، بہنوں، اور بھائیوں کی طرح بھوک، مشقت، فریب، حق تلفی

اور ظلم و زیادتی کے دکھ کو، حقیقی معنوں میں سمجھتے ہیں۔ ان سب نے یہ مصیبتیں جھیلی ہیں اور اس طرح کی زندگی بسر کی ہے تاکہ انسانیت کے اس المیہ اور تاریخ کے دکھ کی اس سرنوشت کو اپنی سرگزشت میں ظاہر کریں۔ وہ خاندان کہ جس نے فرعون سے بڑی طاقتوں کو زیر کیا ہے اور زمین کے قارونوں کے خزانوں کو عوام کے بیت المال میں بھرا ہے اور زمانے کے عظیم ترین مذہب کی طاقت کو اپنے اختیار میں لیا ہے، بھوکہ ہے تاکہ دنیا کے بھوکوں کے ساتھ ہم پیالہ رہے، گردن میں رسی بندھوائی ہے تاکہ انسان کی بردگی کو آشکار کرے، دین سے کھیلنے والوں کے غصب و تزویر کا شکار اور ''تعصب'' کی زہر آلود تلوار کا شہید ہوا ہے تاکہ یہ بتائے کہ یہ لوگ دین خدا اور اس کی کامل ترین طاقت کے نام سے، دین کے عظیم ترین پرورش یافتہ اور خدا کے پاکیزہ ترین دوست کو اس طرح مغلوب کرتے ہیں کہ یعنی ''سنت پیغمبر''! اور پھر اسے مارتے ہیں، کہ یعنی ''حکومت خدا''، اور اس کی یاد اور اس کے نام پر ہر نماز میں لعن کرتے ہیں، کہ یعنی ''عبادتِ مومن''!

''جی ہاں' آپ نہیں جانتے کہ اس نے اپنی اس طرح کی رومانٹیکی تحریر سے کیا، کیا ہے! یہ بات ہم ''اہل فن'' جانتے ہیں کہ جو ''فن ولایت'' سے متعلق امور کے متخصص (ماہر) ہیں۔ اسے فرانس ''والیانس'' مدرسہ میں بھیجا گیا کہ جو زبان کی تعلیم کا ایک بہت معروف مدرسہ ہے۔ اس ذاتی آمادگی اور استعداد کے ساتھ جو اس میں تھی انہوں نے بیس سال کے عرصے تک اپنے مخصوص طریقوں سے اسے ''فن زبان آوری'' کی تعلیم دی اور اس طرح ''علیم اللسان'' بنایا کہ بولنے میں ایک بے بدیل استاد ہو گیا اور اب وہ ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں، ڈاکٹروں، گریجویٹوں، اور آج کی

زبان میں ان روشن خیال لوگوں کو کہ جو اس کی منطق سے نابلد ہیں، جن کی ولایت کمزور اور جن کا رشتہ مذہب اور احکام شرع کے روحانی مراتب اور ایمانی فنون سے نہیں ہے اور ان میں عام سطح کے لوگ بھی ہیں گمراہ کرتا ہے اور اپنے خاص جادو بھرے لفظوں اور ساحرانہ گفتگو سے انہیں مجذوب و مسحور کر کے وادی فنا میں کھینچ لاتا ہے اور روز عقاب سے بھی نہیں ڈرتا۔ جو کوئی اس کے اسی ''ہاں دوست ایسا ہی تھا'' والی کتاب کو پڑھے گا اور اہل اصلاح نہ ہوگا اور دینی متون اور اسلامی علوم میں، خاص طور پر ولایت و محبت اہلبیت میں آگاہی اور بینائی نہیں رکھتا ہوگا وہ ڈگمگا جائے گا اور ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ دیکھئے ''استعمار'' کے قلم نے یہاں کیا رنگ دکھایا ہے؟ یہ وہ شخص ہے کہ جس نے فرانس کے والیانس مدرسہ میں کہ جو زبان آوری (فن تقریر کی تعلیم) کا مدرسہ ہے، معاشرتی علوم میں طب کی تعلیم حاصل کی ہے......''

آپ یقین نہیں کریں گے؟ شیخ محمد علی انصاری کی ''ارشاد کے مقرر ڈاکٹر علی شریعتی کی رد میں اسلام اور روحانیت کا دفاع'' نامی کتاب حاصل کیجئے، ''ڈاکٹر علی شریعتی کو سمجھئے'' کے عنوان سے اس کا پہلا باب میری بیوگرافی پر مختص ہے۔ البتہ نہیں سمجھتا کہ کسی کے افکار و عقائد کو پڑھے بغیر، سنے بغیر اور سمجھے بغیر، خود سے اس کے بارے میں باتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ اس کو اسی طرح پیش کیا جا سکتا ہے جس طرح اس نے کہا گیا ہے اور جس طرح بیچ کا آدمی اس سے راضی ہو۔ حتیٰ آپ اس کے عقیدے کے خلاف اس پر تہمت باندھ سکتے ہیں، اس کی رد کے عنوان سے اپنی باتوں کو اس سے منسوب کر سکتے ہیں۔ بھلا کتنے فیصد آدمی ایسے ہیں جو اصلی منابع سے رجوع کریں؟ اور اسے ان سے لغویات اور وقاعیات سے ملا کر دیکھیں اور تمہاری باتوں کو

کنٹرول کریں اور سمجھیں کہ تم نے کون کونسی جگہوں کو حذف کیا ہے، کون کونسی جگہوں کو پس وپیش گرا کر نقل کیا ہے۔ کہاں کہاں توڑا یا موڑا ہے، کہاں تحریف کی ہے، کہاں سرے سے بات گڑھی ہے، کہاں بالکل الٹی بات کہی ہے۔ کہاں اس کے عقیدے اور اس کی باتوں کی ضد پر بات کی ہے یا جھوٹ موٹ کسی عقیدے کو اس سے نسبت دی ہے، کہاں وفادار رہے مگر جملہ کو صحیح طور پر نہ پڑھ سکے، حتیٰ اس کے مفہوم کو نہ سمجھ سکے یا اس کے الٹ سمجھے.....؟ کتنے فیصد آدمیوں کو اس طرح کی غور طلب باتوں کا حوصلہ ہے، کتنے فیصد وہ لوگ ہیں جو کسی شخص، کسی کتاب، یا کسی تنظیم اور ادارے کے بارے میں صرف اپنے دوست، اپنے جاننے والے، اپنے ہم منصب، اور اپنے ہمسایہ کی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں، یا یہ سب ایک طرف، صرف پہلی بار جو بات کسی سے سن لیتے ہیں۔ وہ فوراً ان کی اپنی بات ہو جاتی ہے اور اس میں ان ہی کی تحقیق، ان ہی کا تجربہ اور ان ہی کا استنباط ہوتا ہے اور اسی عنوان سے وہ ہر جگہ اس کی تکرار اور اس کی تبلیغ کرتے ہیں! اور اس کے باوجود یہ سارے امور بہت آسانی، بہت آرام، اور عام صورتحال کے ساتھ جاری رہتے ہیں، اور دین وایمان وخدا اور روز آخرت اور تقویٰ و تعصب وتقدس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ ایسے لوگ جن کی یہ عادتیں، یہ مصروفیت اور یہ روحانی لذت ہے،...... نماز، روزے کے پابند نہ ہوں اور ولایت واہلبیت کی ارادت سے بے نیاز ہوں، مگر کیا وہ لوگ جوان ہی دس دنوں میں، وہ بھی محرم، صفر اور رمضان کے عشروں میں اور ان عزیز ترین راتوں میں، ان مقدس ترین مقاموں اور تاریخ کے ان محترم ترین ٹریبونز (Tribunes) پر روح وعلم وتقویٰ اور تبلیغ کے منصبی لباس میں شروع سے آخر تک من گھڑت باتیں ٹھوکتے

ہیں، دشنام طرازی کرتے ہیں، خطرناک انداز میں لوگوں کو اکساتے ہیں، گندی تہمتیں لگاتے ہیں، حیرت انگیز بہتانیں باندھتے ہیں، ایسے ایسے احکامات صادر کرتے ہیں کہ قرون وسطیٰ کے کلیسا بھی اس کے سامنے شرما جائیں، مقدس ترین جذبات و احساسات کو۔۔۔ کہ جو خدا پر ایمان اور علیؑ و فاطمہؑ و حسینؑ اور خاندان نبوت کے عشق سے عبارت ہے۔۔۔ ذاتی منفعت جوئی، خودنمائی، عقدہ کشائی اور اوپر اوپر تک پہنچنے کی سیڑھی بناتے ہیں، علیؑ کی ولایت اور حق پرستی والے شیعہ مذہب سے تکفیر کا تازیانہ تیار کرتے اور حق تلفی کے لئے حق کے سر پر مارتے ہیں، اور اسے ہر اس زبان کو کاٹنے اور ہر اس قلم کو توڑنے کے لئے کام میں لاتے ہیں کہ جو ان کے ذاتی مفادات، ان کی انواع واقسام کی مصلحتوں اور ان کی سماجی حیثیت کو آشکار کرتا ہے۔.....شرعی احکامات بجانہیں لاتے؟ کیا یہ لوگ اہل نماز نہیں، روزے نہیں رکھتے مجلس، ماتم، دعا، زیارت اور عبادت سے رشتہ نہیں جوڑتے؟ کیا سارے خوارج، ان سب سے زیادہ مقدس، ان سب سے زیادہ عبادت گزار اور ان سب سے زیادہ مومن نہیں تھے۔ ایسے لوگ بہت ہیں کہ جو تباہ کاری، حق تلفی، اور بہتان تراشی کو، تعبد و تدین و تعصب کے ساتھ بڑی آسانی سے اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے کہ ان کے افکار، ان کی رفتار کی ترجمانی نہیں کرتے۔

میرا خود کئی بار (ایک دفعہ ایک بک اسٹال پر اور دو دفعہ ٹیکسی میں) ایسے مذہبی دیندار اور عبادت گزار افراد سے سامنا ہوا ہے کہ جن کے مذکورہ صفات کے بارے میں مجھے کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان تہمتوں کے اثبات کے لئے جن کے وہ دعویدار تھے کسی واسطے کے بغیر خود کو حاضر و ناظر پیش کیا اور کہا یہ

باتیں میری سنی سنائی نہیں ہیں، میرے اپنے مشاہدات ہیں اور یہ کہ وہ اسے (یعنی خود ڈاکٹر علی شریعتی کو) بہت قریب سے اور بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ ان کا ان کے گھر برسوں آنا جانا رہا ہے، ان کے والد سے آج بھی ان کا یارانہ ہے وغیرہ۔ ان میں سے ایک نے میرے بڑے بھائی کی بیوی سے رشتہ داری نکالی اور کہا میں ڈاکٹر کو اسی طرح جانتا ہوں جس طرح اپنے آپ کو جانتا ہوں!

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور سے کہا: ''ارشاد''۔ پہلے سے ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ایک مومن نے جو مخالفین میں سے تھا میری ہدایت کے لئے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور جب اس نے مجھے ہمہ تن گوش پایا تو بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: آپ کو پتہ نہیں جناب، معدوم شاہ کے زمانے سے یہ شخص مخالفانہ گفتگو کرتا ہے۔ میرے باپ کی اس سے پکی دوستی تھی، لیکن وہ کہتے تھے کہ یہ اندر سے خالی ہے اس کے پاس کوئی علم ولم نہیں ہے۔ بچپن میں وہ دونوں ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ جب میرے دادا کا انتقال ہوا تو روزانہ راتوں کو قرآن کی تلاوت اور مجالس کے اختتام کے بعد دونوں بیٹھ کر تاش کھیلتے تھے۔ یہی ''حسینیہ ارشاد'' بیس تیس سال پہلے جب بن رہی تھی تو میرے والد نے اس کی معاونت کی، بعد میں جب دیکھا کہ بہائیوں نے اس کے لئے امریکہ سے پیسے بھیجے ہیں تو انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی اور ایک طرف ہوگئے۔ آقا جان، آپ جوان ہیں، سیدھے سادھے ہیں۔ پہلے جا کر اپنے بڑوں سے پوچھیں، دین کے بزرگوں سے سوال کریں، تحقیق کریں۔ اشخاص کی شخصیت کا، ان کے عقائد کا، ان کی زندگی کا، اور ان کے ماضی اور حال کا اچھی طرح مطالعہ کریں، انہیں اچھی طرح پہچانیں اور پھر جا کر ان کی باتیں سنیں۔ دو تین کتابوں،

تین چار تقریروں اور چند ایک ملاقاتوں سے کسی کے بارے میں فیصلہ نہ کریں۔
میرے مرحوم والد پچاس سال سے زیادہ عرصے تک اسی شیخ علی شریعتی کی رفاقت میں رہے۔ میں بھی اس وقت سے جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے اس کے بیٹے کا محلہ دار اور ہم جماعت رہا ہوں، وہ جا کر متعلم بنا اور پھر معقول و منقول میں ڈاکٹریٹ کیا اور میں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور پڑھائی وڑھائی چھوڑ دی اور ڈاکٹر واکٹر نہیں ہوا۔ لیکن خدا نے میری ہدایت کی، میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کیا، اور اس نے مجھے اور اپنے چند ایک خاص لوگوں کو ایک ناقابل بیان عالم میں راہ دی اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گیا۔ جہاں جبرئیل کے پر جل جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے اس نے ہمیں دنیا بھی دی اور آخرت بھی۔ البتہ یہ سب اس کے وجود کی برکت سے ہوا ورنہ ہم تو اس قابل نہ تھے۔ ہمارے ذریعے سے اس نے مزید دو سو تین سو آدمیوں کی روزی کا بندوبست کیا۔ صرف یہاں میں نے ان سے پوچھا، حضور کا مشغلہ کیا ہے؟ اس نے ایک ایسے ادارے کا نام لیا جس سے سب واقف ہیں۔ میں نے کہا: وہی کہ جس کے لئے ٹی وی میں خانم مہناز پروگرام پیش کرتی ہیں؟ ہاں، مگر نہیں! اس طرح کے پروگرام نہ میرے کہنے سے پیش ہوتے ہیں اور نہ میں انہیں دیکھتا ہوں بلکہ میں ایسا کام کرتا ہی نہیں جو نظروں میں آجاؤ۔ اور آپ تو جانتے ہیں آج کل معیشت ...... دیکھیے ہر کام کی کچھ مصلحتیں اور کچھ علل و اسباب ہوتے ہیں۔ البتہ میں شرعاً مسئول نہیں ہوں، اس لئے کہ ایسا کام تعلقات عامہ کا شعبہ کرتا ہے۔ شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اشتہار بڑا شرمناک ہے؟ جب میں نے اس کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی جانتا ہوں کہ اس میں کیا ہے تو جواب طلب بھی نہیں ہوں۔ جی ہاں، تم جیسے نوجوان

بجائے اس کے کہ دوسروں کے لئے تکلیف شرعی عائد کریں اور دوسروں کی اصلاح کرنے بیٹھیں...... معاف کیجئے گا۔۔۔ بیجا مداخلت میں یہ بات آتی ہے، اپنے آپ کو سنبھالیں تاکہ علی شریعتی جیسے لوگ تمہارے دین وایمان سے اس طرح نہ کھیلیں۔
میں سمجھ گیا اس سوال سے آپ کیا کہنا چاہتے تھے، جونہی آپ نے اپنی زبان کھولی میں سمجھ گیا کہ علی شریعتی بول رہا ہے۔ میں اسے آپ سے، کہ جس نے اس کی چار کتابیں پڑھی اور چھ تقریریں سنی ہیں بہتر جانتا ہوں۔ میں نے برسوں سے اسے نہیں دیکھا تھا یہاں تک کہ کچھ ہفتے پہلے چند ایک سرمایہ دار حمایتیوں کے ساتھ اپنی انگریز بیوی کے لئے جو فرانسیسی ہے ایک باغ کا سودا کرنے میرے پاس آیا تھا۔ یہ باغ میرے رشتہ دار کا تھا، میں نے ۹۵۰ ہزار تومان میں یہ معاملہ طے کر دیا۔ برسوں بعد ایک رات کے لئے ہم پھر گپ شپ کے لئے مل بیٹھے، تمہیں پتہ ہے اس کی عمر کیا ہے؟ لیکن یہ بات میرے پلے پڑ گئی کہ وہ پہلے سے یعنی معدوم شاہ کے زمانے سے بھی زیادہ بدتر ہو گیا ہے، سچ کہتے ہیں اس کی سوچ بہائی رجحانات کی حامل ہو گئی ہے۔ ان ہی دنوں جب وہ اسی امام بارگاہ کو جسے آج ''ارشاد'' کا نام دیا گیا ہے بنا رہا تھا تو میرے والد نے کہا تھا کہ اس کام کے لئے اسے امریکہ سے مدد ملی ہے۔
تم چاہو تو ایک رات میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں؟ تاکہ تم قریب سے اسے پہچانو؟
میں کہ جو اس کے مقدس تابانہ چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور تعجب سے دیکھ رہا تھا کہ وہ داڑھی، خط، تسبیح، گلے کے بٹن بندھے ہوئے چوغے اور ثواب دار سمبولک انگوٹھیوں کے اس ڈھیر سارے علائم سائن بورڈ، پتے اور نشان کے ساتھ جو

اس بات کو بتارہے تھے کہ: ''میں ایک مومن طاق ہوں'' اتنی ڈھٹائی اور اتنی خاطر جمعی سے جھوٹ بول رہا تھا اور تہمت لگا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے علی شریعتی کو مرحوم شریعت سنگلجی کی جگہ لیا ہے اور وہ اس مرحوم کو بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح مجھے، اور اپنی غلیظ مادی زندگی میں، بے سروپا بکھرے ہوئے افواہوں کو خلط ملط سنا ہے اور مجھ پر وہابی ہونے کی تہمت کو بھی بہائیت سے بدلا ہے، اس لئے کہ وہ وہابی کے لفظ سے ناواقف ہے؟ (چونکہ یہ لفظ ایران میں ان ہی عوامل کی مدد سے آیا ہے) اور اسی ناواقفیت کی بنیاد پر اس نے ''چنڈو خانے'' کی داستانیں بنائی ہیں۔ بہرحال ثابت تھا کہ وہ نماز پڑھنے والا اور دین سے عقیدت رکھنے والا بھی ہے۔ اسی لئے میں نے اس کی دعوت قبول کی، اس شرط پر کہ پہلے وہ میری دعوت کو قبول کرے اور ابھی میرے ساتھ اتر کر علی شریعتی کے درس اسلام شناسی میں شرکت کرے۔ اس نے میری بات مان لی اور ہم دونوں ٹیکسی سے اتر گئے......!

......لہٰذا اس خیال سے کہ لوگ اس ''حزب'' کو جس کا ترجمہ ہم نے لوگوں کی آسانی کے لئے ''گروہ'' کیا ہے دوسرے ''احزاب'' (گروہوں) سے نہ ملائیں، ہم نے قرآن کی آیت کو بھی اس کے ساتھ رکھا ہے!

ب۔ لفظ ''حزب'' (گروہ) اس تصور کے برخلاف جو بعض مسلمان اور بعض شیعہ اس کی نسبت رکھتے ہیں اور اس کو ایک اہانت آمیز لفظ سمجھتے ہیں، وہ قرآنی لفظ ہے جس پر خدا نے بار بار تکیہ کیا ہے۔ وہاں آیت میں اس نے ''اسلام'' اور ''ملت ابراہیم'' کو ایک ''حزب'' بتایا ہے اور اپنے اور شیطانوں کے پیروکاروں کے درمیان جنگ کو بھی ''حزب خدا'' اور ''حزب شیطان'' کا نام دیا ہے۔ حتیٰ خود قرآن کی ترتیب بھی

''حزب'' کی اساس پر ہے!

اس صورت حال کے ساتھ...... ''دوسروں'' نے ہمارے اس خالص قرآنی لفظ کو لیا ہے لیکن ہم اس لفظ سے بیگانہ تر ہو گئے۔ انہوں نے اس لفظ پر اپنی مہر ثبت کی اور ہم اس سے بیزار تر ہو گئے...... یہاں تک کہ آج یہ لفظ سن کر ہمیں وحشت ہوتی ہے! اس لئے کہ ہم اپنی شیعی اور اسلامی متن و معنویت سے بیگانہ ہو گئے ہیں!......

ایک صاحب کو اعتراض تھا کہ ''...... ''خلق'' کا لفظ میٹریالسٹ لوگ استعمال کرتے ہیں، تم کیوں مذہبی زبان میں استعمال کرتے ہو؟ میں نے کہا میٹریالسٹ حضرات پر اعتراض کرو کہ وہ کیوں اسے ''لوگوں'' کے بجائے استعمال کرتے ہیں، اور خدا پرستوں سے پوچھو کہ وہ کیوں اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے!

اس لئے کہ بنیادی طور پر خلق و خلقت و مخلوق کے مفاہیم، خصوصیت کے ساتھ مذہبی مفاہیم ہیں اور اس کا لازمہ ''خالق'' پر ایمان اور انسان کا مخلوق ہونا ہے! یہ وہ اصطلاح ہے جو میٹریالسٹ حضرات کی زبان میں بیگانہ اور اصالت جہاں بینی سے متناقض اور متضاد ہے اور اسی اندازہ سے خدائی جہاں بینی سے جو انسان اور عالم کو خلق خدا جانتی ہے، سازگار۔

جہالت کتنی بھونڈی ہے! مادی روشن خیال آدمی باوجود اس کے کہ خالق و عالم و آدم کا معتقد نہیں ہے ''ملت''، ''قوم'' اور ''نسل'' کے بجائے...... کہ جو ایک انسانی گروہ کو انسان کی کلیت سے جدا اور ممتاز کرتا ہے اور اس کو ایک خاک یا خون یا گزشتہ کے تاریخی اور خاندانی رشتہ یا کسی خاص زبان، خاص ثقافت، خاص سیاسی شکل، اور خاص معاشی نظام سے منسوب کرتا ہے، ''خلق'' کی اسلامی اصطلاح کو

فارسی زبان کے لئے عربی سے لیتا ہے تا کہ وہ اس معمول کی حد بندی کا کہ جو انسانوں کی درجہ بندی کرتا اور انہیں غیر انسانی معیاروں کے ساتھ پرکھتا ہے، اعتراف نہ کرے، اس لئے کہ وہ اس لفظ کو۔۔۔ باوجود اس کے کہ اپنے اعتقادی اصولوں کے ساتھ فلسفی اور جہاں بینی کے نقطہ نظر سے نہیں لیتا مگر۔۔۔ دیگر اصطلاحات کی نسبت ترقی پذیرتر اور انسانی تر پاتا ہے، اس لئے کہ اس میں توصیف وتسمیہ ہے کہ سارے گروہ، ساری قومیں اور سارے طبقات ...... اپنے اختلافات کی رعایت کے بغیر مساوی فہم کے حامل ہیں۔ اور مذہبی مسلمان! باوجود اس کے کہ جہاں بینی کے نقطہ نظر سے، اصل خلقت کا معتقد ہے اور لوگوں کو اللہ کی مخلوق جانتا ہے اور بشری نقطہ نظر سے بھی ساری نسلوں کی برابری اور سارے نسلی، خاکی، قومی، اور طبقاتی امتیازات کی نفی کا معتقد ہے، اپنے اعتقادی زبان کے لفظ کو پہچاننے سے عاجز ہے اور چونکہ اس کو دوسروں کی زبان سے سنتا ہے اس لئے اس سے ڈرتا ہے، حتیٰ اس کی مخالفت کرتا ہے، حتیٰ اس لفظ کو استعمال کرنے والے پر تہمت لگاتا ہے کہ وہ مادی روشن خیال لوگوں کی زبان میں بات کرتا ہے!! اور تلخ ہونے کے باوجود مزے کی بات یہ ہے کہ اس تنقید اور اس تہمت کو اس آدمی کی طرف سے سن رہے ہیں جو مثلاً آج کی شخصیت ہے اور سماجی اور ترقی پذیر ادبیات اور روشن خیال لوگوں کی زبان سے آشنا ہے جبھی تو اس نے اس اصطلاح کو ان کے متون میں دیکھا ہے، وگرنہ ہمارے مذہبی اور اسلامی علماء کا گروہ کہ جنہیں صرف ہماری دینی ثقافت سے سروکار ہے ایسی دریافت نہیں کرتے اس لئے کہ وہ خود عام صورت میں اور دینی تعبیر کے عنوان سے اسے کام میں لاتے ہیں: خلق خدا، خلائق!

ان سے زیادہ عجیب تر تمثیل کا مسئلہ ہے!

......آپ جانتے ہیں کہ قدیم ایام میں، یونان کے برخلاف، تمثیل اور تمثیلی کھیل کا وجود نہیں ہے۔ ایران میں پہلی بار شیعہ تحریک میں اس کا آغاز ہوا۔ بنیادی طور پر یہ شیعہ مبلغین ہیں کہ جنہوں نے اس تمثیل یا ''شبیہ'' یا ''تعزیہ'' کو رواج دیا، اور اس کے ذریعے وہ عقائد کی ترویج و تبلیغ کر رہے ہیں اور بالخصوص اہلبیت کی سرگزشت اور بالاخص کربلا کے المیہ کو شہری اور دیہاتی لوگوں کے فہم میں لا رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ نہیں پڑھ سکتے اور نہیں سمجھ سکتے کہ اسلام کیا ہے، تشیع کسے کہتے ہیں، امام کون ہے، علیؑ کون تھے، حسینؑ نے کیا کام کیا، ائمہ نے کیا کیا، کیا، یا یہ کہ بنی امیہ اور بنی عباس کس قسم کے لوگ تھے، انہوں نے کیا کچھ کیا؟ اس بنا پر صرف یہ تمثیل یا ''شبیہ سازی'' کہ جو اہل تشیع کے سماجی اعتقادات اور اس کی تاریخ کو عوام کی نظروں میں نمایاں کر سکتی تھی اور آج ہم بعینہ دیکھتے ہیں ہمارے آج کے عوام کا انبوہ کثیر، اہل تشیع کے تاریخی واقعات کو نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر جانتا ہے۔ ایران کے دیہی علاقوں میں شیعہ عقیدے کی تیزی سے پیشرفت اسی تعزیہ، شبیہ، پردہ داری، عزاداری، دستوں اور ان کے ساتھ تیغ زنی، قفل بندی، زنجیر زنی، حتیٰ کہ ان چلتے پھرتے درویشوں کے سبب ہے جو بستی بستی گھوم کر علیؑ کی مدحت کیا کرتے تھے...... بعد میں جب صفوی برسر اقتدار آئے اور مغربی مسیحیت (زیادہ تر مشرقی یورپ) کے ساتھ ان کا براہ راست رابطہ رہا تو انہوں نے وہاں کے مذہبی تماثیل کے تبلیغی کردار کو جو حتیٰ موسیقی سے توام ہے اور نیز فنی کیفیت اور گوناگوں اشکال کو کہ جو ''مصائب'' **Passion**، ''مقدس شہداء کی زندگی'' **Martyrs :**، ''معجزات کے نام سے خاص تھیٹرز''

Miracles، اور ''اسرار سبعہ'' **Seven Mysteries** کے عناوین سے قرون وسطیٰ میں رائج تھے اور جو مسیحی عقائد کے پھیلاؤ، دین کے شہداء اور مسیح کی یادوں کے تذکرے، مسیحی اولیاء کے مصائب اور رومی مظالم کے سب سے بڑے عامل تھے، ...... مذہب کی ترویج، عواطف کی تحریک، اہلبیت کی یاد کے احیاء، شہداء کے مصائب، امویوں اور عباسیوں کے مظالم اور زیادہ تر واقعہ کربلا اور مصائب امام حسینؑ کے لئے بروئے کار لائے۔ لیکن چونکہ ایران اور اسلام میں اس کا رواج ماضی میں نہیں تھا بلکہ اس کے بہت سے عناصر استادی مہارت اور تجزیہ سے عاری تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمارے مذہبی افکار اور اسلامی روح کے مطابق اس میں تبدیلی پیدا کی جاتی مگر ہمارے مستقل اسلامی علماء اور اساساً علمی حوزوں اور شیعی روشن خیال لوگوں نے اسے اپنے سنجیدہ تبلیغی کام کے متن میں شامل نہیں کیا اور اس کے نتیجے میں سطح کے اعتبار سے اس کا رواج روز افزوں ہوا لیکن عمق اور گہرائی کے اعتبار سے، اسی طرح خام، عامیانہ اور زوال یافتہ رہا، اس طرح کہ حتیٰ آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علماء، حکماء، طلباء، اور وہ افراد جو مذہبی نقطہ نظر سے فعال اور بالائی ثقافت کے حامل ہیں اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھتے اور اپنے سے مربوط نہیں جانتے ہیں، مگر اس کے مقابل کھڑے بھی نہیں ہوتے ہیں اور بڑے محتاط انداز میں اسے مانے ہوئے ہیں بلکہ بعض افراد ظاہراً اس طرح سے اس کی تائید بھی کرتے ہیں اور مذہبی عوام خاص طور پر دیہاتوں میں اب بھی اس سے شدید دلچسپی رکھتے ہیں اور آج چونکہ اس نے ایک دیرینہ رواج کی صورت اختیار کی ہے اور پہلے سے چلی آرہی ہے ہر چند کہ پسماندہ بلکہ بعض موارد میں شرمناک ہے اور اس کے بعض عناصر موجودہ عقائد کے برخلاف

ہیں (جیسے ہر دستہ کے آگے صلیب، منظر عام میں مردوں کی برہنگی، رسول خدا، ائمہ اطہار اور اہلبیت کے حرم ۔۔۔ جناب زہرا، زینبؑ، رقیہؑ، حتیٰ کہ جبرئیل!...... جیسی بلند قامت شخصیتوں کے تماثیل، یا امام حسینؑ کی تین سالہ بیٹی جناب سکینہ کے کردار میں ایک من داڑھی اور ایک گز مونچھ والے فلاں کلب رجب کا انتخاب اور پھر جھانج، طبل، نفیری، بگل، اور پورے آرکسٹرا کے ساتھ ڈرامہ کا اعلان......) اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی اس پر کسی نے تنقید کی ہے!

لیکن......! بعدازیں جب ہم اس موثر تبلیغی روش کو اپناتے ہیں اور اس کا نام مثلاً "شبیہ سازی"، "تعزیہ گردانی" اور "نعش کشی" سے ہٹا کر "تمثیل" رکھتے ہیں اور ان اہانت آمیز کرداروں، نوحوں اور شعروں کے بجائے سنجیدہ ترین، اعلیٰ ترین، اصیل ترین اسلامی متون، شیعی تاریخ، جدید فنی وسائل، مذہبی اور انسانی اعلیٰ عواطف اور تجسم افکار کے ترقی یافتہ ہنر کو حرکت ونور کے ذریعے اصلی مناظر کی صورت دیتے ہیں اور وہ بھی ائمہ اہلبیت کے ذوات مقدسہ کے سراپا سے اجتناب کرتے ہوئے تاہم ابوذر، توابین، دار پر چڑھنے والوں، دلاوروں، سورماؤں، شہیدوں یا پھر شیعی تحریکوں اور نیز ان اعلیٰ ترین فنی وسائل اور ہنری پیشرفتوں کو جو کفر وفساد کے پاس ہے اور ان سے مذہب دشمن افکار کو مدد مل رہی ہے مذہب کے روبرو لاتے ہیں اور مذہب سے فرار اختیار کرنے والے روشن خیال افراد کے قوی ترین افکار واحساسات کی دعوت اور ہلا دینے والے عمیق ترین اثر اور ان کے مذہبی جاذبہ کو صورت دیتے ہیں تو بعض تعصبات اس طرح ابھرتے ہیں کہ پھر وہ تہمت، دشنام، جھوٹ، اور ہر طرح کے بہتان پر اکتفا نہیں کرتے اور نہی عن المنکر کی انجام دہی کی راہ اور دین کی

خدمت کے عقدہ کو خالی کرنے اور اس احساس مسئولیت کو جو اس سلسلہ میں اچانک ان پر آئی ہے، اس بات میں دیکھتے ہیں کہ عثمان کے ہاتھوں لق و دق صحرا میں دیس نکالے گئے ابوذر کی موت کے منظر کو نذر آتش کریں یا ڈائس کے نیچے ٹائم بم رکھیں یا میری تقریر کے دوران جس میں میں، ابوذر کی سرنوشت اور حضرت عثمان کے جرائم پر گفتگو کر رہا ہوں، امر بالمعروف اور ولایت کی دفاع کے نام پر دستی بم پھینکیں، اس لئے کہ یہاں خطرہ یا ضرر کا احتمال نہیں اور اس کا اثر اور اس کا نتیجہ بھی مسلم ہے لہٰذا ذمہ داری یا مسئولیت ساقط نہیں۔ اس لئے کہ مشہد آنے والے اس واعظ کے نظریہ کے مطابق مقابل پر وہ **متعلم** آرٹسٹ ہے جو ابوذر کا کردار ادا کر رہا ہے! وہ نشہ میں چور چاقو لہرانے والا شرابی نہیں کہ جس کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل اور دوسرے میں چاقو ہے اور اس پر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنی چاہئے اس لئے کہ حکم ساقط ہے اور اس ''نوساختہ مخصوص فرقے'' میں **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر** کا شیوہ، شرعاً علمی استدلال کے نقطہ نظر سے، ماں بہن کی گالی، ناموسی تہمت اور جعل و جھوٹ و تہمت اور عمدی بہتان ہے۔۔۔ جی ہاں، حکم ہے!۔۔۔ اور علمی نقطہ نظر سے بھی، اس شخص کی میز کے نیچے ٹائم بم رکھنا جسے امر بالمعروف کرنا ہو، اور زیادہ ملائم اور زیادہ مؤدبانہ انداز میں اس کی نسبت چاقو بکف ہونا روا ہے!

مگر کیوں ہر وہ چیز جو بری گھٹیا مگر عوام پسند ہو، ''اس میں شرعاً کوئی اشکال نہیں'' اور اگر یہی چیز اسی ہدف کی راہ میں، کمال یافتہ، خوبصورت اور اثر انگیز ہو اور خاص طور پر ترقی پذیر اور تعلیم یافتہ نوجوان نسل اور روشن خیال لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف جذب کرتی ہو تو واویلا ہے، المیہ ہے، اور ضروری ہے کہ وقت گزرنے سے پہلے فوری طور پر

جس طرح بھی ہو اسے تباہ و برباد کیا جائے؟؟

میں پوچھتا ہوں آخر کیوں جب ہماری کوئی دینی تبلیغی روایت زور پکڑتی ہے تو ہم اس سے بیگانہ تر ہو جاتے ہیں؟ آخر کیوں جب ہمارے دشمن، ہمارے اخلاق و ایمان و عقیدے کو کچلنے کے لئے ہر ممکن ذرائع سے لیٹسٹ تکنیک کے ساتھ استفادہ کرتے ہیں تو کوئی اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں، لیکن جب ہم ان ہی قدروں کے احیاء اور اسی عقیدہ و ایمان کی حفاظت و تبلیغ و توضیح کے لئے اس تبلیغی آلہ کو جس پر دشمن کی اجارہ داری ہے اس کے ہاتھ سے لے لیتے ہیں اور اسے اسلام کے دفاع اور اسلام دشمن فکری اور ثقافتی یلغار سے مقابلہ کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے معجزنما اثرات سامنے آتے ہیں تو ہر طرف ہائے اسلام وائے اسلام کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور وہ لوگ تک کہ جو بنیادی طور پر "عجز بخن" رکھتے ہیں اور دنیا ڈوب جائے تو سوتے رہتے ہیں، اچانک چونک پڑتے ہیں اور سب مل کر نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے ہیں، اور وہ بھی اتنی بے رحمی اور اتنی نامردی کے ساتھ؟

واللہ اعلم بحقائق الامور و بمافی الصدور و بمافی القبور...... نہیں (معاف کیجئے گا) بمافی الصدور مذہبی قضاوت میں عام آدمی کا معیار، حق و باطل یا کسی امر کے اچھے اور برے ہونے کے نتیجے سے نہیں ہے، جو بھی پہلے سے چلی آرہی ہو مذہبی ہے خواہ وہ پچاس یا سو سال پہلے کی ہو اور خواہ وہ کفر سے اسلام میں داخل ہوئی ہو! اور جو کچھ بھی نئی ہو وہ مغلوب، کفر آمیز اور نحس ہے! خواہ وہ مفید کیوں نہ ہو، اور خواہ اس کا تعلق اسلام ہی سے کیوں نہ وہ مگر بھلا دی گئی ہو اور دوبارہ پیش کی گئی ہو! متجددین کے برخلاف کہ جو کچھ قدیم ایام سے پہنچا ہے اور اس کی نسبت ہم سے اور اسلام سے ہے وہ ناقابل

قبول ہے اور جو چیز نئی ہے، غیروں سے آئی ہے اور فرنگیوں سے اس کی نسبت ہے وہ تمدن، ترقی اور برتری کی علامت ہے!

اور اس کی مثال یہی اساتذہ کی علامت ہے!

اور اس کی مثال یہی اساتذہ کا روایتی لباس ہے!

قرون وسطیٰ میں، سوربن، کیمرج یا اٹلی اور اسپین کے دانش گاہوں سے تعلق رکھنے والے طب اور فلسفے کے اساتذہ کے لئے باعث افتخار تھا کہ وہ ''شفا'' اور ''قانون'' کی کتابوں یا اسلامی علماء کے دیگر متون کی تدریس کے موقع پر اسلامی علماء اور فلاسفرز کا لباس زیب تن کریں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فرنگی مدرسین، ہمارے علماء کے ''لبادے'' پہنتے تھے تا کہ اس ''استادی'' کا مظاہرہ کریں کہ مثلاً وہ اسلامی دروس کے اساتذہ ہیں۔ لیکن جب سے اس میں ادھر ادھر کچھ لٹکا کر ایک اور صورت پیدا کی گئی ہے اس وقت سے مغربی اساتذہ کا سرکاری لباس، ہمارے ان متجدد اساتید کا لباس ہوگیا ہے جو ہمارے علماء کے لباس کو دقیانوسی لباس سمجھتے ہیں اور اس میں ہزار طرح کے کیڑے نکالتے ہیں اور مغربی طرز کے لباس کو جوان کے سابقہ لباس سے تین گنا ڈھیلہ ڈھالا اور ڈیزائن وہی ہمارا ڈیزائن ہے، پہن کر گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، اور تفاخر و تظاہر کے عالم میں مٹکتے پھرتے اور علمی محفل میں پوز مارتے اور اس طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح کوئی بچہ ابھی ابھی ''ختنہ کے بستر'' سے کامیابی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور نیا لباس زیب تن کیا ہے۔ حتیٰ ایک فارغ التحصیلی جشن میں جس میں کہ میں نے عمر میں پہلی دفعہ (طلبہ کے اصرار پر) شرکت کی تھی، چونکہ یہی کذائی لبادہ میرے تن پر نہیں تھا عجیب فنی مشکلات سامنے آئیں کہ جو سننے سے تعلق

رکھتی ہیں، بالآخر بعض بزرگواروں کے اظہار لطف اور استثناء، جانبداری، اور پارٹی بازی سے بات پٹ گئی اور تحمل کا مظاہرہ ہوا، لیکن اس واقعے کے بعد سے اعلیٰ تعلیم اور عام تعلیمی امور کے مسئولین نے توبہ کر لی کہ اب آئندہ ایسی رسوائی کا سامان نہیں کریں گے اور اس طرح کے درویش صفت، اور ملائی ذہن کے حامل افراد کی لاپروائی سے کہ جن کو "یونیورسٹی کے پرنسپلز" کی سمجھ نہیں ہے اور انہوں نے ابھی تک آویزہ دار درویشی اور علمائی لباس اپنے لئے آمادہ نہیں کیا ہے اس طرح یونیورسٹی کی آبرو اور خاص طور پر استادی کا مقام مجروح اور ہم سب کی ہتک نہ ہو!

(۳)۔ ص ۱۲۷ س ۱۳

ممکن ہے "شیعہ" اور "اسلام" کا میری زبان میں طرز تخاطب، کوئی ابہام پیدا کرے، اس لئے کہ ہمارے معمول کے مذہبی زبان کے ساتھ اس کا اختلاف ہے اور اس سوال کا باعث بنتا ہے کہ: ان میں سے بیشتر مسائل کا تعلق شیعہ مذہب سے نہیں بلکہ شیعہ اور سنی، دونوں کا ان پر اتفاق ہے اور کہنا پڑے گا کہ ان کا تعلق بنیادی طور پر اسلام سے ہے، تو پھر تم اسلام کے بارے میں گفتگو کر رہے ہو یا شیعہ کے بارے میں؟ شیعہ، ...... حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اور دیگر مذاہب اور فرقوں کے مقابل ایک فرقہ، اور ایک خاص مذہب ہے۔

زیادہ تر شیعوں کو، دیگر فقہی مکاتیب کے مقابل ایک الگ فقہی مکتب کے عنوان سے لیا جاتا ہے۔۔۔ کہ یہ میری گفتگو کا موضوع نہیں ہے۔۔۔ کچھ لوگ اعتقادی نقطہ

نظرے شیعہ کو ''وصایت و ولایت'' کے بعد سے مفہوم دیتے ہیں، اور یہ بھی پھر وہی اسلام میں دیگر اعتقادی مکاتب کے برابر ایک اور اعتقادی مکتب کی صورت ہے۔ لیکن میری زبان میں شیعہ، اسلام کے ساتھ متحد المعانی ہے اور اس کا سلسلہ توحید سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ آدم سے شروع ہوتی ہے، اور اس کی مسئولیت ابراہیم سے حسینؑ اور حسینؑ سے آخر الزماں تک جاتی ہے۔ ایک جملہ میں عرض کروں کہ شیعہ، میرے نقطہ نظر سے ''اسلام کو ایک نوعیت سے سمجھتا ہے، اور بس! اسلام کے اصول دین تین اور شیعہ مذہب کے دو ہیں اور دونوں کو ملا کر ان کی تعداد پانچ ہوتی ہے، یہ شیعہ مخالف، اسلام مخالف اور علیؑ مخالف ترین گفتگو ہے! میں نے بار بار کہا ہے اور بار بار کہونگا کہ: علیؑ کی سی سوچ رکھنے والوں کے فہم میں، خاندان پیغمبرؐ کے مکتب اسلام شناسی میں، ائمہ کی تعلیم میں، یعنی شیعی اسلام کے مفہوم میں، ...... دین اسلام ان پانچ اصولوں کا حامل ہے ''توحید، نبوت، معاد، امامت اور عدل''!

یہ وہ اولین مسائل ہیں جنہیں میں نے برسوں پہلے پیش کیا ہے اور اس پر ابھی تک سختی سے برقرار ہوں۔ اور اسی لئے اضلالیوں (گمراہ لوگوں) نے، ارشادیوں (حسینیہ ارشاد والوں) کے خلاف بہانہ ڈھونڈا کہ: ''پھر تم لوگوں کا امامت پر عقیدہ نہیں ہے'' (اللہ اکبر! جہل اور غرض جب مل جاتے ہیں تو کی بھاری صنعتیں نکالتے ہیں)!

میرے اس نظریہ پر منطقی ترین جو تنقید ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ، شیعہ کی ایسی تعریف سے تم غیر شیعی افراد کو مسلمان نہیں سمجھتے، اس لئے کہ تم شیعہ کو اسلام کے مترادف لیتے ہو۔

اس قابل جواب تنقید پر ضروری ہے کہ میں اس کا جواب دوں اس لئے کہ یہ نقاد صاف ظاہر ہے کہ نہ جاہل ہے اور نہ جاہل فریب، اور نہ ہی خواب ہے اور نہ ہی اس سے بدتر اس نے خواب کی صورت اختیار کی ہے، اضلالیوں (گمراہ لوگوں) کے برخلاف کہ جن کے لئے اوائل اسلام شناسی سے ایک پیرے کی توضیح اور اسی کتاب کے آخر میں ان کی تنقید کا جواب اور اس کے بعد امامت کے بارے میں دسیوں تقریریں، کتاب، کتابچے، دسیوں گھنٹے اور کئی کیلو میٹر ٹیپس اور ہزاروں لکھے گئے صفحے کافی نہیں تھے اور ابھی تک وہ دوسروں کے کہنے پر ناچ رہے ہیں اور مسلسل ان کی بیٹری اور ''گرامی شخصیتیں'' چارج ہو رہی ہیں، جن لوگوں نے یہ تنقید کی ہے اس کی توضیح میں ہمیں زیادہ طول و تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، بس ایک جملہ ان کے لئے کافی ہے کہ: ''میں شیعہ، اور بے غرض اور آزاد غیر شیعہ دانشور، اسلام میں سب مسلمان بھائی ہیں۔ ہم سب اسلام کی اصالت کے معتقد ہیں، تاہم فہم اسلام میں ہمارا ایک دوسرے سے اختلاف نظر ہے، میں شیعہ، اسلام کو اس طرح سمجھتا ہوں اور تم غیر شیعی دوسری طرح، ہم میں علمی اختلاف ہے، بالکل اسی طرح جس طرح دو شیعہ عالم فلاں فقہی یا اعتقادی مسئلہ کو دو مختلف انداز میں بالکل متضاد صورت میں سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کی تکفیر، عوام کے بیچ چیخنے چلانے، ملاؤں کو اکٹھے کرنے اور تعصبات کو بھڑکانے کے بجائے ضروری ہے کہ ہم اسلامی اور علمی ادب کا شیوہ اختیار کرتے ہوئے، تحقیق کے میدان میں علمی مبارزہ اور منطقی جدال سے کام لیں۔ میں ان کے علمی استنباط کو غلط جانوں اور ان کو بھی حق ہے کہ وہ میرے علمی استنباط کو غلط جانیں اور ہم میں سے کوئی بھی اپنے علمی عقیدے

سے پیچھے نہ ہٹے اور ہم ایک دوسرے کو وہ ایسے مسلمان سمجھیں کہ جو ایمان میں ایک اور دین میں دو نظریوں کے حامل ہیں اور اپنے نظریات پر ایک دوسرے کے ساتھ فکری اختلاف اور علمی کشمکش کو باقی رکھیں اور اسلام دشمنوں کے مقابل ہمارے درمیان وحدت صف اور وحدت عمل کا مظاہرہ ہو۔

عجیب بات ہے کہ آج ایک روحانی زادہ، مسلمانوں کے ایک گروہ پر گلا پھاڑ رہا ہے ہم نے کیوں علی شریعتی کی ''شہادت'' نامی کتاب پڑھی اور کیوں اس کی بات کرتے ہو، پوچھنے والوں نے پوچھا، اس کتاب کو پڑھنے میں نقصان کیا ہے؟ توضیح مرحمت فرمائی کہ، ''شہادت'' کی کتاب میں علی شریعتی نے اپنی ساری کتابوں سے زیادہ خطا کی ہے۔ اس نے امام حسینؑ کی اہانت اور ولایت امام کا انکار کیا ہے......، اس لئے کہ یہ ساری کتاب کربلا کے مسئلہ اور یزید کے مقابل امام حسینؑ کے قیام پر منحصر ہے...... پوچھنے والوں نے تعجب سے پوچھا، اس میں حرج کیا ہے؟ شیعہ کی نسبت پوچھنے والوں کی اس قدر بیگانگی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا: ''نہیں جناب، اصل بات یہ ہے کہ امام حسینؑ نے مدینہ میں اس وقت قیام کیا تھا جب ان کا سن چھ برس کا تھا! اور علی شریعتی نے شہادت میں امام کے اس پہلے شاندار قیام کی طرف اشارہ نہیں کیا''!

اس ''علمی تنقید'' کے مقابل فطری ترین ردعمل یہ ہے کہ آپ کے سر سے پھوٹ کر دو سینگ نکل پڑیں اور آج ان صاحب کے تن پر تشیع کا منصبی لباس ہے (بیچارے لوگ اور بیچارہ......!) اسی علمی اختلاف نظر کے لئے! کہ میں نے چھ برس کے سن میں امام کے قیام کی طرف اشارہ نہیں کیا، وہ ان لوگوں کی کھال کھینچنا چاہتا ہے

جو مجھ سے ملنے آئے ہیں! اور تہمت بھی یہ نہیں کہ میں نے چھ سال کے سن کا قیام تحریر نہیں کیا بلکہ یہ ایں دلیل کہ میں امام حسینؑ کا دشمن اور امامت کا دشمن ہوں!

اور ادھر سید رضی شیعہ تاریخ کا وہ درخشاں چہرہ ہے جس نے ایک مشہور غیر مسلم دانشور ''اسحٰق صابی'' کی موت پر ایسا مرثیہ لکھا اور ایسی تعریف و تجلیل کی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے!

اور پھر آپ مجھ سے توقع کرتے ہیں کہ میں یہ کہوں کہ یہ دونوں تشیع ایک ہیں؟ کیا یہ اہلبیت، امام صادقؑ کے علمی مکتب اور تشیع کے ان والا تبار علماء اور انسانی اصالت کی نسبت خیانت نہیں ہے جو افتخار علم و ادب و فکر بشری ہیں؟

(۴)۔ ص ۱۳۰ ن۔ ۷

یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ یورپ یا امریکہ کی کسی نئی دریافت یا نئی ایجاد کو بنا قرار دیکر کسی آیت یا کسی حدیث کو اس پر چسپاں کریں تو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑی تابناک خدمت انجام دی ہے؟ اور وہ مذہب سے دوری اختیار کرنے والے روشن خیال لوگوں کو مذہبی ایمان کی طرف لوٹا لائیں ہیں۔ اس رو سے بعض دینی کتابیں، اپنی کتابوں سے زیادہ ''علم الاشیاء'' کی کتابیں ہوگئی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آج کی تعلیم یافتہ نسل، اسلامی گروہ کے اسلامی طرز فکر اور انداز نظر کا استقبال کرتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ماڈرن تعلیم یافتہ ہیں یا ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس کی دم میں ''لوجی'' یا ''ازم'' یا ''اسٹ'' کی **Suffix**

ہو، یا ڈاکٹر، انجینئر، یا پروفیسر جیسے القابات ہماری اپنی دم میں! اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جدید علوم کے الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال، زیادہ تر درسی کتابوں یا رسالوں یا پھر ٹوٹے پھوٹے غلط سلط انداز میں بعض منبروں سے ہوتا ہے۔ حتیٰ ہمارے شہر..... مشہد..... کے ایک ماڈرنائز واعظ کہ جنہیں آج فرہنگ امام صادق کا مقرر ہونا چاہئے، اپنی کتاب ''افسانہ کتاب'' (مطبوعہ مشہد، بقلم شیخ عطائی خراسانی) میں کہ جو معمول کے مطابق، میرے، میرے استادوں کے اور میرے گزرے ہوئے لوگوں کی رد میں ہے صرف ایک لفظ کی رد میں جسے میں نے ''اسلام شناسی'' میں استعمال کیا ہے کہ ''اسلام میں تکامل (تدریجی ارتقاء) کی گفتگو ہے'' لکھا ہے، اور لفظ تکامل پر صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں اور اس تکامل کو ڈارون کے تکامل کی تھیوری سمجھا ہے اور اپنا سارا مواد محمود بہزاد اور دوسرے لوگوں کی کتابوں سے لیا ہے اور پھر حیف جانا کہ اس مقالہ سے صرف نظر کرے جسے اس نے ''فروید'' کے بارے میں پڑھا ہے اور یہ بہانہ بنایا کہ یہاں نامناسب نہیں اگر ہم فروید کے افکار کو بھی رد کریں جو ڈارون کے افکار سے ملتے ہیں اور اس کے بعد ''فروید'' کی پوری شرح حال اور وہی افواہی باتوں کی تکرار! اور بعد ازاں ''اپولو کے فوائد'' کے بارے میں دس پندرہ صفحے تحریر کئے اور اس مقالہ کی کاپی کو جو ''کیہان'' اور ''اطلاعات'' کے اخباروں میں چھپ چکے ہیں اور جو دنیا کے لوگوں کے مقابل امریکی حکومت کا جواب تھا جس میں اعتراض تھا کہ آخر کیوں ایسی حالت میں جبکہ زمین پر ہر تین آدمیوں میں سے دو آدمی بھوکا ہے تم اربوں ڈالر فضا میں ماوراء خلا جھونک رہے ہو؟ اور اس میں ان لوگوں نے اپنی صفائی میں اپولو سازی کے تکنیکی فوائد میں لائن سے پندرہ سولہ فائدے درج کئے تھے کہ مثلاً اپولو کے

لئے ہم نے جو خوبصورت سی ہتھوڑی بنائی ہے وہ الیکٹرانیکی صنعتوں میں بہت مفید و معاون ہے جو سسٹم ہم نے کروں کے درمیان مواصلات کا بنایا ہے وہ بین الاقوامی مواصلات کے لئے بڑی کارآمد ہے، ٹیلیویژن سے متعلق مدار...... اشعۂ ماورای بنفش (الٹروائلٹ ریز) سے فوٹوگرافی ...... اور سولر سیلز وغیرہ وغیرہ ...... (مگر سید الشہدا کے ذاکر، تمھیں اس سے کیا! تم علی بن موسی الرضا کے آستانہ میں، اس مقدس مذہبی شہر میں، تیسری دنیا کے اس گوشہ میں اور اس سلامی ملک میں، ...... مکتب علی کے مدافعین سے ہو یا امریکی ادارے کے مدافع کہ جو زمین پر انسانوں کی جیب سے اربوں روپے اچکتے ہیں اور اسے اپنی سیاسی خودنمائیوں، مغربی امپریالزم کی سپر پاوری کے استحکام، اور لا یتناہی فضاؤں میں فوجی اہداف کے لئے ضائع کرتے ہی؟) اسلام شناسی کی رو میں لکھتے ہوئے اپولو کی حمایت میں امریکی تبلیغاتی مقالہ کی گفتگو کے بعد!! خود اس کی سمجھ میں آئی کہ: "ہمیں اس سے کیا"؟! اپالو کے بارے میں اپنی تحقیقات اور فضائی ٹیکنالوجی کے پیچیدہ اصطلاحات کے استعمال کے بعد اپنے قبیح عمل کی توجیہ کے لئے فرماتے ہیں: "یہ باتیں میں نے یہاں اس لئے کہی ہیں تاکہ کل کوئی ہمیں رجعت پسند نہ کہے"!!

(۵)۔ ص ۱۳۱...... س ۱۹

خاص طور پر اس وقت جب سننے والے یا پڑھنے والے حضرات ۔۔۔ جوان سے بیشتر اور بہتر ان مسائل سے واقف ہیں ۔۔۔ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ حتی رائجہ

اصطلاحات اور ناموں کے تلفظ کو غلط اور الٹا سیدھا بولتے ہیں تو انہیں اور برا لگتا ہے، اس لئے کہ وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اس نے ابھی کل رات کسی رسالہ یا اپنے بیٹے کے کسی درسی کتاب میں مغربی علماء کے جدید نظریہ پر نظر ڈالی ہے کہ مثلاً: ''دوحال میں دریافت ہوا ہے کہ زمین گول ہے'' یا ریڈیو کے اس واعظ کے بقول ''یہ فضا میں پھیلے ہوئے الکٹریکی جراثیم، میرے بھیجے میں بھی ہے اور تمہارے بھیجے میں بھی......'' ؟ یا ایٹم کی رد میں لکھتے ہیں کہ: یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایٹم، ایک مجرد، بسیط اور ناقابل تقسیم ذرہ ہے، کون کہتا ہے؟ (اور پھر نئی اور پرانی باتوں کو ملانے کے بعد کہتا ہے) پس دلیل عقل اور ان کی اپنی باتوں سے یہ بات اپنی جگہ ثابت ہوئی کہ یہ نظریہ غلط ہے، اس لئے کہ ایٹم طرفین کا حامل ہے، پس وہ دوطرف یا دو ''پہلو'' رکھتا ہے۔ اس رو سے وہ نہ مجرد ہے اور نہ بسیط، اور تجزیہ، جنبین (دو پہلوؤں) سے کیا گیا ہے......'' (ملاحظہ فرمایئے: خورشید تابان در علم قرآن) اور ایک محفل میں جس میں کوچھ زائرین اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ وہ اپنی اس زیارت یا اپنے مذہبی اعمال اور اعتقادات کے بارے میں کوئی نئی بات سنیں اور کوئی نئی اسلامی آگاہی انہیں حاصل ہو، حضرت واعظ کی نگاہ جونہی کچھ ایسے افراد پر پڑی جو ''بو'' لگائے ہوئے تھے، فوراً ٹرن لیا اور ان کی لائن چینج ہوگئی اور ہم نے دیکھا کہ وہ مشہور عالم مارکس (**Marxe**) کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے (راء مہملہ کی تکسیر کے ساتھ) میں نے دل میں سوچا یہ کون ہے۔۔۔ باوجود اس کے کہ ہمارا کام ہی یہی ہے۔۔۔ ہم نے آج تک اس کا نام نہیں سنا؟ اس لئے کہ اس کے خلاف گفتگو اور اس کی رد میں افکار و اقوال و تقریر کے مواد سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے؟ آخر میں اتفاقیہ طور پر اچانک

ہماری سمجھ میں بات آگئی کہ ...... ہاں!

یہ ناتجربہ کارانہ تجدد بازیوں کا عقدہ اور مغرب کی نئی دریافتوں پر گفتگو کا سلسلہ کہ جو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے مذہبی ماحول پر چھا گیا ہے، عوام اور زیادہ تر دیہات کے رہنے والوں میں بہت زوروں پر ہے۔ آج زیادہ تر دیہات کے رہنے والے گزشتہ کے برخلاف۔۔۔کہ یا تو ان کی گفتگو دین سے متعلق ہوتی تھی یا پھر اپنے ریوڑ، اپنے چوپائے، اور صحرا پر مبنی اپنی دنیا سے ...... بہرحال ان کی گفتگو اپنی حد تک محدود تھی۔۔۔ ریسٹورانوں کے پاس کی سڑکوں پر، رات کی محفلوں میں، بلکہ مسجدوں تک میں مجمع لگا کر بیٹھتے ہیں اور نئی دریافتوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور وہ بھی کس حد تک لغو، کس حد تک حقیقت سے دور، کتنی گری ہوئی اور کس قدر مضحکہ خیز!

ان ہی ''علمی محافل'' میں سے ایک محفل میں! جٹ، اپولو اور ٹیلیویژن وغیرہ کی بات ہو رہی تھی۔ ایک دیہاتی، اچانک بیچ میں بول پڑا کہ: ''تم لوگ کیا بکواس کرتے ہو؟ جٹ، اپولو اور ان سب باتوں کو چھوڑو اور اسی لفافہ کو لو۔ لفافہ کو نہ پیٹرول کی ضرورت ہے نہ اس میں کوئی موٹر لگی ہوئی ہے اور نہ ہی ہوائی جہاز کی طرح اس کے پر ہیں! کچھ بھی نہیں، صرف کاغذ کا یہ خالی لفافہ، شہر میں ہر پنساری کے پاس ہے، بہت سستا، صرف دس پیسوں کا! جس کسی کو خط لکھنا ہو، وہ دنیا کے جس کونے میں بھی ہو، لفافہ کو پکڑو، کاغذ کو اس میں ڈالو، اس کی پشت پر لکھو، خود بخود جائے گا!''

''اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ جائے گا اور اس کا جواب بھی لائے گا''!

(اللہ اکبر!)

البتہ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں وضاحت کی ضرورت پیش آئے کہ ہم جدید علوم کے کسی سبجیکٹ سے متعلق کچھ متخصص دانشوروں کے کام کو کہ جنہوں نے ''بعض قرآنی آیات یا احکام کے غیر علمی ہونے'' کی تہمت کے باب میں، یا قرآن کے بعض طبیعی (کونیہ) آیات کے علمی فہم کے لئے، علمی، تخصصی اور منطقی زبان کے ساتھ بہت سے ابہامات یا بدفہمیوں کو دور کیا۔۔۔ کہ جن میں سے بعض نے قرآن کے علمی اعجاز کو اس طرح روشن کیا کہ انسان ہل جائے۔۔۔ ان افراد کے کاموں سے موازنہ نہیں کرتے کہ جو جدید انکشافات سے اسلامی عقائد کو چسپاں کرتے ہیں۔ معمولاً ان کے کام کے نقائص دو سے زیادہ نہیں: ایک یہ کہ انہوں نے اسلام کو نہیں سمجھا ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی تعلیم چھٹی جماعت سے زیادہ نہیں ہے!

آیات واحکام کی تفسیر، ہدف اسلام کے عنوان سے نہیں بلکہ اس رابطہ کے عنوان سے کہ جو فطرتاً عملی مسائل سے رونما ہوتا ہے، ان افراد کی طرف سے کہ جو دونوں ثقافتوں کے حامل ہوں ایک قابل قدر کام ہے اور اس کی مثالوں میں ''مطہرات در اسلام'' خاص طور پر ''باد و باران در قرآن'' اور ان سب سے زیادہ عجیب تر ''سیر تحول تدریجی قرآن'' جیسی کتابیں ہمارے سامنے ہیں۔ میری گفتگو۔۔۔ مکتب امام صادق اور ان اسلامی ٹریبونز (Tribunes) کے عنوان سے۔ ایسے منابر کی تبدیلی سے ہے کہ جہاں دوسروں کی ثقافت کے تبلیغاتی وسائل کارفرما ہیں اور وہاں وہ ان کی برتری اور ہماری کمزور اور پسماندگی کو پیش کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر دین کے علمی دفاع اور جدید علم سے اسلام کی تطبیقات کا یہی حال رہا تو پھر ہمیں ان ہی

"ثقة الاسلاموں" کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ جو اس طرح قدیم انداز، اور اپنی زبان میں، "دین اسلام کا خاصہ" لکھتے اور احادیث! جمع کرتے ہیں کہ مثلاً: "قال رسول اللہ من اکل بطیخاً"، وجب لہ الجنہ"! یعنی رسول خدا کی حدیث ہے کہ جو خربوزہ کھائے گا، جنت اس پر واجب ہو جائے گی!

اس لئے کہ اس طرح کی دینی شباہت رکھنے والی کتابوں سے کم از کم ہم اپنے معاشرہ میں موجود مذہبی سوچ کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں، یعنی کم از کم ہم زوال یافتہ یا انحطاط یافتہ مذہب کا مطالعہ کریں اس لئے کہ یہ آثار اس رو سے اصالت کے حامل اور علمی مطالعہ کے قابل ہیں، لیکن فزکس کیمسٹری، اپولو اور الکٹرونیکی صنعتوں سے منسلک اسلام، نہ حقیقی اسلام ہے اور نہ خرافاتی اسلام، نہ پہلا جیسا ہے اور نہ اب جیسا، کچھ بھی نہیں ہے۔

(۶)۔ ص ۱۳۲ س ۱۳

یہ بھی ایک غلطی ہے جو ہم کر رہے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ "روشن خیال آدمی"، وہی فیلسوف اور وہی ہنرمند یا ٹیکنیشین ہے کہ جو اسلام کو آج کے جدید مغربی علوم و تمدن کی نگاہ سے دیکھتا ہے! حالانکہ "روشن خیال آدمی"۔۔۔ جیسا کہ میں نے اپنی اکثر تحریروں میں لکھا ہے۔۔۔ "ایک آگاہ ذمہ دار آدمی" ہے، خواہ وہ مزدور ہو، کسان ہو، طالب علم ہو، مصنف ہو، ہنرمند ہو، دانشمند ہو یا ان پڑھ آدمی ہو، وہ کہ جو استعمار، استبداد، استحمار، طبقاتی فاصلے اور "انسان" اور "آدمیوں" کے ہر دکھ سے دکھی ہو اور

اپنے آپ کو انہیں دور کرنے کی نسبت مسئول جانتا ہو اور ایک '' آئیڈیالوجی''، '' ایک آگاہی'' اور ایک ایمان کے درپے ہو۔

دنیا کے '' روشن خیال لوگوں'' کے ساتھ ہماری ہمرکابی اس طرح کے انسانوں کے ساتھ ہمرکابی ہے، نہ کہ خالی خولی کے دانشمندوں، ہنرمندوں، اکیڈمسٹوں، پروفیسروں، مستشرقوں، اور دنیا کے اسلام شناسوں کی ہمرکابی......! اس لئے کہ اگر یہ لوگ ۔۔۔ اوپر بیان کئے گئے مفہوم میں ۔۔۔ روشن خیال نہ ہوں تو پھر بین الاقوامی استعمار و استحمار کے شامل کار ہیں کہ جن کا شمار نہ صرف یہ کہ '' روشن خیالوں'' میں نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کے دشمنوں کے محاذ میں آتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں دنیا کے روشن خیالوں کے ساتھ ہماری وجہ مشترک اس ویتنامی کسان، اس افریقی باشندے، اس یورپی مزدور، اور اس مشقت جھیلنے والے امریکی محنت کش کے ساتھ، کہ جو ثقافتی استحمار، بین الاقوامی استعمار یا داخلی استثمار کا شکار ہوئے ہیں،...... ایک اسلام رہنما ۔۔۔ عالم ۔۔۔ یا طالب علم کا مشترک دکھ ہے، اس کے ساتھ نہیں کہ جو یورپ یا امریکا کا کوئی موجد ہے، اس لئے کہ اس کا درد خود اس کی بیداری اور ہماری دردمندی ہے! اس لئے کہ اس کے مقابل اگر ہمارا کوئی '' عقدہ'' بھی ہو تو وہ '' ہمدردی کا عقدہ'' نہیں بلکہ نفرت اور بیزاری کا عقدہ ہے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا مستشرق اور کتنا ہی بڑا فنکار کیوں نہ ہو اور '' اسلام کو ایسا دین ظاہر کرتا ہو کہ جو عالمی امن اور میٹریالزم اور مارکسسٹزم سے مقابلہ کے لئے اس کے اپنے مذہب مسیحیت سے زیادہ بہتر اور زیادہ طاقتور ہو''۔

اگر حقائق اسلام کی شناخت کے لئے کسی موازنے یا تطبیق کی ضرورت پیش آئے

اگر اسلام کی اصالت اور حقائق اسلام کے زندہ ہونے کو دکھانے کے لئے آج کی دنیا کے ان حقائق اور ان واقعیتوں سے جو اسلام کی سرحدوں سے باہر وقوع پذیر ہو رہے ہیں استشہاد لازم ہو، اگر ہماری آج کی اس نوجوان نسل اور ان روشن خیال لوگوں کی توجہات کو کہ جو مذہب سے دور ہو جاتے ہیں اپنی طرف جذب کرنے کے لئے اس بات کو ثابت کرنا ضروری ہو کہ بہت سے ترقی یافتہ انسان اور ترقی سے ہمکنار مکاتیب اور عصر حاضر کے انسانی افکار ان حقائق و شعائر تک پہنچے ہیں جن کا وجود ہمارے اسلامی متون، ہماری مکتب امامت، اور قرآن و سنت میں ہے......تو ہمیں ماہرین فزکس، ماہرین کیمسٹری، اور جٹ، اپالو، لونا اور خود الیکٹرونک اور گرڈوں کے درمیان مواصلاتی سسٹم کی طرف دوڑ کر نہیں جانا چاہئے......اس لئے کہ اسلام، فلسفہ و سائنس نہیں، رسالت ہے، کہ جو ظلم و جہل سے لوگوں کی نجات کے لئے آیا ہے، جو زمین کے مظلوموں کی آزادی، عدالت کی برقراری اور انسانوں کی نجات کے لئے آیا ہے......اس بنا پر ہمیں چاہئے کہ ہم اثبات و انطباق و استشہاد کے لئے دنیا کے مسئول روشن خیال لوگوں، ترقی یافتہ آئیڈیالوجیز اور ان سماجی تحریکوں سے رجوع کریں جن کے پاس پیام ہے، ذمہ داری ہے اور لوگوں کی نجات، انسان کی ہدایت اور زمین پر عدالت کی برقراری کے لئے شعار ہیں۔ رسالت (ذمہ داری) کو رسالت (ذمہ داری) ہی سے پرکھنا چاہئے۔ اسلام کی برتری کو گزشتہ ادیان، سماجی مکاتیب، اور انسانی، ملی، اور حال کے طبقاتی آئیڈیالوجیز کے جائزے سے دریافت کرنا چاہئے۔ وہ لوگ کہ جو ابو علی سینا، رازی، غزالی، ابن رشد، اور ملا صدرا...... کے فلسفہ و علوم کے وارث ہیں، ان کو حق ہے کہ وہ ارسطوؤں، افلاطونوں، انسٹائینوں برگسوں،

حتیٰ پاسکال، بوانکارہ، رگج، اور پاستور وغیرہ کے پاس جائیں۔ لیکن وہ لوگ کہ جو محمدؐ کی رسالت، علیؑ کی سیرت، قرآن کی دعوت، امام کی رہبری، ائمہ اور خلفاء کی تاریخ اور کربلا کے قیام کی رسالت (ذمہ داری) پر ہیں معلوم نہیں وہ افلاطون کی اکیڈمیز، انشٹائن کی نسبیت، اور ''میسٹرن کے مرکز'' پانچ میں کیا کر رہے ہیں؟

ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کو فلسفہ، سائنس، حتیٰ ٹیکنالوجی کے ساتھ لیتے ہیں اور آج بھی اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ روشن خیال حضرات --- خواہ وہ ہمارے معاشرے میں ہوں یا دنیا کے کسی حصہ میں --- تعلیمیافتہ حضرات سے مختلف ہیں۔ ہمارے روشن خیال لوگ وہ ذمہ دار افراد ہیں --- کہ خواہ وہ ان پڑھ کیوں نہ ہوں --- جو دنیا میں ہدایت کے درپے ہیں اور جو سماجی امنگوں کو مفہوم دینا چاہتے ہیں اور ذمہ داری نبھانے پر یقین رکھتے ہیں، جو مارکس، ویلہ خانوف اور ژان ژورس وغیرہ کے مکاتیب ...... اور افریقہ مشرق وسطیٰ، مشرق بعید اور لاطینی امریکہ کے قومی، طبقاتی، سماجی، اور انسانی تحریکوں ...... اور استعمار دشمن، استثمار دشمن اور طبقات دشمن انقلابات کے حامی ہیں۔

یہ روشن خیال لوگوں اور نوجوان نسل کا روٹ اور اس کی گزرگاہ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس حقیقت کو پائیں اور انہیں ان کے راستے پر قرار دیں اور پیغمبرؐ کی ذمہ داری، علیؑ کے مکتب کی پیروی اور قرآن کے پیغام کو ان تک پہنچائیں تا کہ وہ سنیں اور ان امنگوں، ان مسئولیتوں اور ان اہداف کو جو انسان کی نسبت ان کے سر میں ہے، اس کو پرکھیں اور ان اعتقادی مکاتیب (نہ کہ فلسفی اور سائنسی مکاتیب) اور سماجی تحریکوں کا ان سے موازنہ کریں جن میں وہ جذب ہوگئے ہیں اور پھر امید رکھیں کہ وہ

اسے مان لیں گے۔ روشن خیال لوگ اُس راہ سے آگے بڑھ رہے ہیں، اس طرف کی سوچ رہے ہیں۔ ان کی آرزو عدالت کی برقراری، لوگوں کی نجات، ان کی آگاہی اور دنیا کے فرعونی، قارونی، اور بلعمی طاقتوں کی بھینٹ چڑھنے والے مظلوم لوگوں کی رستگاری ہے اور تم لوگ ان سے گفتگو کرنے کیلئے ان فلسفیوں، دانشوروں، اور موجدوں کے پیچھے گئے ہو جن کی اکثریت ''فرعون کے ساحروں'' کا کردار ادا کر رہی ہے اور جنہوں نے زمانے کے اہرام کی حیرت انگیز میکنالوجی کو ایجاد کیا ہے اور زور لگا رہے ہیں کہ آیاتِ وحی، سنت رسولؐ، اور علیؑ کی راہ کو ان سے پرکھیں اور ابراہیمؑ کی رسالتؑ، آدمؑ سے حسینؑ اور حسینؑ سے آخر الزمان تک کی وراثت کو ان کی زبان سے ''OK'' کرائیں؟

روشن خیال لوگوں کی چال اُس سمت سے ہے اور زمانے کی چال نیز یہ ہے اور زمانے کے تقاضوں کے ساتھ اس زمانے میں اسلام کی کیفیت، یعنی یہ! نئے زمانے کو نئی زندگی کے ساتھ نہ جوڑیں! آج کی ضرورت کے مطابق فقہ کی صورت میں تبدیلی یہ نہیں ہے کہ ہم بیانے، بینک، بیمے وغیرہ کو رسالوں میں پیش کریں اور اس کے لئے شرعی توجیہ لائیں بلکہ جدید معاشی ضرورت، فقہی نظام ہے کہ جو عدالت پر مبنی ایک معاشی اساس کے ساتھ سازگار ہو اور ایک نئے مصرف، نئی تقسیم، اور نئے پیداواری نظام کی بات کرے۔

اس کیفیت سے...... افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بہت سے دینی مراکز اس انتہائی حیاتی اور خوش وضع واقعیت کو تشخیص نہ دیتے ہوئے متجدد دنیا سے ہم مسلمانوں کی دوستی کی جستجو میں ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ مغربی ایجادات اور

اکتشافات کے ساتھ ہمارے دینی اعتقادات کی اس طرح کی ''مطابقتوں'' سے ہم کو دنیا کے روشن خیالوں کے عالمی دشمنوں سے آشتی دیں! حالانکہ ہمیں ان ''تطابقوں'' اور پھر اپنے عالمی دشمنوں سے دوستی کی ضرورت نہیں ہے اور ہمیں اس طرح کے ''تشبیہ'' اور ''تطبیق'' سے سخت نفرت ہے! بقول ''فرانتز فانون'' کے ۔۔۔ تیسری دنیا سے خطاب ۔۔۔ ہم نہیں چاہتے کہ دنیائے اسلام سے ایک یورپ کو جنم دیں، امریکہ کا تجربہ ہماری سات پشتوں کے لئے کافی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اسلام سے ایک ''نئے انسان'' کو پیدا کریں، ایک نئی نسل کو وجود میں لائیں، اور کوشش کریں کہ اسلام ہم سے ایک ایسا انسان پیدا کرے جو آپ اپنے پیروں پر کھڑا ہو، اور ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس قرآن سے آپ لوگ کوئی کیمیائی یا فزیکی فارمولا دریافت نہ کریں، اپالو بھی نہیں حتی ٹرانزسٹر لیمپ بھی نہیں، حتی بسم اللہ کے ''ب'' کے نقطہ سے سات لاکھ ۲۷ ہزار پیچیدہ رموز بھی استخراج نہ فرمائیں، بلکہ لوگوں کی زندگی کے لئے وقف کریں اور اس کو ایسی سادگی سے جس سادگی سے غیر تعلیم یافتہ بدوی، جندب بن جنادہ غفاری سمجھتا تھا اور جس نے اسے ''ابوذر'' بنادیا تھا، ہم بیسویں صدی کے لوگوں اور اس نسل کے آگاہ روشن خیالوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو درس دیں! اور بس!

(۷)۔ ص۔ ۱۶۷ س ۲

مثلاً جناب رسالتمآب ؐ سپہ سالار کے عنوان سے موتہ کی جنگ کے کمانڈر کو، جنگ

کی اس طرح اسٹریٹجی بیان کرتے ہیں:

"......لشکر کو چاہئے کہ وہ فلاں مرکز سے حرکت کرے......اس طرح چلو کہ جب راستے میں آنے والے قدیم کھنڈرات سے گزرو تو اسے تیزی سے عبور کرو۔ چلنے کے لئے ایسا وقت منتخب کرو کہ جب موتہ پہنچو تو اس وقت سورج ڈھل چکا ہو اور تاریکی پھیل گئی ہو......رات کو وہیں آرام کرو اور اسی رات حالات اور شرائط کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرو کہ تم صبح ہونے پر لڑائی کا آغاز کر سکتے ہو یا نہیں۔ مثبت صورت میں، موذن بلند آواز میں اذان نہ دے تاکہ سپاہیوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز کے فوراً بعد حملہ کرنا ہے اور اگر حالات نامساعد ہوں اور حملہ میں تعویق و تاخیر کا ارادہ ہو تو موذن بلند آواز میں اذان دے تاکہ سپاہیوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ آج حملے کا آغاز نہیں کرنا ہے۔ اپنی چھاؤنی کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کرو کہ جو اولاً روم کے سپاہیوں اور شام کے عرب قبائل کے درمیان واقع ہو کہ جو روم کا نوآبادیاتی علاقہ بھی ہے اور اس کا حلیف بھی، تاکہ دو طاقتوں کی ایک دوسرے سے ملنے کی راہ مسدود ہو جائے اور دشمن کی طاقت میں اضافہ نہ ہو......ثانیاً جنگی کارروائی کے لئے مناسب ترین جگہ ہو اور ثالثاً اس کی پشت کسی ایسی پناہ گاہ اور گریز گاہ سے متصل ہو کہ احتمالی شکست کے موقع پر اس سے استفادہ کیا جا سکے اور رابعاً اس کا رخ شام کے عرب قبائل کی رہائش گاہوں کی طرف ہوتا کہ اگر وہ دوسرے کسی راستے سے روم کے سپاہیوں کو تقویت پہنچائیں تو ان کے غیر محفوظ خیموں اور گھروں پر حملہ کا امکان موجود ہو اور وہ اپنے خیموں اور اپنے گھروں کی حفاظت کی خاطر اس طرح کے اقدام سے منصرف ہوں...... ضمناً پہلے پرچم "زید" کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، اگر اسے شکست ہوئی تو "جعفر" کو چاہئے کہ وہ

اسے سنبھالے اور اگر اسے بھی شکست ہوئی تو ''عبداللہ بن رواحہ'' کو چاہئے کہ وہ اس کام کو اپنے ذمے لے...... اور اگر وہ بھی شکست سے دوچار ہوا تو پھر تم لوگ خود وہاں فیصلہ کرو کہ کس کو کمانڈر بناؤ گے اور کس کے ہاتھ میں پرچم دو گے......''

یہاں تک جنگ کی وہ اسٹریٹجی ہے جسے جناب رسالتمآبؐ نے ازقبل پیش کیا ہے، لیکن اس اسٹریٹجی کی ٹکٹیکس، وہی تدابیر، وہی طریقے اور وہی وسائل ہیں کہ جو جنگ کے شروع ہونے کے بعد معرض وجود میں آتے ہیں اور اس سے پہلے وہ قابل پیش بینی نہیں ہیں۔ مثلاً مذکورہ تین نامزد کئے گئے کمانڈر جنگ کی اسٹریٹجی قائم رکھنے کے لئے دوران جنگ اپنی کارروائیوں کے ضمن میں کچھ ٹیکٹکس کو بروئے کار لاتے ہیں...... یہاں تک کہ تیسرا نامزد کمانڈر بھی شکست سے ہمکنار ہو کر مارا جاتا ہے۔ لشکر ''خالد بن ولید'' کو جو تازہ مسلمان ہوا ہے مگر عرب کا ایک مشہور اور جری کمانڈر ہے، اپنا سردار منتخب کرتا ہے۔ خالد دیکھتا ہے کہ روم اور عرب کے دو لاکھ سپاہیوں کے مقابل تین ہزار کی تعداد پر مشتمل فوج کی جنگ جائز نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں تین ہزار سپاہیوں کی یہ فوج کہ جو سب کے سب مسلمان ہیں ضائع ہو جائے گی اور دشمن کی دو لاکھ فوج غیر محفوظ مدینہ کی طرف کہ جو اسلام کا نیا ابھرنے والا جدید مرکز ہے بڑھنے لگے گی...... لہٰذا وہ ایک نئی ٹیکٹک سے کام لیتا ہے اور وہ اس طرح کہ، اسی کاری ضرب کو سامنے رکھتے ہوئے کہ جسے کچھ دن پہلے ان ہی دو تین ہزار افراد نے روم اور عرب کے عظیم لشکر پر لگایا تھا اور انہیں سمجھا دیا تھا کہ اسلام کا ہر سپاہی رومی لشکر کے دس، بیس یا سو افراد پر بھاری ہے...... اس نے اپنی فوج کے ایک ٹکڑے کو رات کے اندھیرے میں چھاؤنی سے باہر بھیجا تا کہ وہ صبح کے قریب جلتے ہوئے مشعلوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر بکھرے ہوئے انداز میں شور مچاتے اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے

اسلامی سپاہ کی چھاؤنی کی طرف بڑھتے چلے آئیں تا کہ اس طرح دشمن یہ سمجھے کہ مدینہ کی طرف سے اسلام کے سپاہیوں کی مدد کے لئے ایک نئی تازہ دم فوج میدان جنگ میں وارد ہو رہی ہے۔ یعنی چونکہ خود روم کی عظیم شخصیت، اسلامی سپاہیوں سے لڑنے کے لئے ''روم۔عرب'' کے لشکر میں آپہنچی ہے اس رو سے رسول اسلام نے بھی اپنی پوری فوج لڑنے کے لئے بھیجی ہے اور اس صورتحال میں کہ اسلام کے ان تین ہزار سپاہیوں نے کئی دن سے روم و عرب کی عظیم طاقت کو معطل کر دیا ہے، اس عظیم تازہ دم طاقت کی آمد جنگ کی سرنوشت کو مسلمانوں کے حق میں بدل دے گی۔ خالد اس ٹیکٹیک کو بروئے کار لانے کے بعد ایک اور ٹیکٹیک کو عمل کے مرحلہ میں لاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ فوری طور پر دشمن کے سپاہیوں میں یہ بات پھیلاتا ہے کہ مدینہ کے ہائی کمان سے اس کے سپاہیوں کو پسپائی کا حکم ملا ہے...... لہٰذا وہ اپنے سپاہیوں کو پوچھنے سے پہلے مدینہ کی طرف واپس لوٹنے کا حکم دیتا ہے۔ روم کے سپاہی یہ خبر سن کر خوش ہوتے ہیں اور ان کے خوف اور گھبراہٹ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس طرح خالد بن ولید اس لڑائی کے ضمن میں ان ٹیکٹیکس کی کارگزاری سے اپنی تین ہزار کی فوج کو کہ جو مکمل طور پر اسلام کی نئی تحریک کی طاقت ہیں، روم اور عرب کے دو لاکھ سپاہیوں کے نرغے سے نکال لاتا ہے۔

(۸)۔ص ۱۷۱ س ۸

ہم امامی شیعوں کے عقیدہ کے مطابق، امام زین العابدین کے بعد سلسلہ امامت، امام محمد باقر علیہ السلام کو جاتا ہے، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، امام محمد باقر

علیہ السلام نے تلوار کے ساتھ قیام نہیں کیا، اور یہی صورت امام جعفر صادق کی بھی رہی اور انہوں نے بھی بعض وجوہات کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔

دوسری سمت سے قیام عاشورہ کے بعد حاکم کی ظالم مشنری اس طرح سینوں میں دموں کو گھونٹی ہے کہ حتیٰ کئی نسل بعد تک بھی اپنے آپ کو مسلحانہ قیام حتیٰ فکری مبارزہ تک سے آسودہ سمجھتی ہے۔ کہ اچانک جناب زید کے ہاتھوں اتنی پر حشمت انداز میں مسلحانہ قیام کا عمل ظہور میں آتا ہے۔

ایک ایسی صورت حال کے ساتھ یہ توہم پیدا ہوتا ہے کہ (جب امام محمد باقر۔۔۔ اور بعد میں امام جعفر صادق۔۔۔ نے مسلحانہ قیام نہیں کیا تو) زید کا مسلحانہ قیام۔۔۔ قیام بالسیف۔۔۔ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ زید پانچویں امام کو امام نہیں جانتے تھے!

......یہیں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روایتیں گڑھی گئیں کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے زید کے عمل کی مذمت کی ہے اس لئے کہ اس نے حی و حاضر امام کے عمل کی ضد پر عمل کی ہے اور اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ امامت کے معتقد نہیں تھے۔۔۔ یعنی نعوذ باللہ وہ دین سے خارج تھے یا کم از کم شیعہ نہیں تھے!؟!

سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ان جعلی روایتوں کو اس لئے پھیلایا تا کہ انے "دوست" کے دست و دہان پر دے ماریں۔ اور یہی وہ ایک بات ہے جو ہمیشہ سخت ترین اور دردآور ترین صدمہ کا باعث رہی ہے......

......یہ لوگ بنی امیہ کی اس طرح کی جعلی روایتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے ہیں۔ اور اس طرح کی روایتوں کے جاعل کو سمجھے بغیر ایک اور "شاہکار" کا ارتکاب بھی

کرتے ہیں تا کہ معاملہ کے سرے اور تلے کو ایک طرف سے اس طرح ملائیں کہ جس سے زید کے اس قدر عظیم الشان مسلحانہ قیام کی توجیہ ہو اور دوسری طرف سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچے کہ نعوذ باللہ وہ ''مرتد'' تھے!

ان ہی کتابوں میں سے ایک کتاب میں (جس کا نام میں صفوی شیعوں کے خوف سے ظاہر نہیں کرتا) لکھا ہے کہ: ''......امام محمد باقر سے پوچھا گیا کہ کیا زید کو اس بات کا علم تھا کہ آپ اپنے والد (امام زین العابدین) کے بعد مفترض الطاعہ امام ہیں یا نہیں؟......مثبت صورت میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے مرتد ہو گئے ہیں اور منفی صورت میں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کے والد امام زین العابدین نے آپ کی امامت کو از قبل انہیں نہ کہی ہوتا کہ وہ ایک ایسے نادرست عمل کے مرتکب ہوں؟''

کتاب کا لکھنے والا، اس بات کو نقل کرنے کے بعد اپنے ایک بڑے انکشاف کا اضافہ کرتا ہے کہ امام نے فرمایا: جی ہاں۔

''......جی۔امام زین العابدینؑ ایک جانب سے زید کو ازحد چاہتے تھے۔۔۔ اس لئے کہ وہ حقیقتاً سب کی محبتوں کو سمیٹے ہوئے تھے اور ہر کوئی انہیں دل و جان سے چاہتا تھا، کیونکہ ان کی دلیری اور ان کی شجاعت کے علاوہ، ان کی پارسائی، ان کا تقویٰ، اور ان کی عبادت بھی زبانِ زد خاص و عام تھی......اور اس کا سبب یہ بھی تھا کہ کسی کو ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایک عمیق تبدیلی کو معرض وجود میں لائیں گے ۔۔۔اور دوسری طرف سے جانتے بھی تھے کہ ان کے بعد امام، محمد باقر علیہ السلام ہیں۔اور تیسری طرف سے یہ بھی جانتے تھے کہ زید، ہر حال میں حتمی طور پر قیام کریں گے......اسی لئے انہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام کی امامت کو مخفی رکھا

تا کہ زید کو اس بات کا پتہ نہ چلے کہ بعد کے امام، امام محمد باقر علیہ السلام ہیں نہ کہ وہ، تا کہ مبادا وہ حی و حاضر امام کے عمل کے برخلاف کام کر کے اپنے قیام سے مغلوب و مرتد ہو جائے! اس لئے کہ بعد کے امام کی امامت سے واقفیت کے بغیر قیام، شرعی اشکال سے خالی ہے......!؟

یعنی ان صاحب کے ''نقطہ نظر'' کی بنیاد پر، امام زین العابدینؑ نے اپنے فرزند کی ''ذاتی محبت'' کی خاطر بعد کی ''امامت'' جیسی حقیقت کو ان سے پوشیدہ رکھا!!

توجیہ کو ملاحظہ فرمائیے! کس قدر مسائل کو مسخ اور موڑتے ہیں! ایک طرف سے امامت کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ وہ مطلق بشر کے کام نہیں آتی اور دوسری طرف سے اسی مسئلہ کو اتنا حقیر کرتے ہیں کہ وہ خصوصی اور گھریلو مسائل کے زیر سایہ آ جاتا ہے!!......

بالکل ان صاحب کے عمل کی طرح جو فرماتے تھے...... ''امام اور خلیفہ کے درمیان ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی، مگر الحمد للہ بعد میں جا کر انہوں نے روبوسی کی (ایک دوسرے کا چہرہ چوما) اور ان کا اختلاف دور ہو گیا''!

(۹)۔ ص ۱۷۱ س ۱۱

فرانسیسی رپورٹر ''مادام میشن'' یمن کے انقلاب کے بعد وہاں گئیں تا کہ یمن کی انقلابی صورتحال کے بارے میں اخباری رپورٹ تیار کرے۔ اس رپورٹر کا نتیجہ سفر، مقالات کا وہ سلسلہ تھا کہ جو اس کے اخبار کے دس شماروں میں شائع ہوا۔ اس کی

رپورٹ کا سب سے دلچسپ نکتہ اس کی اس ''امام'' اور ''امت'' کی تصویر کے ایک گوشہ سے متعلق تھی۔ اس خاتون رپورٹر کی رپورٹوں کے بعض حصوں کو پیش کرنے سے پہلے، شاید اس نکتہ کی یاددہانی بے محل نہیں ہوگی کہ ''زیدی'' حضرات کا مرکز یمن ہے کہ جہاں لوگ مستقل طور پر ہمیشہ اس ''قائم بالسیف'' امام کے پیچھے ہوتے ہیں جس کی کمر پر ہمیشہ تلوار لٹکی ہوتی ہو!

اب مادام میشن کی رپورٹوں کے بعض حصے، اس کی خود اپنے زبان سے۔۔۔ مگر معمولی سی تبدیلی کے ساتھ۔۔۔ نقل کیے جاتے ہیں:

......امام۔۔۔ امام البدر۔۔۔ کے حواری، جہاندیدہ اور بیرون ملک سے پلٹے ہوئے لوگ ہیں۔۔۔ اس لئے کہ انہوں نے عربستان کا دورہ کیا ہے اور وہاں ان کا سروکار عام طور پر بیرونی رپورٹروں سے رہا ہے۔۔۔......

اس سفر میں ''باہر سے پلٹے ہوئے'' ایک آدمی، یعنی عربستان کا دورہ کرنے والے ایک شخص کو میرا میزبان بنادیا گیا...... تاکہ ایک ایسا آدمی میرے ساتھ ہو جس نے دنیا (یعنی عربستان) دیکھی ہو اور آداب معاشرت سے واقف ہو، اور مجھ غیر ملکی سے غیر ملکی زبان میں گفتگو کرسکے...... اس ''جہاندیدہ'' آدمی نے اسی پہلی ملاقات میں جو پہلا سوال مجھ سے کیا وہ یہ تھا:

۔۔۔ خاتون! آپ کا اسلحہ کہاں ہے؟

۔۔۔ ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہے...... قلم ہے، ہم رپورٹر ہیں......!

۔۔۔ اچھا تو آپ کا امام کون ہے؟

۔۔۔ ہمارا کوئی امام نہیں

۔۔۔!!!......؟!......تو پھر اس بدذات ناصر نے آپ سے بھی آپ کے امام کو چھین لیا ہے؟......کتنے عرصے سے آپ کے پاس امام نہیں ہے؟

۔۔۔بہت عرصہ ہوا۔ تقریباً انقلاب فرانس کے بعد سے ہمارے سارے امام رخصت ہو گئے......اور اب ہم بے امام ہیں!

۔۔۔شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے اسلحہ کو خیر باد کہا ہے......!؟

اس کے بعد اس نے دوسرا سوال کیا

۔۔۔آپ کی حکومت کس نوعیت کی ہے؟

۔۔۔ہماری حکومت جمہوریت۔۔۔جمہوریت۔۔۔ہے......

فوراً غصہ سے بھر گیا اور لگا ناصر کو گالیاں دینے کہ:

۔۔۔یہ ناصر کی مادر بخطا عورت فرانس پر بھی حکومت کر رہی ہے اور صنعا پر بھی؟

۔۔۔ناصر کی عورت کا یہاں کیا کام ہے؟

میں فوراً سمجھ گئی کہ چونکہ انقلابیوں۔۔۔جمہوری پسند لوگوں۔۔۔نے صنعا کو اپنے تصرف میں لے کر امام کو پہاڑوں پر پھینک دیا ہے اور ابھی لڑائی جاری ہے اور یمن کے پایۂ تخت ''صنعا کے ریڈیو سے مسلسل ''الجمہوریہ''!......جمہوریہ ہم پر حکومت کر رہی ہے......امام گئے......اور جمہوری آئی......جیسے نعرے نشر ہو رہے ہیں، اور چونکہ یہ نام بھی ایک مونث نام ہے، اس رو سے امام کے ان ''جہاندیدوں'' اور باہر کی دنیا دیکھنے والے پیروکاروں کے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ ''الجمہوریہ'' ناصر کی بیوی کا نام ہے......اور ناصر نے ''امام مفترض الطاعۃ'' کو پکڑ کر یمن (اور فرانس سے؟) باہر دھکیل دیا ہے اور اپنی عورت کو فرانس پر بھی اور یمن کے ''مسلمان لوگوں'' پر بھی مسلط

کر رہا ہے۔ یعنی شاید ناصر کی بیوی جنرل دوگل ہے!......

جہالت کا بیڑا غرق ہو کہ وہ کس قدر انسان کو اور ایک قوم کو حتیٰ شیعہ مسلمان قوم کو بدنما کرتا ہے؟ اور کتنی سہولت اور کتنی مضحکہ خیزی کے ساتھ دشمن کے ہاتھ کا کھلونا بنا تا ہے!

ہمارے یمنی بھی اس سے کم نہیں ہیں۔

(ملاحظہ فرمایئے آقای محمد علی انصاری کی کتاب ''دفاع از اسلام وروحانیت''!)

(۱۰)۔ ص ۱۷۲ س ۴

اس رپورٹر خاتون نے اپنے ان مقالات میں تین افراد کو دنیائے شراب کے سب سے بڑے کلکشنز کے عنوان سے پیش کیا ہے کہ جن میں سے ایک یہی ''قائم بالسیف'' امام مفترض الطاعہ ہے کہ جس نے خمس کے پیسے سے، دنیا میں شراب کے اس مشہور ترین کلکشن کو آمادہ کیا ہے۔ یہ ایک ایسا کلکشن ہے کہ اگر وہ اس کو بعد فرار صنعا سے باہر لے جاسکتا تو اس کی فروخت سے امریکہ اور کینڈی کا محتاج بنے بغیر جمہوریت کے دلدادوں سے برسہا برس تک اپنی جنگ جاری رکھ سکتا تھا!

وہ لکھتی ہے ''مشرق وسطیٰ کے دوستداروں کی امریکی انجمن'' (؟) اسی امام اور اس کے حواریوں کے لئے ایسی صندوقیں بھیجتی تھی جس پر دو ہاتھ اپنی دوستی کی علامت کے عنوان سے بطور مونوگرام چپکائے جاتے تھے اور ان کے اندر ''قائم بالسیف'' امام کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسلحہ بھرا ہوتا تھا۔ ان دنوں ''جان آف کینڈی'' کی

حکومت تھی اس لئے ''کینیڈی'' کا نام بھی ان پر رکھ دیا جاتا تھا.....

یہ لوگ اس احتمال کو سامنے رکھتے ہوئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں لوگ اس بات سے مشتعل ہوں کہ مثلاً ''ان اسلحوں کو کفار اور مسیحی لوگ بھیج رہے ہیں تا کہ ہم مسلمان بھائی ایک دوسرے کا خون بہائیں'' کہتے تھے کہ ان اسلحوں کو ''کندی'' لوگ (یعنی عربستان کے ''کندہ'' نامی قبیلے کے لوگ، کہ مشہور شخصیت امراء القیس بھی ان کا سردار تھا۔۔۔اس کے علاوہ ''کندی'' نام کا ایک فلسفی بھی شہرت کا حامل ہے۔۔۔) بھیجتے ہیں کہ جو ''عرب'' ہیں!؟

حالانکہ اس غریب کندہ قبیلہ کا آج پتہ بھی نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے اور کہاں سے وہ انہیں اسلحہ بھیج رہا ہے......

یہ ہے اس پُر جوش انقلابی تحریک کے پاسداروں کی آگاہی کہ کبھی ان کے روشن ستارے جناب زید ۔۔۔ اور جناب یحیٰی ۔۔۔ ہوا کرتے تھے ......کہ جو رسول خدا کے گھرانے کی آبرو تھے۔ (یہاں زیدی نسل کی بات نہیں ہو رہی ہے زیدی فرقہ کی بات ہو رہی ہے)

☆☆☆

علی شریعتی کو سمجھئے

ڈاکٹر علی شریعتی...... حجت الاسلام علی اکبر ہاشمی رفسنجانی کی نگاہ میں
(روزنامہ اطلاعات کے حوالے سے ایک انٹرویو)

ڈاکٹر علی شریعتی کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے اس تحریک کی واقعاً خدمت کی ہے۔ حالیہ برسوں میں ان کی کوششوں نے ان لوگوں پر جن تک ہماری پہنچ نہیں ہے بڑا گہرا اثر قائم کیا اور میدان چھوڑنے والوں کو پھر میدان میں لا گھسیٹا۔ وہ اپنے تجربہ کی بنیاد پر اس مفہوم میں کہ وہ عملی طور پر ایک استاد تھے، پھر بیرون ملک بھی رہ چکے تھے اور سماجیات میں انہیں مکمل دسترس بھی حاصل تھی اور نیز نئی نسل کی خصوصیات اور باطنی کیفیت سے بھی واقف تھے، معاشرے میں ایک موثر مقام کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے نسبتاً ایک طاقتور موج ابھاری۔ اب جو اشکال پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ انہوں نے زیادہ تر نوجوان نسل اور نام نہاد روشن خیال طبقہ پر توجہ دی، پھر ایک عرصہ تک وہ ایران سے باہر بھی رہے ان کو علمی حوزوں اور روایتی مذہبی ماحول سے پوری طرح واقفیت نہیں تھی۔ قم کے علمی حوزہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ روزانہ لوگوں سے رابطہ رکھتا ہے، یہاں کے طلبہ شہروں اور دیہاتوں میں جاتے اور محروم عوام سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اس کیفیت میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی تقریریں بھی زیادہ تر ایک خاص طبقے کے خلاف تھیں۔ ان کے بعض تاثرات اور بعض

نظریات ہمارے معاشرے کے زیادہ تر حصہ کے مقتضیات سے ہم آہنگ نہیں تھے، اپنی عظیم خدمات کے ضمن میں بعض اوقات وہ اس کمی سے بھی دوچار ہوتے تھے۔

مجموعی طور پر میرا عقیدہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک بہت موثر اور مفید خدمت انجام دی ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی خدمتوں کی قدر کریں اور انہیں سراہیں۔

س۔ ہر کسی طرح شہید شریعتی کی فکر میں بھی کمزور پہلو کا عنصر موجود ہے مگر ہم ایسی رو کو دیکھتے ہیں جن کا کام اور جن کے پروگراموں کا محور شریعتی کی تضعیف و تذلیل ہے۔ البتہ ایک رو اور بھی ہے جو شریعتی کو مطلقیت دیتی ہے اور بعض سیاسی اغراض کی بنیاد پر انہیں ذریعہ تمسک بنا کر ان کی کمزوریوں کو کہ جو ہر مفکر کی نسبت ایک فطری امر ہے، ماننے کے لئے تیار نہیں۔ آپ ان دونوں روشوں کی کس طرح توجیہ کریں گے؟

ج۔ میں ڈاکٹر کو ایک خوش نیت آدمی سمجھتا ہوں۔ وہ عمداً مسائل کو غلط پیش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی سوچ کے یک رخی پن کی دلیل پر، اس لئے کہ قوم کے اس طبقے سے ان کا صحیح طور پر رابطہ نہ تھا، ان کے تجزیوں میں کسی قدر محرومی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ بس یہی اس بات کا سبب بنی کہ قوم کے اس طبقے کو ان سے ایسی چاہت اور ایسی نزدیکی حاصل نہیں ہوئی جیسی ہونی چاہیے تھی۔

س۔ کیا آپ اس معاملے کی تائید کرتے ہیں؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمیں اس بات کا علم ہو جائے کہ کسی کی نیت میں فتور نہیں تو اس پر ضرب نہیں لگانا چاہیے بلکہ تنقید کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ معاشرے میں تعمیری تنقید کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ ہمارا معاشرہ چونکہ ایک منجمد معاشرہ

تھا اور اس پر دباؤ اور آمریت مسلط تھی اس لئے اس میں یہ عادت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ مسائل کو وسعت نگاہ سے دیکھے۔ ہمیں اس مسئلے کو ماننا چاہئے کہ ہمارے پاس مطلقیت کا حامل انسان آئندہ بھی کبھی نہیں ہوگا۔ علی شریعتی کی تائید میں مطلق پسندی صحیح نہیں، اس لئے کہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم نے پورے معاشرے کو ان کے حوالے کر دیا ہے اور دوسری طرف سے ان کی تذلیل وتضعیف بھی صحیح نہیں اس لئے کہ اس طرح ہم ان کے ان بہت سے افکار کو جو قوم کے لئے مفید ہیں قوم کے ہاتھ سے چھین لیں گے۔ دراصل کسی بھی صاحب فکر کے بارے میں اس طرح کا سلوک صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی...... حجت الاسلام مہدوی کروبی کی نگاہ میں

(''زن روز'' کے حوالے سے ایک انٹرویو)

س ۔ جناب حجت الاسلام کروبی مہربانی فرما کر ڈاکٹر علی شریعتی سے اپنی آشنائی کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے اور بتائیے آپ ان کی شخصیت کے خاکے کو کس طرح پیش کریں گے؟

ج ۔ ڈاکٹر صاحب سے میری حضوری آشنائی نہیں تھی، لیکن میں ابتدا ہی سے ان کی تقریروں، ان کے آثار اور ان کی اخلاقی خصوصیات سے واقف تھا۔ ۱۹۷۴ء میں جب انہیں قیدی بنایا گیا تو وضو کے موقع پر جب ہمیں باہر لیجایا جاتا تھا تو ان سے گفتگو کی کچھ سبیل نکل آتی تھی اور ہم دو ایک جملے رد و بدل کر لیا کرتے تھے، اور میں اس صورت سے ڈاکٹر صاحب کو جانتا ہوں۔

جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر شریعتی ایک استعمار دشمن، استثمار دشمن اور استبداد دشمن انسان تھے۔ ملت اسلامیہ کے لئے ان کے دل میں بڑا سوز و گداز تھا اور وہ اس راہ میں اپنی کوششوں کو بروئے کار لاتے تھے۔

س ۔آپ کی نظر میں نوجوان نسل کی فکر کو بیدار کرنے میں ڈاکٹر صاحب کا کردار کس حد تک تھا؟

ج ۔ڈاکٹر صاحب کا کردار نسبتاً اہم تھا۔ قوم کی پیاس اور استبداد کی اس کیفیت میں ان کی تقریریں روشن خیال طبقے پر بہت زیادہ اثر انداز تھیں۔ شریعتی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے دانشگاہی صنف کی نوجوان نسل کی فکر کو اسلام کے مسائل کی نسبت روشن کیا اور انہیں مارکسسٹوں کی طرف جانے سے روکا۔

اس زمانے میں ہمارا سامنا فاسد نظام سے تھا اور حکومت وقت کے خلاف جو نغمہ بھی الاپا جاتا تھا اس کی پذیرائی ہوتی تھی، خاص طور پر اس وقت جب اس کا آہنگ اور اس کی فریاد اسلامی مسائل سے ملی ہوتی تھی تو اس میں اور بھی تاثیر پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہت سے اسلامی مسائل کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا، لہذا جس قدر سامنے والا مذہبی طاقت کا حامل ہوتا تھا اور جس قدر اس میں نوجوانوں کی پیاس بجھانے کی صلاحیت ہوتی تھی اور وہ ایسے مسائل کو پیش کر سکتا تھا جس سے حاکم نظام متزلزل ہو اسی قدر وہ لوگوں کے لئے اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ لیکن انقلاب کی کامیابی کے بعد لوگوں کی توجہ اسلام کے اصیل نکات کی طرف بڑھ گئی اور یہ اس بات کا سبب بنی کہ تمام لوگ اور تمام جماعتیں اپنے بارے میں تجدید نظر کریں اور ہم ڈاکٹر کو ”تمام لوگوں“ میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن اس امر پر توجہ ضروری ہے کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی

عیب ہے اور ڈاکٹر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

وہ بہت عمدہ قدرت بیان اور قوت خلاقیت کے حامل تھے، لیکن ایک اسلامی کارشناس یا ایک فقیہ وفیلسوف نہیں تھے۔ان مسائل میں قدم رکھنے اور اظہار نظر کرنے کے لئے تخصص یا مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان مسائل میں وارد ہوتے تھے اور اسی لئے بعض لوگ ان مطالب سے بیجا فائدہ اٹھاتے تھے۔ گو کہ وہ خود بھی کہتے تھے کہ مثلاً اس مسئلہ کا تعلق فلاں سے ہے لیکن اس میں داخل ہو جاتے تھے۔

س ۔ڈاکٹر علی شریعتی اور استاد شہید مطہری کے روابط ایک دوسرے سے کیسے تھے؟

ج ۔ڈاکٹر علی شریعتی اور مرحوم شہید مطہری میں بڑی دوستی تھی، لیکن مرحوم مطہری کو جو مسئلہ آشفتہ کرتا تھا وہ فقہی مسائل سے ڈاکٹر صاحب کی ناواقفیت تھی اور ایسے مسائل کو پیش کرنا تھا کہ جو بڑے علماء کی تضعیف اور دوسروں کو بیجا فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرتی تھی۔ان کے نظریات کی نسبت شہید مطہری کے اپنے نظریات تھے اور وہ ان مطالب کی رد میں گفتگو کرتے تھے، اور خود ڈاکٹر علی شریعتی اواخر میں اپنے کام کے نقص کو سمجھ گئے تھے اور انہوں نے آقای محمد رضا حکیمی سے کہہ دیا تھا کہ میرے مطالب کے بارے میں آپ جو قرین مصلحت سمجھیں اسی کو عمل میں لائیں۔

س ۔علمی حوزے ڈاکٹر علی شریعتی کے آثار کی نسبت کس انداز سے پیش آتے ہیں؟

ج ۔البتہ علمی حوزے بنیادی اسلامی مسائل کا جائزہ لیتے ہیں اور وہ مطالب کہ جو اشعاری یا احساساتی پہلو کے حامل ہوں یا جنہیں دوسری جگہوں سے قرض لیا گیا

ہو، حوزوں پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ معارف اسلامی میں حوزے ہر مسئلہ میں قرآن، حدیث، فقہ اور مفسرین کے مباحث کی رعایت کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور مسئلہ کو ایک رخ سے نہیں دیکھتے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کے بارے میں آیت اللہ مہدوی کنی کے تاثرات

(روزنامہ اطلاعات کے حوالے سے ایک انٹرویو)

س ۔لوگوں کے افکار پر ڈاکٹر صاحب کے آثار کی تاثیر کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

ج ۔نوجوانوں کے افکار و اذہان اور سابقہ حکومت کے مقابل پر ان کی تحریریں اور تقریریں تعمیری کردار کی حامل تھیں۔لیکن ان کے بعض تاثرات اور بعض مواقف نے منفی اثرات قائم کئے اور یہی حکومت کا منشا تھا اور وہ نوجوانوں، تعلیم یافتہ لوگوں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان تفرقہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔لیکن اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ مرحوم ڈاکٹر کے متاخرہ آثار اس کے شروع کے آثار سے بہتر ہیں اور ان میں کمتر منفی نکات پائے جاتے ہیں۔

س ۔آپ کی نظر میں ان تنقیدوں اور ان کشمکشوں کا اصلی سبب کیا تھا؟

ج ۔میری نظر میں ان حالات کا تعلق مذہب سے بھی تھا اور سیاست سے بھی؟ لیکن اس کا سیاسی پہلو زیادہ قوی تھا اور حکومت پوشیدہ طور پر موجود مذہبی تعصبات سے استفادہ کرتے ہوئے بیجا سیاسی فائدے اٹھانے کی کوشش میں تھی، لہٰذا امام خمینی نے

بھی اپنی خصوصی درایت سے بہت حد تک اس سوءاستفادہ کی راہ روکی۔

س ۔ڈاکٹر علی شریعتی کے آثار کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ج ۔ڈاکٹر صاحب کی تحریریں گو کہ کسی خاص زمانے میں محدود نہیں ہیں، لیکن یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ ڈاکٹر صاحب کے آثار انقلاب سے پہلے کے حالات کی آگاہی سے ماخوذ ہیں۔ انہوں نے ان مسائل سے اثر لیا ہے۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی مفکر کے آثار اس طرح کی تاثیرات سے خالی نہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب کے آثار اور ان کے تاثرات کو وحی منزل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس اعتبار سے نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ ان کے مثبت اور منفی نکات کو ایک دوسرے سے الگ کریں تا کہ وہ حیرانی اور سرگردانی کا شکار نہ ہوں۔ ان موارد میں وہ امام خمینی اور متقی اور قابل اعتماد صاحبان فکر کی رہنمائیوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی کے بارے میں ڈاکٹر عباس شیبانی کے تاثرات
(''زن روز'' کے حوالے سے ایک انٹرویو)

س ۔براہ کرم فرمایئے آپ ڈاکٹر علی شریعتی کو کب سے جانتے ہیں؟

ج ۔میں علی شریعتی کو طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ ۱۹۵۶ء میں جب سوئز کینال پر انگلینڈ اور فرانس نے حملہ کیا تو اس سازش کے خلاف ہم نے یونیورسٹی میں مظاہرات کا سلسلہ شروع کیا اور پھر جب تعلیم کے سلسلے میں مجھے مشہد آنا پڑا تو وہیں میری ملاقات ان سے ہوئی اور اسی وقت سے میں انہیں جاننے لگا۔

س ۔ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بارے میں آپ کی تشخیص کیا ہے؟

ج ۔ڈاکٹر علی شریعتی اعتقادی نقطہ نظر سے مسلمان تھے اور ائمہ اطہار کی نسبت ان کا اعتقاد دائرہ بیان سے باہر ہے۔

انہوں نے حقائق اسلام کو نوجوان نسل کی زبان میں پیش کیا، اسلامی فلسفہ کا درس والد سے لیا البتہ وہ شہید مطہری کی طرح ایک اسلامی فلسفی نہیں تھے مگر ان کے مطالعات بہت وسیع تھے۔علوم جدیدہ سے آشنائی کی بنا پر وہ اپنے مطالب کو اس زبان میں پیش کر سکتے تھے جو نوجوان نسل کے لئے قابل قبول ہو اور انہیں اسلامی مسائل سے آشنا کر سکتی ہو اور اس سلسلے میں ان کا کردار بہت اہم اور بہت قابل قدر ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کو سماجیات میں کمال دخل تھا، اس علم میں ان کی بڑی دسترس تھی لیکن فقہی مسائل میں ممکن ہے ان کی ایسی صورت نہ ہو جو درجہ کمال پر پہنچے ہوئے ایک اسلام شناس کے لئے ضروری ہوتی ہے۔وہ ایک اعلیٰ پائے کے انتہائی نفیس مقرر تھے اور جو کچھ کہتے تھے دل کی گہرائی سے کہتے تھے۔ان کی باتیں نوجوان نسل کے دلوں میں اترتی اور انہیں اسلام کی طرف مائل کرتی تھیں۔اس ضمن میں ان کی کتابیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔البتہ بعض کتابوں میں ایسے مسائل بھی ہیں کہ جو بظاہر اسلامی مسائل سے مطابقت نہیں رکھتے۔لیکن بعض افراد نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا اور ان کی باتوں کے ایک حصے کو اپنے پیش نظر رکھا۔اگر ہم ان کی پوری کتابوں کو اور اس وقت کی مناسبت کو جس میں وہ سانس لے رہے تھے اور پوری باتوں اور پورے مطالب کو نہیں کہہ سک رہے تھے، پیش نظر لائیں تو مجموعی طور پر یہ ایک دلآویز بات ہوگی۔ڈاکٹر صاحب کے پدر بزرگوار کا کہنا تھا کہ اگر آپ ڈاکٹر کی پوری کتابوں کا

مطالعہ کریں تو اس وقت آپ کو یہ بات ملے گی کہ اس نے کسی کتاب کے سوال کو کسی دوسری کتاب میں بیان کیا ہے۔

یہ وہ نکتہ ہے جو اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض لوگ ان کی کتابوں کو نوجوان نسل کے لئے قابل مطالعہ قرار نہیں دیتے یا اس کے بعض حصوں کو اسلامی مطالب سے خارج سمجھتے ہیں۔ لیکن زندان ہو، کہ زندان سے باہر جو بات میں ان کے بارے میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام ان کے رگ وپے میں بسا ہوا تھا اور وہ اس کے انتہا درجہ والہ وشیدا تھے۔

البتہ استاد شہید مطہری اسلام سے گہری وابستگی کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب کے بعض مطالب کو اسلامی فقہ کے مناسب حال نہیں جانتے تھے۔

اب وہ ان کی تحریر کے کونسے حصے تھے جن پر استاد شہید مطہری کو اعتراض تھا میں اچھی طرح اس سے واقف نہیں ہوں اور میں نے ذاتی طور پر شہید مطہری سے ڈاکٹر کے خلاف کوئی بات نہیں سنی ہے، اور شریعتی خود اپنے آپ کو مطہری کا شاگرد سمجھتے تھے۔

س ۔ ان کی زندگی سے متعلق کوئی ایسا واقعہ ہے جو رہ رہ کر آپ کو یاد آتا ہو؟

ج ۔ جب میں مشہد میں تھا تو انہوں نے اپنا ایک واقعہ مجھ سے بیان کیا تھا اور وہ اس زمانے کا تھا جب وہ سیکنڈری اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری کلاس میں ایک استاد فلسفہ کا درس دیا کرتے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر نے اس موضوع کو اپنے والد سے کسی قدر پڑھا تھا اور ان مسائل سے نسبتاً واقف تھے اس لئے طلبا، ان سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ آکر اس کے بارے میں انہیں سمجھائے۔ اس بات نے استاد کے دل میں رنجش پیدا کی، اور امتحان کے موقع پر پہلی

کوشش یہ ہوئی کہ انہیں پاسنگ مارکس نہ دیے جائیں لیکن ایک کونسل کی تشکیل سے اسے پاسنگ مارکس مل گئے۔ ڈاکٹر خوش طبعی سے ہنس کر کہتے تھے جب میں بورڈ کے پاس جا کر لڑکوں کو درس دیتا تھا تو استاد کے دل میں یہ بات آئی تھی کہ میں اس کی تحقیر کر رہا ہوں، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

۱۹۵۷ء میں جب میں زندان میں مقید تھا تو میرا اور ڈاکٹر کا سیل آمنے سامنے تھا اور ہم بعض اوقات ایک دوسرے کو آواز دے لیا کرتے تھے۔ وہ زندان میں ایک مبارز اور مقاوم انسان تھے اور میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان میں خستگی کے آثار پائے گئے ہوں۔ آخر میں، میں یہ کہونگا کہ:

ڈاکٹر کے بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم علی قدر مراتب ہر کسی کا جائزہ لیں اور ڈاکٹر صاحب کے قابل قدر خدمات کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر ہماری توقعات کچھ زیادہ ہوں اور ہم انہیں ایک اعلا اسلام شناس متعارف کریں تو یہ صحیح نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی ایسا دعوا نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے: میں ایک تکلیف زدہ انسان ہوں، ایک فریاد بلند کرنے والا آدمی ہوں، میں اظہار درد کرتا ہوں، میں نے کبھی یہ دعوا نہیں کیا کہ میں ایک مقعر اسلام شناس ہوں۔ ان کے چاہنے والے انہیں بہت بلندی پر لے جاتے ہیں، یہ ایک اشتباہ ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں کہ جنہیں ڈاکٹر صاحب کی تحریروں نے مائل بہ اسلام کیا اور انہوں نے مبارزات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میری عرضداشت یہ ہے کہ باصلاحیت اور اسلام شناس حضرات ڈاکٹر صاحب کی باتوں کا جائزہ لیں، ان کی صحیح باتوں کی تائید کریں۔ اور جو کتابیں نوجوان نسل کے لئے قابل استفادہ ہیں انہیں سامنے لائیں اور اشکالات کی توضیح کریں۔

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آئے کئی صدیوں ہے ترانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھ کو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا فسانہ اپنا

(جوشؔ)

BS150